نعمت بیگم

ایک دو نہیں
پورے اڑتیس سال شب و روز
میری رفاقت میں بسر کر دیے۔
ایک دن مجھے بے آرام نہ ہونے دیا۔
ہمدرد کے لیے اپنا زر و زیور سب قربان کر دیا
اور میرے لیے اپنا آرام اور چین۔
ان بے چاری کے پاس محبت کے سوا تھا بھی کیا!
زندگی بھر محبتیں تقسیم کرتی رہیں۔
سوچتا ہوں کہ
میں نے مرحومہ کے لیے کیا کیا
نعمت بیگم! میں شرم سار ہوں۔

حکیم محمد سعید

حرف اول

"ایوان دوستی" میں ایک تقریب احترام و احتشام کے ساتھ ہوئی -- یوم پاکستان!

صاحبان فکر و قلم کا نہایت باوقار اجتماع تھا۔ روسی میزبانوں نے فرمایا: "ہم پورے تسلسل کے ساتھ کوشاں ہیں کہ روس اور پاکستان کے مابین رشتہ ہائے اخوت و مودت قائم و دائم ہو جائیں۔ ہم اینٹوں کی تلاش میں ہیں اور چن چن کر جمع کر رہے ہیں کہ ایک ایوان محبت تعمیر کر دیں۔" تقریر دل پذیر تھی اور بوئے یار دل فریب! میں نے جوابی تقریر میں کہا:

"ایوان دوستی میں یوم پاکستان کی پروقار تقریب اس انداز فکر کی غماز ہونی چاہیے کہ روس احترام آزادی کرتا ہے۔ یہ تقریب عکاس ہے اس فکر کی کہ ایوان دوستی پاکستان کی حریت کا قدر دان ہے۔ یہ فال نیک ہے اور روس میں موجودہ فکری انقلاب انسانوں کے مابین الفت اور اقوام کے درمیان امن و سلامتی کی ضمانت دیتا ہے۔ اب آپ کو سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دورۂ روس کرکے پاکستان اور روس کے درمیان کھڑی دیوار توڑ دی ہے۔ اس منہدم کردہ دیوار کی اینٹیں چن لیجیے۔ اس سے جو ایوان محبت تعمیر ہوگا اسے دوام حاصل ہوگا۔"

نومبر ۱۹۸۹ء میں میرا دورۂ روس درحقیقت عنوان خلوص وانس تھا۔ تقریب تھی "عطائے عالمی ابن سینا ایوارڈ" جس کے لیے قرعہ فال انٹرنیشنل جیوری کے ہاں میرے نام پڑا تھا۔ موسکو، تاشقند، بخارا، باکو، لینن گراد شہروں

میں جس انداز سے شب و روز گزرے میں نے ان کو قلم بند کر لیا۔ اور اب یہ مشکل موقع ملا تو میں نے اسے "درون روس" کا رنگ دے دیا ہے۔

درون روس کی ترتیب و تدوین میں میری بیٹی سعدیہ نے خوب ساتھ دیا اور میرے رفیق کار محترمی مسعود احمد برکاتی صاحب اور جناب احمد خاں خلیل نے بہترین تعاون کیا ہے۔ میں اظہار ممنونیت کرتا ہوں۔

"درون روس" میں میں نے وہی کچھ لکھ دیا ہے جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا۔ اس میں تنقید بھی ہے اور تعریف بھی۔ ہاں دل آزاری نہیں ہے اور نہ دل دہی ہے!

حکیم محمد سعید

ترتیب

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۵ نومبر ۱۹۸۹ء

برق و شرر تیرے ہیں!

ابھی ایک سکنڈ پہلے تاریخ چار نومبر تھی اور اب ایک سکنڈ بعد پانچ نومبر ہے۔ تاریخیں سکنڈوں میں بدلتی ہیں۔ لمحات ہیں کہ جو تاریخیں بدل دیتے ہیں۔ ثانئے ہیں کہ جو حالات کو بدل کر انقلاب آشنا کر دیا کرتے ہیں۔ وقت کی رفتار متعین ہے۔ شب و روز معمولات ارض و سما ہیں۔ شمس و قمر کی گردشیں مقرر و متعین ہیں۔ انسان ارض کو ان مرتب و مدون حالات سے نبرد آزما ہونا ہے اور زمین و آسمان کے مشخص اور متعین قوانین فطرت سے خود کو ہم آہنگ و ہم رکاب کرنا ہے۔ آواز کی رفتار' روشنی کا سفر' برق کی لہر انسان کے وجود مادی کی گرفت سے ماورا ہے۔ انسان ان حالات میں خود کو حقیر و مجبور پاتا ہے۔ وہ ثانیوں میں ہزاروں لاکھوں میل کی خبر نہیں لاسکتا۔ وہ لمحات میں انقلابات لانے پر قادر نہیں ہے۔ منٹوں میں اس کا مادی وجود سیاروں کی حرکات سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ ستاروں کی خبر نہیں لاسکتا۔ انسان اپنے عجز و کسر سے ناواقف نہیں ہے۔ مگر انسانوں میں ایسے انسان بھی قدرتِ کاملہ کے شاہ کار ہیں کہ جو اپنے روحانی وجود پر یقین کامل رکھتے ہیں' اور روح کے امرِ ربی ہونے پر ایمان اور ایقان رکھتے ہیں۔ وہ اس نکتے کا ادراکِ کامل کرسکتے ہیں کہ ان کے فکر کی رفتار روشنی کی رفتار سے تیز ہے۔ ان کی قوتِ فکر علویت کے اس مرتبے پر فائز ہے کہ جہاں آواز' روشنی اور برق کی لہریں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ جو انسان قوتِ فکر پر بہ صحتِ کامل قدرت حاصل کرلیتے ہیں' لیل و نہار ان کے قبضۂ قدرت میں ہوا کرتے ہیں' شمس و قمر ان کے دوست ہوتے ہیں' سیارے ان کی سواری ہوتے ہیں اور برق و شرر ان کے تابع ہوتے ہیں۔

الیگزینڈر سیدوف

اس نام کا اچھا خاصا ترجمہ سکندر سید ہے - پاکستان میں روس کے سفیر کبیر جناب محترم وکٹر پی - یاکونین ہیں - کراچی میں ان کی نیابت جناب محترم الیگزینڈر سیدوف صاحب کرتے ہیں - قونصل جنرل ان کا عہدہ ہے - بہت دل چسپ انسان ہیں - دوست ہیں مگر خوب گہرے ! حالت حاضرہ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور پھر سیاست کی دنیا میں دوستوں کو پرکھنے کا قرینہ بھی ان کو آتا ہے -

شام ہی کی بات ہے ایوان دوستی (فرینڈشپ ہاؤس) میں' میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہوائی میدان تشریف لانے کی زحمت نہ فرمائیں - ایوان دوستی میں ۷۲ویں انقلاب عظیم روس کا جشن تین دن پہلے منایا گیا - انقلاب عظیم روس کی تاریخ سات اکتوبر ہے - گو میں بری طرح کاموں میں گھرا ہوا تھا مگر ایوانِ دوستی کے جواں سال ڈائریکٹر عزیزم ڈاکٹر ولاجمیر زیتوف نے اصرار کیا کہ پانچ منٹ ہی کے لیے سہی' مگر ضرور آجایئے - میں نے اس جواں سال ڈائریکٹر کا احترام کیا اور سات بجے پہنچ گیا' تقریب میں شرکت کی - ایک تقریر بھی کی - آج ہوائی سفر سے قبل مجھے ایک مریض کو دیکھنا تھا - گھر آیا تو وہ وھیل چیئر پر بیٹھے موجود تھے - پوری توجہ سے جناب شیخ تنویر صاحب کو وقت دیا- شیخ صاحب ان دنوں تلاش روحانیت میں ہیں اور سرگرداں ہیں- ان کی خدمت دل وجان سے کر کے میں نے ان کو رخصت کیا اور پھر اپنے سامان کا جائزہ لیا - کاغذات سفر کو درست کیا - اوسان کہ جو خطا تھے ان کو قابو میں کر کے سب حالات کا جائزہ لیا - حتیٰ کہ ساڑھے دس بج گئے اور ہوائی میدان جانے کا وقت آگیا - گیارہ بجے ٹھیک ہوائی میدان پہنچنا تھا کہ سیدوف صاحب کے پہنچنے کا وقت بھی یہی طے پایا تھا -

قائداعظم ائرپورٹ پر

کراچی ائرپورٹ کا تازہ نام قائداعظم انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے - یہ نام اہل کراچی کو

تحفتہً ۱۱ ستمبر ۱۹۸۹ء کو محترمہ وزیراعظم پاکستان نے دیا ہے - کئی سال پہلے تاریکیوں میں یہ تاریخ ساز فیصلہ ضیا ہوا تھا کہ کراچی کا نیا ایرپورٹ جب بنے گا تو اس کا نام جناح ائرپورٹ ہوگا- ہم اپنی تاریخ کو دیکھنے' سمجھنے اور لکھنے کو غیر ضروری سمجھتے رہے ہیں - آج بھی ہمارا رویہ یہی ہے- ہم اپنی لکھی ہوئی تاریخ کی بھی پروا نہیں کرتے اور نہ ہم اپنی تاریخ کے ساتھ مذاق کرنے کو ذرا بھی بُرا سمجھتے ہیں - ہم اسے مسخ کر کے غم گیر ہوتے ہیں نہ غم زدہ- ہم اپنی ہر روایت کو پامال کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے' اور نہ اب' ہمیں اپنی ثقافت کا پاس رہا ہے نہ لحاظ -۱۱ ستمبر ہماری اپنی تاریخ کے ایک شدید حادثے کا عنوان ہے - اس دن قائداعظم محمد علی جناح نے عالم بے بسی میں انتقال فرمایا تھا- ان کا مرض دق و سل ایسا نہ تھا کہ اس کا علاج نہیں ہوسکتا تھا- شاید وہ کاغذات محفوظ نہیں کہ جن کا تعلق ان کے معالجات سے ہے - انھیں دیکھ کر حقیقت پر سے کئی پردے اٹھ سکتے ہیں - کراچی کے ہوائی میدان سے ایوانِ صدر آنے کے دوران راہ میں ایمبولنس کا خراب ہوجانا اور شدید گرمی میں بانیِ پاکستان کا سسکنا اور سربراہِ پاکستان کا اس عالم بے بسی میں پڑے رہنا خطرناک اندازِ فکر و عمل کا غماز ہے - لاریب محمد علی جناح کی تعریف بانیِ پاکستان ہے - ان کی اس سے بڑی تعریف کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ بانیِ پاکستان تھے - ان کے فکرونظر سے ضرور اختلاف کرنے کی گنجائش موجود ہے - قائداعظم محمد علی جناح بہرصورت اور بہرانداز اور بہرطور واجب الاحترام ہیں۔ان کی عظمت کا اعتراف ہمارا فریضۂ ملی ہے -ان کی رفعت کا اہتمام ایک فریضۂ دائمی ہے جس سے انحراف نہیں کرنا چاہیے - میں اس اندازِ فکر کا شدت سے مخالف ہوں کہ چوں کہ پاکستان کے قیام کی فکر بعض لیڈروں کے نزدیک صحت مند نہ تھی اس لیے پاکستان غلط - یہ اندازِ فکر مجرمانہ ہے - پاکستان معرضِ وجود میں آچکا ہے - دنیا نے اس کے وجود کو تسلیم کرلیا ہے - اس لیے اب پاکستان ایک حقیقت ہے اور اس کی تحریم و تکریم اور تقدیس ہر اس فرد پاکستان کے لیے لازمی ہے کہ جو یہاں رہتا ہے - قائداعظم محمد علی جناح نے تحریک کی قیادت کی تھی - اس لیے وہ قائد ہیں' ان کو قائد تسلیم کرنا چاہیے'ان کی شان میں ہرگز کسی گستاخی کی اجازت نہیں دی جاسکتی -

۱۱ ستمبر کے سانحات

پاکستان میں ۱۱ ستمبر ہر سال ایک یومِ غم ہے ۔ یہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کا یومِ وفات ہے ۔ مگر اس سال ہم نے ۱۱ ستمبر کو یومِ سیاست بنا کر رکھ دیا ۔ وہ سیاست جس کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی ۔ وہ سیاست کہ جو اس پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کردینے کی راہ پر گامزن ہے ۔ مزار قائداعظم پر ۱۰ ستمبر کی شام اور رات سے ۱۱ ستمبر کی صبح و شام تک جو ڈھول بجے ہیں اور باجوں تاشوں کا جو سامان ہوا ہے وہ بدرجہ انتہا شرم ناک ہے ۔ رات بھر رقص و سرود کی محفلیں گرم رہیں ۔ دعوتیں ہوئیں ۔ تہذیب سے دُور اور ثقافت سے معذور انسانوں نے شرافت کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور پھر جب جلسۂ تعزیت برپا ہوا تو خواتین کی عزتیں خراب ہوئیں اور انسانوں کے چلیے بگڑے ۔ میں ان حالات کا بھی شاہد ہوں ۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم نے کراچی میں ۱۱ ستمبر کو پاکستان اور بانیِ پاکستان کی سخت ترین توہین کی ہے اور اہانت ۔

ہوائی جہاز ایروفلوٹ میں

میں اور میری بیٹی سعدیہ ٹھیک گیارہ بجے ائرپورٹ ٹرمنل نمبر تین کے سامنے پہنچ گئے ۔ یہاں روس کے قونصل جنرل جناب الیگزنڈر سیدوف صاحب ہمارے منتظر تھے ۔ ان کی معیت میں ہوائی جہاز تک جانا تھا ۔ ہم نے اپنے بچوں کو اللہ حافظ کہا ۔ خانم ڈسلوا بھی ساتھ تھیں۔ ان کو میں نے گلے لگا کر اللہ حافظ کہا۔ سعدیہ کی عدم موجودگی میں وہ ہمدرد گھر کی ذمہ دار ہوں گی اور میری عدم موجودگی میں مدینتہ الحکمت کے معاملات کی ذمہ دار ہوں گی ۔ میں نے ان کے حق میں آج پروانۂ نیابت و قائم مقامی جاری کردیا ہے ۔ احتراماً خانم ڈسلوا ہمدرد کی مجلس امینان کی رکن ہیں اور آج میں نے ان کو ہمدرد میں ایک بڑا اعزاز اپنی قائم مقامی کا دیکر ان کو اعلاترین مقام دیدیا ہے ۔ اب وہ ۳۳ سال ہمدرد کی بہترین خدمت کرکے جنوری ۱۹۹۰ء میں اپنے تینوں بیٹوں کے پاس کینڈا چلی جائیں گی جہاں ان کی بہوئیں ان کی منتظر ہیں ۔ ان تینوں کے ہاں فروری ، مارچ اور اپریل ۱۹۹۰ء میں ولادتیں متوقع ہیں ۔ میں نے خانم ڈسلوا کو اب

اپنے بچوں میں جانے کی اجازت دیدی ہے ۔ گو میں ان کو اپنے ساتھ نہ پاکر بے چین رہوں گا اور سعدیہ ان کے بغیر پریشان رہیں گی ، مگر ہم دونوں باپ بیٹی نے ایک انسانی فیصلہ کیا اور ان کو خوشی سے اپنے بال بچوں میں جانے کے لیے کہہ دیا ہے ۔ ان کے جانے سے قبل ان کی خدمات کے صلے میں ان کو ہمدرد کا ہر اعزاز دینا میرا فرض تھا جو میں نے ادا کردیا ہے ۔

میں نے معمولاً وی آئی پی (ویری امپورٹنٹ پرسنیلٹی) لاؤنج میں جانے سے گریز کیا ہے ۔ میں جب چار سال مرکزی اور وفاقی وزیر رہا ان دنوں بھی میں نے جہاں تک ممکن ہوسکا اس اعزاز و استحقاق سے گریز کیا ہے ۔ میں فطرتاً اپنا شمار پاکستان کے عوام میں کرنا اور کرانا چاہتا ہوں ۔ مجھے نہ وی آئی پی ہونا پسند ہے اور نہ ہوائی جہازوں میں فرسٹ کلاس سے کوئی دلچسپی ہے ۔ میں اپنے مقدس وطن کے معزز عوام کو وی آئی پی سمجھتا ہوں اور ان کے ساتھ وی آئی پی بن کر رہنے میں فخر و مسرت محسوس کرتا ہوں ۔ پاکستان میں ان دنوں عوامی حکومت ہے ۔ اس عوامی حکومت میں ایک سیاسی پروفیسر بھی ہیں ۔ ان پروفیسر صاحب کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ پر وی آئی پی تحریر تھا ۔ یہ بہ لحاظ عہدہ صحیح تھا ۔ مگر ان کو اصرار رہا کہ " میں وی آئی پی نہیں ہوں ' میں وی وی آئی پی ہوں ۔ تم جانتے نہیں ؟ " انھوں نے ٹکٹ دور پھینک دیا ۔ عملے نے زمین پر ناقدری کے ساتھ گرے ہوئے نام کے سامنے ایک وی اور بڑھاکر مشیر صاحب کی خدمت اقدس میں ٹکٹ پیش کردیا ۔ وہ فوراً وی وی آئی پی ہوگئے !

ٹرمنل نمبر ۳ کے خوب صورت لاؤنج میں ایروفلوٹ کے کراچی میں منیجر صاحب نے ہمارے بیٹھنے اور ہماری تواضع کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا ۔ آب شگفتہ تازہ سے تواضع ہوئی ۔ میں نے اب عملۂ ہمدرد کا شکریہ ادا کرکے فیروز صاحب اور ان کے رفقا کو رخصت کردیا ۔ کوشش کی کہ الیگزینڈر سیدوف صاحب بھی اب آرام کریں ، مگر وہ سدِ سکندری بنے رہے اور ہوائی جہاز میں مجھے میری سیٹ پر بٹھا کر ہی رہے ۔ خدا حافظ کہہ کر وہ چلے گئے ۔ ٹھیک بارہ بج کر بیس منٹ پر ایروفلوٹ نے حرکت کی اور جلد ہی محوِ پرواز ہوکر وہ سوئے روس روانہ ہوگیا !

ابوظہبی کے ہوائی میدان پر

ابوظہبی کو اب شہر باغات (گارڈن سٹی) کہا جاتا ہے - سالہائے ماسبق میں یہاں انقلابات برپا ہوئے ہیں اور اس صحرائی شہر کو دنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جارہا ہے - عرب ثقافت کا یہ ایک عنوان جلی ہے کہ اس میں باغات کو پوری اہمیت حاصل ہے - اس ثقافت کا مظاہرہ اب صحراؤں میں بھی ہورہا ہے - آج ایروفلوٹ ایک گھنٹہ پچاس منٹ پرواز کرکے **ابوظہبی** کے ہوائی میدان پر اترا - میرا اندازہ یہ ہے کہ دنیا کے اکثروبیشتر ہوائی جہاز یہاں پر ضرور ٹھیرتے ہیں اور اپنی سواریوں کو **ابوظہبی** کے شاندار ایرپورٹ کو دیکھنے کا موقع دیتے ہیں - یہ ہوائی میدان کی عمارت واقعی بڑی خوب صورت ہے - اس کی تعمیر ایک سائے دار درخت کے ڈزائن پر ہوئی ہے - درخت کی جڑ کے چاروں طرف بازار ہے - پھر درخت اوپر جاکر سایہ دار بن گیا ہے اور اس سائے کے نیچے ہزارہا صوفے مسافروں کے بیٹھنے کے لیے رکھے گئے ہیں - بازار دراصل ڈیوٹی فری مارکیٹ ہے - جہاں دنیا کی عجیب و غریب مصنوعات برائے فروخت موجود ہیں - اس عمارت میں بیک وقت سیکڑوں اور بعض اوقات ہزاروں مسافر موجود رہتے ہیں اور خریداریاں عروج پر ہوتی ہیں - غالبا اس مارکیٹ اور ہوائی کمپنیوں کے مابین مفاہمت ہے -

سعدیہ اور میں بھی یہاں اترے - ڈیوٹی فری مارکیٹ کا ایک چکر لگایا اور پھر اوپر خوب صورت لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے - خریداری میرا مزاج نہیں ہے - مگر ہم نے یہ منظر دیکھا کہ ہر انسان جو مارکیٹ سے اوپر آرہا تھا اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی تھیلی ضرور تھی حتی کہ بہت سے پاکستانی مسافروں کو بھی خالی ہاتھ نہ دیکھا!

موسکو کے ہوائی میدان پر

اس ہوائی میدان پر بارہا آیا ہوں اور اکثروبیشتر مہمان کی حیثیت سے - **ابوظہبی** سے جہاز نے بڑی تیز پرواز کی اور پانچ گھنٹے بیس منٹ میں موسکو پہنچا دیا - پاکستان میں

صبح کے ۹ بجے تھے - موسکو میں صبح کے ۷ بجے تھے - دو گھنٹے وقت کا فرق ہے - اعلان میں بتایا گیا کہ موسکو میں درجہ حرارت تین سنٹی گریڈ ہے جس کا مطلب زوردار سردی ہے - میں نے دیکھا کہ اکثروبیشتر مسافروں نے اوورکوٹ پہن لیے - ہمارے ساتھ سفارت روس اسلام آباد کے ملٹری ایڈوائزر منسٹر بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ سفر کررہے ہیں - ان سبھوں نے اوور کوٹ پہن لیے - میں نے سعدیہ کو ان کا اوورکوٹ پہنا دیا جو خانم ڈسلوا نے اپنے لیے خریدا ہے مگر اسے سعدیہ پہن رہی ہیں - ان کے لیے تین ہزار رپے - ان دنوں کے لیے خرچ کرنا ممکن نہ تھا - میں حسب معمول اپنی سفید شیروانی میں اترا گو اوورکوٹ میرے ہاتھ میں ضرور ہے - کئی سال ہوئے میں نومبر ہی کے مہینے میں موسکو آیا تھا اور یہاں میزبانوں نے مجھے اوورکوٹ پہننے پر مجبور کیا تھا - ان کی رائے یہ تھی کہ موسکو کی سردی تکلیف دے سکتی ہے - میں اسی لیے احتیاطاً اوورکوٹ ساتھ لایا ہوں -

امیگریشن پر دیکھا کہ سفارت پاکستان کے جناب قاضی صاحب موجود تھے - انھوں نے اپنا تعارف کرایا - ذرا ہی دیر بعد روس پاکستان دوستی کے جناب ڈاکٹر گناڈی پی - اودیئف (Dr. Gennady P. Avdeyev) بھی تشریف لے آئے - مگر امیگریشن افسر نے ان کی آمد کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور اپنے کام سے کام رکھا - اس کاؤنٹر پر خاصی دیر لگی، بارے کوئی سوال جواب نہ ہوئے اور نہ افسر نے پاس پورٹ اور ویزا پر لگی ہوئی تصویر سے میرا مقابلہ کرنے کی کوشش کی - کئی سال ہوئے ایسا ہوچکا ہے کہ بارہا تصویر اور میرے چہرے کا جائزہ لیا گیا تھا - میری عینک تکلیف دے رہی تھی - میں نے بات کو سمجھ لیا اور عینک اتار دی اور پھر یک دم مسئلہ حل ہوگیا! روس میں کئی بار آیا ہوں - یہاں تاجیکستان کے جناب باباجان غفوروف صاحب سے گہری دوستی تھی - ان کی دعوت پر امیر خسرو اور فارابی سے متعلق کانفرنسوں میں آنا ہوا تھا - باباجان غفوروف عجیب و غریب انسان تھے - حکومت روس

میں نہایت با اثر ' مزاج کے اعتبار سے قطعی مشرق دوست - ان کے دم سے روس میں مسلم اکابر رجال کا بڑا احترام ہوا ہے - مجھے ان کے ساتھ یونیسکو میں بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے جہاں سنٹرل ایشیا کے متعدد پہلوؤں پر تحقیقی کام کرنے کے لیے ایک ایسوسی ایشن بنی تھی اور باباجان غفوروف اس کے روح رواں تھے - پاکستان نے سائنس کی ذمہ داری قبول کی تھی جو شاید احترامات کے ساتھ پوری نہ ہو سکی - باباجان غفوروف کے انتقال کے بعد اس کام میں رکاوٹیں آئیں اور یونیسکو نے شعبہ سائنس کا خاصا کام میرے دوست ڈاکٹر احمد یوسف الحسن سابق ریکٹر جامعہ حلب (شام) کے سپرد کر دیا - اس کتاب سائنس کے تین ابواب میں نے بھی لکھے ہیں - ہنوز یہ کتاب شائع نہیں ہوئی ہے - اب گزشتہ دنوں ہی ایک درخواست ملی ہے کہ میں ان تینوں ابواب کی تلخیص کرکے صفحات ذرا کم کردوں - میں نے ایسا کر دیا ہے - شاید اب یہ کتاب جلد چھپ جائے گی - غالباً اس کی وجہ یونیسکو کے مالی حالات ہیں جو یونیسکو میں سیاست کے دخل کی وجہ سے امریکا کے یونیسکو چھوڑ دینے کے نتیجے میں درپیش ہوئے ہیں - پھر امریکا کی تائید میں برطانیہ نے بھی یونیسکو کی رکنیت چھوڑ دی ہے - اب نئے انتخابات کے بعد اسپین کے ڈاکٹر فیڈریکو میور (Dr. Federico Mayor) نے یونیسکو کی ڈائریکٹر جنرل شپ سنبھالی ہے - مگر وہ بھی ہنوز امریکا اور برطانیہ کو یونیسکو میں واپس لانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں - بلکہ خود ان کی شخصیت یونیسکو میں نامقبول ہوئی ہے - ان کے اقدامات کے خلاف یونیسکو کے اندر جو اختلافی حالات پیدا ہوئے ہیں ان کی کہانیاں دنیا کے اخبارات نے چھاپی ہیں -

ڈائریکٹر جنرل کے انتخابات

دو سال قبل ایک سانحہ یہ پیش آیا کہ جانے والے ڈائریکٹر جنرل جناب محترم احمد مختار امبو (سینیگال) نے پاکستان کو یقین دلایا کہ وہ اب تیسری بار ڈائریکٹر جنرل کے انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے - اس کے بعد پاکستان نے جناب صاحبزادہ یعقوب علی خاں کا نام تجویز کردیا اور ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت کے لیے صاحبزادہ صاحب نے یہ

انتخاب لڑا - اس دوران محترم احمد مختار امبو صاحب نے بھی انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا - اس سے پاکستان کو اس قدر مشکل پیش آئی کہ ۸۰ - ۸۵ لاکھ روپے خرچ کردینے کے باوجود پاکستان کو کامیابی نہ ہوئی اور نہ میرے اچھے دوست احمد مختار امبو کامیاب ہوئے - اسپین کے جناب ڈاکٹر فیڈریکو میور انتخاب جیت گئے - وہ پہلے یونیسکو میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے - صاحبزادہ یعقوب خاں کی عسکریت ان کے خلاف گئی - فرانس کی وزیر تعلیم نے ان کو ووٹ دینے سے انکار کردیا اور احتجاجاً یونیسکو بورڈ کی رکنیت سے بھی علیحدگی اختیار کرلی - غالباً ہندستان کی لابی نے بھی صاحبزادہ صاحب کے خلاف کام کیا - بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اگر جناب صاحبزادہ صاحب کی جگہ میرا نام تجویز ہوجاتا تو شاید کامیاب ہوجاتا - مگر یونیسکو میں سب سے زیادہ کام کرنے کے باوجود میں حکومت پاکستان کو نظر نہیں آتا - اس لیے کہ میں دعا سلام کا عادی نہیں ہوں اور طلب عہدہ شریعت کے خلاف ہے - یہ صحیح ہے کہ میں پاکستان میں اپنی مخصوص ذمہ داریوں کی وجہ سے یونیسکو کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا - مگر مجھے استمزاج کی توقع ضرور تھی - مرحوم صدر گرامی قدر نے مجھے پاکستان کی وزارت خارجہ کی پیش کش فرمائی تھی - میں نے معذرت کرلی تھی کہ میں اس کا خود کو اہل نہیں پاتا - جب جدہ میں آرگنائزیشن اوف اسلامک کانفرنس کی ڈائریکٹر جنرل شپ کا مسئلہ سامنے آیا تھا تو میں نے بہ حیثیت مشیر' صدر صاحب کو تحریری اور زبانی مشورہ دیا تھا کہ جناب اے - کے - بروہی صاحب یا جناب خالد ایم - اسحٰق صاحب کا نام جانا چاہیے - جو نام گیا تھا اس کے خلاف میں نے دلائل دیئے تھے کہ پاکستان کا نام زد امیدوار کامیاب نہیں ہوگا اور ایسا ہی ہوا - یونیسکو کے لیے بھی ہم نے نام تجویز کرنے میں غلطی کی اور ہمیں شدید ناکامی ہوئی - ہم مسلسل غلطیاں کرتے چلے جارہے ہیں - حالیہ واقعہ بلکہ سانحہ انٹرنیشنل کورٹ اوف جسٹس کی صدارت کا ہوا ہے - ہم نے پاکستان سے ایک ایسا نام تجویز کیا کہ جس کی مخالفت خود پاکستان میں ہوئی - جناب جسٹس دوراب پٹیل کا انٹرنیشنل کورٹ اوف جسٹس میں کام یاب ہونے کا دور دور کوئی امکان نہ تھا' ایسا ہی ہوا اور ناکامی ہوئی -

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی - موسکو کے ہوائی میدان سے جب باہر آیا تو دیکھا کہ استقبال کے لیے جناب ڈاکٹر الیگزنڈر پی کزمیچوف صاحب (Dr. Alexander Kuzmichev M.D) بھی موجود ہیں - ان کو میں نے حیرت و مسرت سے گلے لگالیا مشرقیت اور عربیت کا مظاہرہ بوسوں کی صورت میں ہوا! چند ماہ قبل یہ روس کے ۲۰ ڈاکٹروں کا ایک وفد لے کر پاکستان آئے تھے جہاں میں نے ان کا استقبال کیا تھا۔آج وہ موسکو میں میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے - محترمہ ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا (Dr. Ludmila A.Vasilyev) کو بھی موجود پایا جو بہ حیثیت مترجم پورے دورۂ روس میں میرے ساتھ رہیں گی - اخبار جنگ کے رپورٹر جناب عارف علی خاں بھی آئے تھے۔ ان کے دوسرے رفقا بھی تھے - باہر آئے تو ایک نہایت شاندار سرکاری لیموزین میں سامان رکھا جاچکا تھا - حکومت روس نے اپنے اس حقیر فقیر مہمان کے لیے وی آئی پی موٹر کار دی ہے اور قیام کے لیے خصوصی انتظامات کیے ہیں - پاکستان کے صحافیوں نے بتایا کہ اس جائے قیام میں اہم شخصیات ہی بار پاتی ہیں - اس مہمان خانہ سرکاری کا نام روسی زبان میں ОКТЯБРЬСКАЯ ہے - انگریزی میں OKTYABRSKAYA یعنی اک چیا برس کیا - بڑا مشکل نام ہے! اکتوبر کے نام پر یہ شاندار جگہ ہے - اسے ہوٹل کہا جاتا ہے مگر یہاں صرف سرکاری مہمان ہی قیام کرتے ہیں - میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے ایک ہی کمرہ چاہیے - ہم باپ بیٹی آسانی کے ساتھ رہ سکیں گے - سعدیہ کے لیے الگ کمرے کی ضرورت نہیں ہے - ہمیں جو کمرہ ملا ہے وہ سوئٹ ہے - اس میں آرام و آسائش کی ہر سہولت میسر ہے - بڑے اطمینان کی بات یہ ہے کہ اس کمرے میں ایک بڑی میز موجود ہے اور لکھنے پڑھنے کا ہر سامان میسر ہے - اس میز کو میں نے اپنے انداز کے مطابق لگا لیا اور اس پر اپنا سامان مرتب کردیا -

پروگرام --- تبادل خیال

دورۂ روس کی دعوت مجھے انجمنِ دوستی کی پریزیڈیم کی جانب سے دی گئی تھی - میرا پروگرام " روس پاکستان دوستی " کی انجمن نے مرتب کیا ہے - ناشتے کی میز پر

پروگرام پر تبادل خیال ہوا' مگر اس کے بعد بیٹھ کر پروگرام کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا - اس پروگرام میں موسکو' تاشقند ' باکو' لینن گراد شامل ہیں - اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اس میں دوشنبہ کو ضرور شریک کرتا جہاں میرے بہت سارے دوست ہیں جن کا تعلق تاجیکستان اکیڈمی اوف سائنسز سے ہےاور جس کے سربراہ میرے عزیز دوست پروفیسر محمد عاصموف صاحب ہیں - یا کم از کم سائبیریا ضرور چلا جاتا جہاں کی سردی تو مشہور ہے مگر اس سے طرح طرح کی روایات بھی وابستہ ہیں - میرا خیال ہے کہ سائبیریا میں بھی وہ شقاوتیں دیکھنے میں نہیں آئیں گی جن کا مظاہرہ ان دنوں حیدر آباد اور کراچی میں ہو رہا ہے جہاں انسان کی عزت و آبرو' عظمت و عصمت اور جان و مال سب کے سب معرض خطر میں ہیں - کہا جاتا رہا ہے اور باور کرایا گیا ہے کہ کراچی میں صوبائی اور لسانی تعصبات کارفرما ہیں - حال آں کہ صورت حال ہرگز یہ نہیں ہے - کراچی کا مسئلہ کلیتہً ایک انتہائی قابلِ نفرت سیاسی آویزش ہے جس کا بدیہی منشا یہ ہے کہ یہاں بسنے والوں کو تعلیم و صحت سے محروم کر دیا جائے - ان کی صنعت و حرفت کو تباہ و برباد کر دیا جائے - ان کی شخصیت کو پامال کر دیا جائے اور ان کو اس قدر کم زور اور ناتواں کر دیا جائے کہ وہ تمام و کمال ایک سیاسی شخصیت کے رحم و کرم پر رہ جائیں اور سندھ کو الگ ملک بنانے میں کوئی دشواری نہ ہو ' ایسا ملک جس میں کراچی شامل ہو - حیدر آباد اور کراچی کے لیے یہ عمل جاری ہے جو سائبیریا کی روایتی شقاوتوں سے کہیں زیادہ سخت اور سفاکانہ ہے - بہ حیثیت مجموعی میرے پروگرام کی صورت یہ ہے :

پروگرام

صدر ہمدرد فاؤنڈیشن اور ان کی بیٹی کے لیے روس میں قیام کا پروگرام

۵ نومبر' اتوار

۰۶-۵۰ کراچی سے موسکو فلائٹ SU-540 سے آمد' قیام ہوٹل میں - آرام

۱۲-۰۰ گمنام سپاہی کی قبر پر پھول چڑھانا

۱۵-۰۰ موسکو کے اطراف کی سیر

۱۹۔۰۰ ثقافتی پروگرام

۶ نومبر، پیر

۱۰۔۰۰ کریملن کی سیر، اور زینایا پلاتا کی سیر

۱۵۔۰۰ بورودینو پانوراما کی سیر

۱۹۔۰۰ ثقافتی پروگرام

۲۰۔۰۰ پاکستانی سفارت خانے میں ڈنر

۷ نومبر، منگل

۱۰۔۰۰ ۷۲ویں انقلاب عظیم روس کی تقریبات میں شرکت (ریڈ اسکوائر)

۸ نومبر، بدھ

۱۲۔۰۰ فلائٹ N-661 سے تاشقند روانگی

۸ سے ۱۱ نومبر

ازبک انجمن دوستی کے پروگرام کے مطابق ازبکستان میں قیام (اس پروگرام میں نہرو کی ۱۰۰ویں سالگرہ کی تقریب میں شرکت، وزارت صحت ازبکستان میں ایک میٹنگ، فارماسوٹیکل فیکٹری کا دورہ اور مسلمان علما سے ملاقات شامل ہیں)۔

۱۱ نومبر

فلائٹ N-6600 کے ذریعہ تاشقند سے باکو روانگی

۱۱ سے ۱۴ نومبر

آذر بائیجان انجمن دوستی کے پروگرام کے مطابق آذر بائیجان میں قیام (اس پروگرام میں مڈیکل شخصیتوں سے ملاقات، مڈیکل انسٹی ٹیوٹ کا دورہ، مسجد کی زیارت اور مسلمان علما سے ملاقات شامل ہیں)۔

۱۴ نومبر

فلائٹ N-6709 لینن گراد روانگی

۱۴ سے ۱۶ نومبر

لینن گراد انجمن دوستی کے پروگرام کے مطابق لینن گراد میں قیام (اس پروگرام میں

لینن گراد ایوان دوستی میں ایک میٹنگ، شہر لینن گراد کے محکمۂ صحت سے مذاکرات، سمولنی پیلس کی سیر، چلڈرن فاؤنڈیشن کے فلاحی کاموں کے بارے میں معلومات اور پشکینو کا دورہ شامل ہیں)۔

۱۶ نومبر، جمعرات

ریڈ ایرو ٹرین کے ذریعہ سے موسکو روانگی

۱۷ نومبر، جمعہ

۰۸۔۲۵ لینن گراد سے موسکو میں آمد

بعد میں نوووستی پریس ایجنسی میں ابن سینا ایوارڈ کی تقریب

۱۸ نومبر، ہفتہ

۱۳۔۰۰ فلائٹ SU-539 کے ذریعہ پاکستان روانگی

تعارف

میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان دو شخصیات کا ذکر کروں کہ جو رات دن ۱۸ نومبر ۱۹۸۹ تک میرے ساتھ رہیں گی۔

جناب محترم ڈاکٹر گنادی اوجیٹ کا تعلق انجمن روس پاکستان دوستی سے ہے۔ وہ اس کے نائب صدر ہیں۔ صبح ہوائی میدان پر ان سے ملاقات ہوئی اور اب وہی میرے تمام پروگرام کے پیش نظر ضروری انتظامات کرتے رہیں گے اور حسب ضرورت کمی بیشی بھی کرتے رہیں گے۔ نہایت نفیس انسان ہیں۔ فارسی جانتے ہیں۔ انگریزی خاصے تکلف کے ساتھ بول لیتے ہیں۔ روسی زبان میں سوچتے ہیں اور پھر انگریزی میں اظہار خیال کرتے ہیں اور جب روسی زبان کے کسی لفظ کا مترادف انگریزی میں ان کو نہیں ملتا تو فارسی کا لفظ بولتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی بات پوری کر لیتے ہیں۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں بھی فارسی لفظ سے فائدہ اٹھاتا رہا ہوں۔ ڈاکٹر گنادی بڑے نفیس انسان ہیں، صاف شفاف۔

محترمہ ڈاکٹر لدمیلا نے تاشقند یونی ورسٹی سے اردو زبان میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ۔

ڈی) کی سند لی ہے ۔ اور اب ان کا کہنا یہ ہے کہ انھوں نے اردو سے شادی کرلی ہے اور ان کو اس پر اطمینان ہے ۔ اردو زبان کو صیقل کرنے کے لیے وہ ہندستان جاتی رہتی ہیں ۔ ان کی اردو میں ہندی الفاظ بھی شامل ہوگئے ہیں جن کو استعمال نہ کرنے کی وہ کوشش کرتی ہیں ۔ ڈاکٹر مس لدمیلا جب اردو بولتی ہیں تو ذرا بھی یقین نہیں آتا کہ وہ روسی ہیں ۔ اردو زبان کے محاوروں تک پر ان کو عبور حاصل ہے ۔ طرز ادا پوری خوبی کے ساتھ وہی ہے جو عام بول چال میں ہمارا ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر لدمیلا لینن گراد میں پلی بڑھی ہیں ۔ مگر اب موسکو کے انسٹی ٹیوٹ اوف اورینٹل اسٹڈیز سے وابستہ ہیں ۔ یہ نہایت شائستہ و شستہ خاتون بہ حیثیت مترجم میرے ساتھ رہیں گی ۔ سعدیہ بٹی کو اب ایک نہایت اچھی سہیلی مل گئی ہیں ۔ مجھے آسانی اب یہ ہے کہ میں ہر جگہ اردو میں تقریریں کروں گا اور باتیں کروں گا اور بہ قول سعدیہ ڈاکٹر لدمیلا کے منھ سے پھول جھڑتے رہیں گے !

آزادیِ وطن کے لیے جان قربان کردینے والا فوجی

آزادی ایک حسین اور ایک عظیم متاع انسانی ہے ۔ وہ انسان کہ جو اپنے وطن کو ہمہ جہت آزاد رکھنے کا جذبہ صادق رکھتے ہیں وہ لازماً اپنی خودی اور خودداری کے ہر ہر جوہر کے محافظ ہوتے ہیں ۔ اور ایسے انسان یقیناً ہر خدمت اور ہر ایثار کے بدرجہ کمال اہل ہوتے ہیں ۔ رفعت وطن ان کی آرزو ہوتی ہے اور عظمت اہل وطن ان کا منتہائے مقصود اور علم و حکمت کے میدانوں میں رفعت ان کی منہاج فکر و عمل ہوا کرتی ہے ۔ یہی وہ عظیم انسان ہوتے ہیں کہ جو اپنے وطن کی جغرافیائی حدود کی پاسبانیاں اور اپنی نظریاتی سرحدوں کی حفاظتیں کیا کرتے ہیں ۔ اور جب حالات وطن تقاضہ کرتے ہیں تو ایسے عظیم و رفیع انسان اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کردیا کرتے ہیں اور قربانی و ایثار کی بلندیوں پر فائز ہوکر نسلِ آئندہ کے لیے مثالیں قائم کردیتے ہیں ۔ آفریں ہے اُن صاحبانِ فکر و نظر پر اور آفریں ہے ان اہل اقتدار پر کہ جو آزادی وطن پر جانیں قربان کردینے والوں کو فراموش نہیں کرتے اور ان کی یادوں کو تازہ

رکھنے کے لیے تاریخ ساز اور تاریخ گو یادگاریں قائم کردیتے ہیں ۔

آج میں اور سعدیہ جناب محترم ڈاکٹر گناڈی کی معیت میں آزادیِ وطن پر اپنی جان قربان کردینے والے فوجی کی قبر پر ہدیہ احترام پیش کرنے گئے ۔ کریملن کے زیر سایہ افواجِ روس کے ان جیالوں کی قبر ہے کہ جو انقلاب روس کے لیے قربان ہوکر عظمتِ روس کا سامان کرگئے ۔ اس قبر پر میں نے پھولوں کا گلدستہ رکھا اور پھر احترام کے ساتھ کھڑا ہوگیا ۔ میں نے نذرانۂ احترام ان کو پیش کیا ۔

گو یہ جاں نثاروں کی مجموعی قبر ہے، مگر یہاں چند نام بھی درج ہیں اور سنگ سرخ پر وہ واقعات و مواقع بھی کندہ ہیں جس کے لیے ایثار بے مثال کیا گیا ۔ میں نے حیرت سے ایک بات یہ دیکھی کہ اس قبر پر ہدیہ احترام پیش کرنے والوں میں بچوں کی تعداد زیادہ ہے ۔ میں نے متعدد معصوم ہاتھوں کو قبر پر گل دستے رکھتے ہوئے دیکھا ۔ بچوں سے میری محبت یہاں بھی رنگ لائی اور میں نے بے قرار ہوکر ایک نہایت خوب صورت اور صحت مند بچے کی طرف اپنا ہاتھ کر دیا اور اس نے نہایت مسرت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا ۔ اس کے دل کا سرور اس کی نورانی آنکھوں سے جھلک رہا تھا ۔ یہاں میں نے لاتعداد بچے دیکھے جو گرم کپڑوں میں لپٹے لپٹائے تھے ۔ موٹے اوور کوٹ ان کے نازک جسموں کو زبردست سردی سے بچائے ہوئے تھے ۔ ان سب کے پیروں پر فل بوٹ چڑھے ہوئے تھے ۔ روس میں جوتوں کی سخت قلت ہے ۔ یہاں پاکستان سے جوتے درآمد کیے جاتے تھے ، مگر اکثر کوالٹی کی شکایت ہوئی ۔ اب شاید ہندستان سے جوتے آتے ہیں ۔ اس شدید قلت کے باوجود کریملن کے زیر سایہ ہزارہا بچوں میں سے کسی ایک کا پیر ننگا نہ تھا ۔ یہاں میرا دل بے قرار ہوگیا ۔ بے اختیار مجھے ۱۹۸۶ء کا اپنا سفر کالام (سوات) یاد آگیا جہاں میں ۲۷ نومبر کو گیا تھا ۔ میرے ساتھ میرے دوست پروفیسر آر ۔ بی ۔ سارجنٹ اور ان کی معمر اہلیہ بھی تھیں ۔ سارجنٹ بلند پایہ مورخ ہیں ۔ اسکاٹ لینڈ کے ہیں ۔ آج بھی نومبر کا مہینہ ہے ۔ بے اختیار سوات کے وہ حسین و جمیل نونہال یاد آگئے جن کے سرخ رخساروں سے صحت ٹپک رہی تھی مگر جن کی اکثریت کے پیروں میں جوتے نہ تھے ۔ وہ ننگے پیر سخت ترین سردی

میں برف آلود سڑکوں اور کہر آلود گلیوں میں چل پھر رہے تھے - ان کے نازک اور حسین جسموں پر سردی سے محفوظ رہنے کے لیے موزوں کپڑے تک نہ تھے - دو روزہ دورۂ سوات میں ہزارہا ننگے پیر نونہال میری نگاہوں نے دیکھے تھے! اور وہ اشک آلود ہو گئیں -

لینن کی آرام گاہ

نامعلوم فوجی کی قبر کے شعلہ مستعجل پر میں نے اپنی توجہ کو مرکوز کردیا - اپنے خیالات کو مجتمع کیا - پھر دیکھا کہ اس قبر پر دو نہایت خوب صورت فوجی تن کھڑے ہیں - نہ ہل جل رہے ہیں اور نہ پلک جھپکاتے ہیں - کڑاکے کی سردی میں یہ مستعد جوان کھڑے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں - ان پر کوئی سایہ بھی نہیں ہے - رات دن یہ پہرہ دیتے ہیں - بارش بھی ہوتی ہے اور برف بھی پڑتی ہے - اس وقت یہ کیا کرتے ہیں! میرا اپنا حال اس وقت یہ ہے کہ میرے ہاتھ جیب سے باہر ہیں اور دونوں سن ہو گئے ہیں - خیر میں پلٹا - حالات کا جائزہ لیا - دیکھا کہ ہزارہا مرد و عورت اور بچے قطار اندر قطار ہیں اور جوں کی رفتار چل رہے ہیں - یہ قطار کئی فرلانگ لمبی تو ہوگی - پھر قطار ایک ایک کی نہیں ' چار چار' پانچ پانچ انسانوں کی ہے - ہمارے رہنما نے بتایا کہ آج لینن کی آرام گاہ کھلی ہے اور یہ سب مرد و عورت جسدِ لینن کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے جا رہے ہیں - پھر دوسرے سانس میں انھوں نے فرمایا کہ ہم بھی ادھر ہی جا رہے ہیں - میں نے اندازہ لگایا کہ اگر ہم قطار میں جاکر کھڑے ہوگئے تو شاید دو تین گھنٹے بعد ہی باری آئے گی - مگر جناب ڈاکٹر گناوی نے نگراں فوجیوں سے بات کی - انھوں نے مہربان ہوکر قطار میں آگے لگ جانے کی اجازت دے دی اور ہم ۱۵ منٹ کے بعد اندر داخل ہوگئے - یہ پیازی رنگ کے چمک دار گرینائٹ سے بنی ہوئی عمارت ہے - دل چسپ بات ذہن میں یہ آئی کہ پیرس میں مزار ناپولیوں بوناپارٹ پر جس رنگ کا گرینائٹ لگا ہے وہی رنگ لینن کی آرام گاہ پر لگا ہے!

تنگ راہوں سے گزرتے بالاخر وہ ہال آگیا جس کے وسط میں بند قبر کے اوپر دنیا

کے ایک عظیم مردِ انقلاب کا جسد خاکی لیٹا ہوا ہے اور اس پر روشنی پڑ رہی ہے - چہرہ دمک رہا ہے اور سفید کپڑے چمک رہے ہیں - لینن کے انتقال کے بعد ان کے جسد خاکی کو محفوظ کرلیا گیا ہے - اس وقت تفصیلات ذہن میں نہیں آرہی ہیں کہ کیا طریقہ استعمال کیا گیا ہے - مگر یہ طریقہ یقیناً مصری طریق حنوط سے مختلف ہے اس لیے کہ جسدِ لینن نے اپنا رنگ تبدیل نہیں کیا ہے - چہرے کی ہر چیز اپنے اصل خط و خال میں ہے - مجھے یہ معلوم ہے کہ جسد پر جو روشنی پڑ رہی ہے، عام روشنی نہیں ہے ورنہ رات دن پڑنے والی روشنی سے جسدِ لینن میں نہ جانے کیا تبدیلیاں آجاتیں - یہ خاص قسم کی روشنی ہے جس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا - آج معلوم ہوا کہ ۷ نومبر کے بعد لینن کی آرام گاہ بند کردی جائے گی - دو ماہ تک جسد کی دیکھ بھال کی جائے گی اور اگر کوئی تبدیلی آئی تو اس کا سد باب کیا جائے گا - ماہرین بیٹھ کر جائزہ لیں گے -

ستر سال پہلے لینن نے انسان پر انسان کی حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا تھا یہ اس اعلانِ حق کی صدائے بازگشت تھی کہ جو چودہ سو سال پہلے صحرائے عرب میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا - آفاق سے نوید دی گئی تھی کہ ہر انسان آزاد ہے وہ آزاد پیدا ہوتا ہے ' اسے آزاد رہنے کا حق ہے - حکومت و حاکمیت اللہ کی ہے اور انسان بندۂ اللہ ہے - لینن نے کہا کہ ہر انسان آزاد ہے ' آزادی اس کا حق ہے حکومت انسان کی ہے اور حاکمیت کسان کی ہے - انسان بندۂ آزاد ہے!

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کا انسان ارض تسلیم کرے کہ حاکیت صرف اللہ کی ہے ' اور انسان اللہ کی تخلیق ہے اور پھر ببانگ دہل ہدایت دی کہ انسان اللہ کے سامنے تسلیم و رضا کا اعلان کرکے باقی دنیا کی ہر طاقت اور ہر قوت کی محکومی سے آزاد ہوجائے - لینن نے انسان کو شہنشاہیت اور ارتکاز دولت سے بغاوت کا درس دیا اور ساتھ ہی انسان کو اللہ کا باغی بنا دیا -

اللہ تعالیٰ سے بغاوت کوئی واقعۂ نو نہ تھا - چشم تاریخ نے ایسے سانحات بارہا دیکھے ہیں اور ان کے انجام سے بھی اوراق تاریخ خالی نہیں - لینن کا انسانِ ارض کے حق میں اعلان آزادی اور اللہ سے بغاوت کا درس کس انجام کو پہنچے گا اس کے بارے میں

آج جسدِ مردہ لینن کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ کہنا آسان نہیں ہے - اگر تاریخ سچ ہے تو وہ یقیناً ان حالات کا دیانت دارانہ احاطہ کرے گی جن کا پیش آنا ناگزیر ہے - ایک مسلمان کی حیثیت سے میں فکرِ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین رکھتا ہوں اور میں مستقبل میں فکرِ لینن کے اس انجام کو دیکھ سکتا ہوں جس کا منظر یہ جسدِ بے جان ہے جو اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے -

میں نے اور سعدیہ نے لمبی قطار میں شرکت نہیں کی اور ہمیں "شارٹ کٹ" کا موقع دے دیا گیا - ہاں میں نے یہ حقیقت نہایت احتیاط و قرار سے دیکھی کہ ہزارہا انسان ' بچے اور بڑے قطار اندر قطار تھے مگر کیا مجال کہ کوئی بھی کوئی بات کر رہا ہو ! سب کے سب نہایت خاموشی کے ساتھ چل رہے تھے ' چل کیا رہے تھے سرک رہے تھے - تب جاکر انھیں لینن کی آرام گاہ تک رسائی حاصل ہوئی ہے - بہ ایں ہمہ ' ادب و احترام کا یہ عالم کہ باہم کوئی گفت گو تک نہیں - سگرٹ نوشی تو بہت دور کی بات ہے ! عمارت کے قریب آکر اندر قدم رکھنے والے مردوں نے اپنے ہیٹ اتار لیے - میری مشرقی تہذیب بڑوں کے سامنے جاتے ہوئے ٹوپی اوڑھنے کی طلب گار ہے اور مغربی تہذیب کا مطالبہ یہ ہے کہ بڑوں کے سامنے جائیں تو ہیٹ (ٹوپی) اتار دیتے ہیں، تہذیب اور روایت کا یہ فرق بڑی اہمیت کا حامل ہے - مشرق و مغرب کے مابین یہ واضح تقسیم ہے - ایک فوجی نے میری ٹوپی کی طرف اشارہ کیا - اس کا اشارہ سمجھ کر میں نے اپنی ٹوپی اتار لی ' مگر اس سرخ فوجی کی ٹوپی اچھال دینے کا میرے دل میں رائی برابر خیال نہ آیا جو خود ہیٹ پہنے اندر کھڑا تھا -

اس بے چارے کرائے کے فوجی کو ثقافت مسلم کا کیا ادراک ہو سکتا ہے ! مگر خود ہم اپنی روایت و ثقافت کے کہاں تک پاسبان رہے ہیں ! ثقافت اسلامی اور روایتِ مسلم دھجیاں خود ہم نے اڑا دی ہیں - اب اگر یہاں میری ٹوپی اتروا دی گئی تو اس میں کیا شکایت ! ہمارے محراب و منبر کا حال کون سا اچھا ہے ! یہاں روزانہ پگڑیاں اچھلتی ہیں ! اہل سیاست اور صاحبان اقتدار روز ہی انسانوں کی ٹوپیاں اتار کر ان کو روند رہے ہیں !

لینن کی آرام گاہ سے میں باہر آیا - تا حدِ نگاہ قطار نظر آئی - شاید رات بھر یہ سلسلۂ دید جاری رہے گا - موسکو میں اب سہ پہر کے بعد شدید سردی ہے - درجۂ حرارت اس وقت شاید ایک سے کم ہے - بہ ایں ہمہ روس کے لوگ اپنے قائد کے جسدِ خاکی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے حد درجہ بے چین ہیں - میں ان کی ترتیب و تنظیم پر بھی حیران ہوا - کیا مجال کہ کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے ہاں وہ نہایت خوشی کے ساتھ غیر ملکیوں کو سبقت دے دیتے ہیں - میری طرح اور بھی چند تھے کہ جو قطار کے بغیر اندر چلے گئے - اس پر کوئی ہنگامہ ہوا نہ فساد - نہ سیٹیاں بجیں نہ صدائے احتجاج بلند ہوئی - ان کے نزدیک تو آرام گاہ کے پاس بات کرنا بھی غلط ہے - ہزارہا انسان اپنے بچوں کے ساتھ گھنٹوں سے قطار میں کھڑے ہیں اور نظم و ضبط میں ذرا بھی فرق نہیں آیا -

اپنے قائد کو ہدیہ احترام پیش کرنے کے طریقے یہ ہوتے ہیں - اس کے برعکس ۱۱ ستمبر ' یوم وفات قائد اعظم محمد علی جناح ' کو ان کے مزار پر قوم نے خراج احترام و عقیدت اس انداز سے پیش کیا کہ گزشتہ پوری ایک شب وہاں رنگ رلیاں ہوئیں - باجے تاشے کا اہتمام ' ہو جمالو کی صدائیں اور رقص و سرود کی گھٹائیں - سارا علاقہ میدان حشر بنا رہا اور پھر جلسے میں جو ہوا اس کی تصویر یہ ہے کہ لوگوں نے حدود کو پامال کیا ' تنظیم کے پرخچے اڑائے - خواتین کے دوپٹے پھٹے - صحافیوں کے ڈیسک ٹوٹے - محترمہ وزیر اعظم ' جو گھنٹوں تقریر کرنے کے خیال سے تشریف لائی تھیں گھبرا کر ۲۰ - ۲۵ منٹ میں اپنے ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر فرار ہو گئیں اور مزار قائد کا سارا نواح حشر کا میدان بن گیا - احترامات و اکرامات پاش پاش ہوئے - اندرون سندھ سے لائے ہوئے لوگ ڈھول پیٹتے اور گاتے بجاتے واپس ہوئے -

موسکو کی سیر

میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں نے موسکو کا چپا چپا دیکھ رکھا ہے - ایسا دعوا تو میں

اپنے مسکن کراچی کے بارے میں بھی نہیں کرسکتا - پھر بھی موسکو کے گلی بازار میرے بارہا کے دیکھے ہوئے ہیں - یہاں کے اہم مقامات بھی دیکھے ہیں، حتیٰ کہ ایک بار عید الفطر کے موقع پر دوگانۂ عید بھی موسکو کی مسجد میں ادا کرنے کا موقع ملا - میں ان دنوں لندن میں تھا اور وہاں سے مجھے بلجیم جانا تھا - روس میں پاکستان کے سفیر جناب محترم سجاد حیدر صاحب تھے اور ان کی بیگم محترمہ روح افزا صاحبہ - ان دونوں نے اصرار کیا کہ نماز عید موسکو میں ہونی چاہئے - میں لندن سے موسکو آگیا اور یہاں نماز عید میں جس قدر اطمینان و طمانیت حاصل ہوئی تھی اس کا لطف مجھے آج بھی یاد ہے!

میری بیٹی سعدیہ میرے ساتھ ہیں - ان کو موسکو کی سیر تو کرانی ہے - ہماری "شاہی موٹر کار" نے موسکو کے گلی بازاروں کا سفر شروع کردیا - جناب ڈاکٹر گناوی صاحب سعدیہ کو بتاتے رہے کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے - میں اس دوران میں لوگوں کو دیکھتا رہا - ان کے طور طریق دیکھتا رہا - آج سے ۱۵ - ۱۶ سال قبل یہی گلی بازار ہُو کا میدان لگتے تھے - انسان آدم بیزار معلوم ہوتے تھے - چہروں پر مشکل سے بھی کوئی مسکراہٹ نہ دیکھی جاتی تھی - تاریکیاں تھیں اور روشنیاں برائے نام و کام - مگر آج صورت حال قطعی مختلف ہوچکی ہے - آج بازاروں میں رونقیں ہیں اور خواتین کے لباسوں میں چمکیاں ہیں - ہنستے مسکراتے چہرے ہیں اور کھِل کھلاتے مرد و زن ہیں - جدھر جایئے حسن فراواں ہے - تفریح گاہیں آباد ہیں اور تاریخی مقامات پر لوگوں کے جم گھٹے ہیں - فاتح ناپولیوں سپہ سالار روس کوتوزوفسکی (Kutozovsky) کے نام پر ایک بڑی سڑک سے گزرتے ہوئے ہم پہاڑوں پر چڑھ گئے - بکثرت درخت دیکھے مگر سب کے سب ٹھنٹھ - برگ و سبز سے خالی - موسم کی سختیوں نے ان کی ہریالی چھین لی ہے - اب تو پوری سردی ان پر کوئی پتا لگے گا نہ ہریالی آئے گی -

بالآخر ایک بلند مقام پر جاکر موٹر کار رکی - یہاں میں اس سے پہلے بھی بارہا آیا ہوں - یہاں آکر ہر بار مجھے خوشی ہوتی ہے - یہاں کھڑے ہوکر نیچے دیکھیں تو دریائے موسکو رواں دواں ہے اور مڑکر دیکھئے تو یونی ورسٹی استادہ ہے جہاں ۲۷ ہزار طالب علم تعلیم حاصل کررہے ہیں - موسکو میں اس انداز کی سات عمارات ہیں - سب کا نمونہ

ایک ہی ہے - جنگ میں ہارے ہوئے غیر ملکی قیدیوں کی محنت شاقہ کا یہ عمارات ثمر ہیں -

نووُجے وِچی کان ونٹ ---- ہسٹری میوزیم

ہمارے پاس وقت تھا - رائے ہوئی کہ کان ونٹ کی سیر کرلی جائے - سخت سردی پڑ رہی تھی - مجھ سے زیادہ سعدیہ کو تامل تھا، مجھ سے زیادہ ٹھٹھری جارہی تھیں - مگر میں نے کہا، بٹی! ہمت کرو کہ ہم یہ قدیم یادگار دیکھ لیں - میری سفید و سرد شیروانی اور نرم نائلون کا نازک کرتا پاجامہ میری کیا حفاظت کرتا! بارے ہم کان ونٹ پہنچ گئے - بونداباندی بھی جاری تھی -

نووُجے وِچی کان ونٹ ماسکو میں تاریخی یادگاروں کا ایک کمپلیکس ہے - اس میں مندرجہ ذیل عمارات شامل ہیں:-

۱) سمولنسکی کیتھیڈرل (تاریخ تعمیر ۱۵۲۴ - ۱۵۲۵ء)
۲) چرچ اوف دی ٹرانسفگریشن (۱۶۸۷ - ۱۶۸۹ء)
۳) چرچ اوف دی انٹرسشن اوف دی ہولی ورجن
۴) زارینا ماندوکیا ایلیکسے یفنا کی عمارت
۵) گھنٹہ گھر (بیل ٹاور)
۶) کان ونٹ
۷) لوپو خینا کی عمارت
۸) ناپرودنایا چیمبرز اور ٹاور
۹) چرچ اوف دی از مپشن
۱۰) آئرینا کی عمارت
۱۱) پروخوروفس پر ایک چیپل

خوب سردی تھی، مگر ہم نے ایک ایک عمارت دیکھ ڈالی - سچ تو یہ ہے کہ فنِ تعمیر کے لحاظ سے اس کمپلیکس کی تمام عمارتیں انتہائی خوب صورت ہیں - ۱۹۱۹ء میں

حکومت نے ان کی اہمیت کے پیش نظر وہاں کی تمام اشیا کی فہرست بنوائی - کان ونٹ کے علاقے میں ۱۹۲۲ء میں ایک میوزیم قائم کیا گیا - ۱۹۳۴ء میں اسے اسٹیٹ ہسٹری میوزیم کی ایک شاخ کا درجہ دے دیا گیا -

یہ کان ونٹ دریائے موسکو کے بائیں کنارے پر موسکو کے کریملن سے ۴ کیلو میٹر جنوب مغرب میں واقع ہے - اس کی تعمیر ۱۵۲۴ء میں موسکو کے عظیم شہزادے واسیلی سوم کے حکم سے ہوئی - یہ کان ونٹ شہر سمولنسک پر روس کے دوبارہ قبضے کی خوشی میں اور اس کی یادگار میں بنایا گیا کیوں کہ ایک صدی پہلے اس پر لتھوانیا کی امارت نے قبضہ کرلیا تھا -

نوؤجے وچی کے معنی ہیں نئی دوشیزائیں ! تعمیر کے بعد موسکو کو آنے والے راستے پر یہ ایک قلعے کا کام دینے لگا - ۱۷ویں صدی میں پولینڈ کی فوجیں اس پر قابض رہیں - ۲۲ اگست ۱۶۱۲ء کو موسکو میں زبردست جنگ ہوئی - اس وقت اس کان ونٹ کے دفاع کے لئے تین چار سو سپاہیوں کا ایک دستہ موجود تھا - ۱۸۱۲ء میں ناپولیوں نے اس پر قبضہ کرلیا تھا - یہاں سے نکلتے وقت انھوں نے کیتھیڈرل کو بارود سے اڑانے کی کوشش بھی کی تھی -

۱۷ویں صدی میں یہ کان ونٹ روس کے تمام کان ونٹوں سے زیادہ دولت مند تھا اس کے قبضے میں بہت سی زمین تھی - روس کے ۲۷ اضلاع کے ۳۶ دیہات میں ۱۵۰۰۰ موروثی مزارعین اس کان ونٹ کے ماتحت کام کرتے تھے - اتنی بڑی جائداد کا انتظام کرنے کے لئے متعدد مختار کار لگائے گئے تھے - گویا جاگیردارانہ نظام کی ایک کڑی یہ کان ونٹ تھا -

اس کے پاس زیادہ دولت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روسی امرا کی بیٹیاں یا دیگر خواتین جو راہبات بن جاتی تھیں ' وہ اس میں شامل ہوجاتیں - وہ اپنے ساتھ بڑی دولت اور مال لایا کرتی تھیں - ۱۶ویں صدی میں زار شہزادی الینا پیلتسکایا' جو زار ایوان چہارم کی بیوہ تھی ' اس میں شامل ہوئی - اس کے بعد کئی اور شہزادیاں اور بیوائیں اس میں آئیں -

۱۶ویں --- ۱۷ویں صدیوں میں اس کی پتھر کی چار دیواری تھی اور عمارتوں کے اندر لکڑی کے بعض حصوں پر سونا منڈھا ہوا تھا - ۱۷ویں صدی میں یوکرین اور بائلورشیا کی بہت سی راہبات اس میں شامل ہوئیں جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے -

اواخر ۱۷ویں صدی میں اس کی عمارات میں اضافہ ہوا - گرجے' گھنٹہ گھر اور دیگر کمرے بنائے گئے - بے شمار معمار' مصور' بڑھئی ' سنار وغیرہ اس میں کام پر لگے رہتے تھے - اس میں چونکہ شہزادیاں پناہ لیتی تھیں ' اس لیے اس کا سیاست میں بھی دخل ہوگیا تھا - اواخر ۱۷ویں صدی میں زار کا دارالحکومت سینٹ پیٹرزبرگ منتقل ہوگیا' اس سے کان ونٹ کا شاہی خاندان سے تعلق منقطع ہوگیا -

اس عمارت کی آخری شکل عشرہ ۱۷۸۰ء میں مکمل کی گئی - اسی صدی (۱۸ویں صدی) میں اس کان ونٹ کے علاقے میں ایک قبرستان بھی بنادیا گیا - چنانچہ ہر دور میں اس کمپلیکس میں اضافہ ہوتا رہا -

بدقسمتی یہ ہوئی کہ میرے کیمرے کو ٹھنڈ لگ گئی ! نہ جانے وہ کیوں رک گیا - میں نے تو اس میں نئے سیل ڈالے ہیں ' پھر کیا ہوا ہے - میں کان ونٹ میں فوٹوگرافی نہ کرسکا - مگر میں نے یہاں ایک کتابچہ خرید لیا ہے - شاید اس کی تصاویر کی مدد سے کتاب میں چند تصاویر شریک کی جاسکیں -

بلشوئی تھیٹر

روس کے بلشوئی تھیٹر کو عالمی شہرت حاصل ہے - یہاں دو قسم کے پروگرام ہوتے ہیں : اوپیرا اور بیلے - اوپیرا میں ڈراما اور موسیقی اور بیلے میں رقص و موسیقی پیش کی جاتی ہے - عجیب اتفاق ہے جس بار بھی میں یہاں لایا گیا ڈائلاگ پروگرام ہی ملا - سال گزشتہ میں یہاں آیا تھا - میں اور جاپان کے ڈاکٹر یاسوہیرو کا نیناگا (Yasahiro Kanenaga) دونوں تھیٹر کے دو حصے دیکھ کر اور تیسرا حصہ چھوڑ کر اٹھ گئے تھے - آج بھی سعدیہ اور میں اپنے مترجم میزبان کے مشورے پر ایک حصہ چھوڑ کر

اٹھ آئے۔ ساڑھے تین گھنٹے بیٹھنا آسان نہیں ہوتا جب کہ پروگرام کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آئے۔

روس کے ہر بڑے شہر میں تھیٹر موجود ہیں۔ ماسکو شہر میں بلشوئی تھیٹر، مالی تھیٹر، موسکو آرٹ تھیٹر اور وختانگوف تھیٹر مشہور ہیں۔ ان سب میں سے سب سے بڑا تھیٹر بلشوئی تھیٹر ہے جس کے پاس اوپیرا اور بیلے دونوں کے نہایت عمدہ طائفے موجود ہیں۔ بلشوئی تھیٹر ۱۷۷۶ء سے موجود ہے۔ اس کا اسٹیج خاصا کشادہ ہے اور تماشائیوں کے لیے سات گیلریاں ہیں جن میں ۲۳۰۰ تماشائیوں کی گنجائش ہے۔ اس تھیٹر کا فرنیچر، صوفے، قالین اور پردے ہر چیز روس کی روایتی ثقافت کی عکاس ہے۔ روسی کمپوزروں میں مقبول شخصیتیں چائیکوفسکی، گلینکا، موسورگ سکی اور سکرایابن ہیں۔

عیسائیت کے لیے راہوں کی ہمواری

۱۹۸۸ء میں "موسکو میں عیسائیت کے ہزار سال" کا جشن منایا گیا۔ اس میں دنیا بھر سے عیسائی آئے، جمع ہوئے اور جشن عیسائیت دھوم دھام سے منایا گیا۔ ساری دنیا میں اس کی شہرت ہوئی۔ روس میں نظریاتِ غیر روس کے لیے یہ آزادی کم از کم ستر سال بعد ملی ہے۔

میں نے یہاں روس میں یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لوگ قرآن کریم کے لیے ترستے تھے اور ان کو میسر نہ آتا تھا۔ لوگ کسی طرح قرآن لاکر ان کو تحفے کے طور پر دے دیتے تھے وہ ان کو اپنے گھروں میں چھپا کر رکھتے تھے۔ بند مساجد میں اگر کبھی نماز ہو بھی جاتی تو قرآن کی تلاوت کی اجازت مساجد میں نہ تھی۔ مگر اب حالات یہ ہیں کہ خود روس میں قرآن حکیم کی طباعت ہو رہی ہے اور اس کی فروخت و تقسیم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ رابطۂ عالمِ اسلامی نے بھی حال ہی میں ایک بڑی تعداد میں قرآنِ حکیم برائے تقسیم بھجوائے ہیں۔

انقلابِ اکتوبر کے بعد کم از کم ستر سال تک روس میں اشتراکیت کا بازار گرم رہا جو روس کا نظریہ حیات قوی رہا۔ دوسرے ہر قسم کے نظریۂ حیات کا یہاں ابطال اور

اخراج رہا ہے۔ اب صورت حال یہ نہیں۔ صدر روس جناب میخائل گورباچوف کا طرز فکر اور انداز حکومت نظریاتِ غیر پر جابرانہ پابندیوں کا روادار نہیں ہے۔ بنیادی طور پر روس ایک عیسائی مملکت ہے۔ مگر روس میں پانچ قطعی مسلم ریاستوں کے ادغام کے بعد یہاں روس میں اسلام کا دینِ کامل موجود ہے۔ گو نظریۂ اشتراکیت کے نفاذ کے دور میں اسلام یہاں خاموش رہا مگر ہر کوشش کے باوجود روس میں اسلام دلوں سے خارج نہیں کیا جاسکا۔ شاہ ایران پر روس کا الزام یہ تھا کہ ایران سے فارسی زبان میں تاجیکستان میں تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رہا ہے جس نے ازبکستان کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس میں فارسی زبان روسی خط میں لکھی پڑھی جانے لگی۔ اس کے بعد اس فارسی میں روسی زبان کو داخل کیا گیا اور تدریج کے ساتھ فارسیت کو کم و کمتر کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح کم از کم تاجیکستان میں فارسی زبان میں تبلیغ کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس کے بعد آبادیوں کو خلط ملط کیا گیا۔

اس کے باوجود اقتدار روس سے اسلامیت کا اخراج ممکن نہ ہوسکا۔ اب آزادی کے نئے حالات میں اسلام کے لیے آواز بلند ہونی شروع ہوگئی ہے۔ آج روس میں اس آوازۂ اسلام کو دبانے کی کوششیں نہیں ہو رہی ہیں۔ البتہ یہ خطرہ یہاں محسوس کیا جا رہا ہے کہ آج سے ۱۵ - ۲۰ سال بعد روس میں مسلمان اکثریت میں ہوجائیں گے!

بلشوئی تھیٹر میں آج کا پروگرام من حیث المجموع تبلیغ عیسائیت پر مشتمل تھا۔ روس میں مذاہب کی یہ آزادی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے دور رس نتائج پر احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں اہل اسلام، بالخصوص دنیائے عرب میں مقاطعۂ روس کی پالیسیوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ عالم اسلام کے سربراہوں کو سربراہِ روس سے رابطہ قائم کرنا چاہیے اور اسلام کے بارے میں ایک مثبت پالیسی پر توجہ کرنی چاہیے۔ پالیسی کا ثبات مشورۂ بغاوت سے انحراف کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیے۔ روس کے خلاف محاذ جنگ بنانے کے بجائے مصالحت کی راہ اختیار کرنی چاہیے کہ دنیا کے ہر ملک میں مذاہب و ادیان اتفاق رائے کے ساتھ رہ

سکیں۔

ہر مذہب کی اپنی اپنی خوبیاں ہیں مگر اسلام میں چند ایسی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جو اور کسی ثقافت میں نہیں۔

اول یہ کہ اسلام انتہائی درجے کا انسان دوست مذہب ہے جو مکمل طور پر روا دار ہے۔ رنگ اور نسل کی تفریق کا قائل نہیں۔ آقا اور غلام کے امتیاز کو رد کرتا ہے۔ انسان تو انسان جانوروں تک پر رحم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دوم یہ تہذیب ساز مذہب ہے۔ بڑے بڑے شہر بساتا ہے۔ معاشرے کو علمی' فکری' تجارتی اور صنعتی طور پر ترقی دیتا ہے۔ عرب میں اٹھا تو اس نے ایک لازوال مسلم تہذیب کی بنا ڈالی۔ اندلس میں گیا تو اس نے بے مثال اسلامی اندلس کی تہذیب کی بنا ڈالی جس سے پورا یورپ علم کی روشنی حاصل کرتا تھا۔ افریقہ میں گیا تو اس نے سیاہ فام معاشرے کو عظمت بخشی۔ ترکستان میں گیا تو اس نے سمرقند و بخارا میں بلندیوں کو چھونے والی ایک ایسی تہذیب قائم کی کہ جس کے نشانات صفحہ ارض پر اب تک موجود ہیں۔ ہندستان میں گیا تو اس نے شان دار مسلم ہند کی تہذیب پیدا کی۔ ملائیشیا اور انڈونیشیا میں اور چین میں خاص طور پر سنکیانگ میں جو مسلم ثقافتیں سامنے آئیں انھیں تاریخ کے مخالف ریلے مٹا نہیں سکے۔

تیسرے یہ کہ اسلام ہم زیستی یا بقائے باہمی کا سبق دیتا ہے۔ اندلس' افریقہ اور شام وغیرہ میں یہ عیسائیت کے ساتھ' ترکستان اور افریقہ میں شامان عقیدے والوں کے ساتھ' ہندستان میں ہندومت اور بدھ مت کے ساتھ چین میں کنفیوشس ازم اور تاؤ ازم کے ساتھ پرامن زندگی بسر کرتا رہا ہے اور ساتھ ہی اس نے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی ہے۔

انسان دوستی' تہذیب سازی اور ہم زیستی ایسی خصوصیات ہیں جو تمام ثقافتوں سے بڑھ کر اسلام اور مسلم معاشروں میں موجود ہیں اور ان کی بنا پر اس کی چوتھی خصوصیت ہمہ گیری ہے۔

سلطنت روس اور اسلام

سلطنت روس کا مرکز عظیم روس اور عظیم روس کا مرکز مسکووی ہے۔ عظیم روس سے مراد وہ علاقہ ہے جس کا صدر مقام مسکووی (موسکو) ہے اور اس کے مقابلے میں صغیر روس سے مراد یوکرین ہے جس کا صدر مقام کیف ہے۔ مسکووی پہلے ایک بڑی امارت تھی' وہ بادشاہت بنی اور پھر ایک سلطنت۔ لیکن موسکو کے عظیم شہزادے کا خطاب زار کبھی تبدیل نہیں ہوا۔

شروع میں موسکو کیف سے کم تر درجے کا شہر تھا۔ ۱۲۴۰ء میں منگولوں نے جب کیف کو برباد کردیا تو موسکو کو پنپنے کا موقع مل گیا۔ مسکووی منگولوں کے خان اعظم کا ۱۴۷۶ء تک باج گزار رہا ہے۔ مسکووی کے حکمرانوں نے کبھی بھی منگولوں سے اپنا عہد وفاداری نہیں توڑا اور نہ انھوں نے کبھی منگولوں کو شکست دی ہے حالانکہ مصر نے منگولوں کو عین جالوت پر شکست دے کر ان کی پیش قدمی روک دی تھی۔

منگول مطلق العنانی کی روایت

یہ حقیقت ہے کہ منگولوں کی ایک باج گزار ریاست کے طور پر روس بھی منگول مطلق العنانی میں رنگا گیا۔ یہ بات روس کی سماجی اور سیاسی ترقی میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ روس' منگول سلطنت کی آخری باقیات میں سے ہے کیوں کہ اس نے اس سے اپنا عہد وفاداری کبھی ختم نہ کیا۔ کارل مارکس نے کہا تھا کہ منگولوں کی غلامی کا دلدل مسکووی کا گہوارا بنا۔ روس کیا ہے وہ مسکووی کی ایک دوسری شکل ہے۔

۱۴۷۶ء میں حالات بدل گئے' منگول' جو دنیا کا سب سے بڑا عذاب تھے' خود بدل گئے اور موسکو آزاد ہوگیا۔ اسلام کی عظیم کامیابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے منگولوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ جس قوم نے اسلام کو قریب قریب صفحۂ ہستی سے نابود کرنا چاہا' جس نے صرف مرؤ میں دس لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا اور نیشاپور میں تو کتوں اور بلیوں تک کو مار ڈالا' وہ تیسری نسل

میں مسلمان ہوگئی - یہ ایک معجزہ ہے - منگول لشکر کے تاتاری جنوب میں آباد تھے - ان کا گڑھ کریمیا تھا - موسکو باج گزاری کی وجہ سے منگولوں کی تباہی سے تو بچ گیا تھا' لیکن ۱۵۷۱ء میں تاتاریوں کی یلغار سے نہ بچ سکا - انھوں نے دو لاکھ روسی مار ڈالے - ایک لاکھ تیس ہزار کو غلام بنا کر بیچا' یہاں تک کہ مصری امرا کے پاس بھی روسی غلام ہوا کرتے تھے -

ان واقعات کی اہمیت واضح ہے - روس ہر لحاظ سے مسلمان دشمن نظر آتا ہے - روسی لوگ جبلت کے لحاظ سے یا نسلاً منگول تو ہوسکتے ہیں (آنکھوں میں ذرا سا ترچھا پن اور سیاہ بال اس بات کے غماز ہیں)' لیکن وہ مسلمان ہرگز نہیں - درحقیقت صدیوں تک اسلام سے لڑائی کے بعد ہی روسیوں میں روسی قومیت کا احساس پیدا ہوا تھا -

منگول خوانین کی پہلی امارت جو زوال پذیر ہوئی وہ کازان کی امارت تھی اور دریائے وولگا کے موڑ پر واقع تھی - اس زمانے میں موسکو اور اس کے گرد و نواح کو روس کہتے تھے - موسکو کے گرد و نواح میں تین دریا تھے : مغرب میں نیپر' جنوب میں دون اور مشرق میں وولگا - ان تمام دریاؤں کے علاقے میں گھنے جنگل واقع تھے - روس ان دریاؤں اور جنگلات کے ذریعہ سے اپنی توسیع کرسکتا تھا - دریائے نیپر پر کنٹرول رکھ کر انھوں نے فن لینڈ کی فتح کی راہ ہموار کی' دریائے دون پر کنٹرول سے وہ بحیرہ سیاہ اور کریمیا پہنچے اور دریائے وولگا کے راستے وہ بحیرہ کیسپین اور ایران پہنچے آذر بائیجان کا جو حصہ روس کے اقتدار سے بچ گیا ۱۹۴۵ء میں اس نے اسے بھی دبانا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا - دراصل کازان کی امارت کے زوال (۱۶ویں صدی) ہی سے روس ایران پر نظریں جمائے ہوئے تھا - ان تین دریاؤں کی تین سمتوں کے علاوہ چوتھی سمت سائبیریا تھی جس کے راستے اس نے چین اور جاپان کا رخ کیا - اس پیش قدمی کا آخری مرحلہ سکھالین جزائر پر روس کا قبضہ ہے - اس نے جاپان سے اپنے معاہدہ ۱۹۰۵ء کو یک طرفہ طور پر منسوخ کردیا - وولگا کو عبور کرنے سے انھیں وسط ایشیا کا راستہ مل گیا -

فتوحات

۱۵۵۲ء میں ایوان چہارم خوفناک کے ہاتھوں کازان کی امارت زوال پذیر ہوئی - پھر ۱۵۵۶ء میں تاتاریوں کا دارالحکومت استراخان ان کے ہاتھ لگا - اس سے روسیوں کے پاس ایران اور وسط ایشیا کی کنجیاں آگئیں - اس کا بڑا نشانہ مسلمان ملک تھے - اس کے بعد وہ جنگ عظیم اول میں ارض روم اور سطح مرتفع اناتولیہ میں پہنچ گئے -

کریمیا بحیرہ سیاہ میں ایک بڑا جزیرہ ہے اس لیے وہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا - ۱۴۷۵ء میں یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنا - کریمیا سے تاتار نکل کر روس کے اندرونی علاقے پر حملے کرتے تھے - ۱۴۸۷ء اور ۱۴۸۹ء میں انھوں نے ایسا کیا - روس نے کریمیا پر قبضہ کرنا چاہا مگر پندرہ ہزار تاتاریوں نے موسکو کی تین لاکھ فوج کو بُری طرح پسپا کردیا -

۱۶۹۴ء میں زار پیٹر اعظم نے عیسائی دنیا کی طرف سے اسلام کو تباہ کرنے کی ٹھانی - اس نے اپنے فوجی افسروں کو یورپ سے تربیت دلوائی تھی - قلعہ بندی اور منجنیق کے استعمال میں وہ مہارت حاصل کرکے آئے - پیٹر کا خیال تھا کہ ازوف (روستوف کے قریب ایک مقام) پر قبضہ کرنے سے بحیرہ سیاہ پر اس کا تسلط قائم ہوجائے گا - اس نے تین بار حملہ کیا - بالآخر ۱۶۹۶ء میں وہ کام یاب ہوگیا - اس زمانے میں سویڈن کی طرف سے روس دبا ہوا تھا مگر اس کے باوجود وہ گرم سمندر پر اپنا غلبہ چاہتا تھا - وہ چاہتا تھا کہ ایک تو بحیرہ بالٹک اور دوسرے بحیرہ سیاہ پر اپنا تسلط جما کر اپنی تجارت بڑھائے - آج جو ایستونیا اور آذر بائیجان میں آزادی کی لہر ہے' وہ روس کے بالٹک اور بحیرہ کیسپین پر تسلط کے سخت خلاف جاسکتی ہے' کیوں کہ اس کے لیے تو اس نے ایک صدی سے زیادہ مدت تک جنگیں لڑی ہیں -

۱۷۱۱ء میں ترکی اور روس کی جنگ چھڑ گئی - روس نے بلقان میں مہم شروع کرنے کی تباہ کن غلطی کی کیوں کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ بلقان کی عیسائی ریاستیں اس کا ساتھ دیں گی - ترکوں نے روس کو شکست فاش دی - چنانچہ جنگ کے بعد کے معاہدے کے

تحت روس کو ازوف سے دست بردار ہونا پڑا۔

۳۹ - ۱۷۳۵ء میں روس نے دوبارہ جنگ شروع کی - اس بار بھی اس کا ستارہ زوال میں تھا - ۱۷۴۱ء میں الزبتھ اقتدار میں آئی ' اس نے مغرب کے ساتھ جارحانہ پالیسی شروع کی - ۹۶ - ۱۷۶۲ء کے زمانے میں کیتھرین عظیم نے ویسی ہی جارحانہ پالیسی جنوب کے خلاف شروع کی -

۷۴ - ۱۷۶۸ء کی جنگ مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ رہی - سلطنت عثمانیہ نے ۱۷۷۰ء میں بلقان میں شدید نقصانات اٹھائے - ۱۷۷۰ء میں روس نے چار اسکواڈرن جمع کیے جو بالٹک سے بحیرہ روم آئے اور ترکوں کے پندرہ جہازوں کو غرقاب کر گئے - ترکی کو ازوف اور کئی دیگر مقامات چھوڑنے پڑے - اس کے بعد روس اپنے دشمن تاتاریوں کے پیچھے پڑ گئے - انھوں نے تاتاریوں کی کبھی جان بخشی نہیں کی - جنگ عظیم دوم میں جب روس کا طوطی بولنے لگا تو تمام تاتاریوں کو ملک بدر کرکے روس کے اندر دوسرے مقامات پر لے گئے -

۱۷۷۸ء میں روس نے بالآخر کریمیا فتح کرلیا اور اسی کے ساتھ اس کے پاس سلطنت عثمانیہ کی کنجی آگئی - انھوں نے قفقاز میں جارجیہ اور یورپ میں مولداویہ پر قبضہ کرلیا - کریمیا میں انھوں نے سیواستوپل کی بندرگاہ پر ایک بحری بیڑا قائم کیا - ۱۷۸۷ء میں روسیوں نے اوسٹریوں سے اتحاد کرلیا اور سلطنت عثمانیہ کا گلا گھونٹنے کی تیاری ہونے لگی - ان کا خیال تھا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے بزنطینی سلطنت کو زندہ کیا جائے - اوچاکوف کے قلعے پر قبضہ کرکے روسیوں نے ۹۵۰۰ ترکوں کو تہ تیغ کیا - یہ لاشیں پورے موسم سرما میں پڑی رہیں - روسی خواتین گاڑیوں میں ان لاشوں کو دیکھنے کے لیے آتی رہیں - ڈینیوب کے ڈیلٹا میں قلعہ اسمٰعیل کی شکست پر چالیس ہزار ترک فوج کا صفایا کردیا گیا - ۱۷۹۲ء میں متارکہ جنگ ہوا تو کریمیا' اوچاکوف اور بحیرہ سیاہ کے تمام شمالی ساحل پر روس کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا۔

۱۸۲۷ء میں داغستان کے پہلے امام غازی محمد نے بغاوت کی - وہ ۱۸۳۲ء میں مارا گیا - ہمزار بے امام بنا - اس کے بعد شمویل تیسرا امام بنا - ۱۸۴۰ء میں پورا قفقاز

میدان جنگ بن گیا - اگر اس وقت (۱۸۵۷ء) ترکی شمویل کی فوجوں کے ساتھ رابطہ قائم کرلیتا تو حالات اور ہوتے - اس تاریخی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمویل کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور روس کو برتری حاصل ہوئی - بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کامیابیوں کا تانتا بندھ گیا - فتح علی شاہ کی حکومت میں آذربائیجان پر روس نے قبضہ کرلیا - آذریوں نے بھی کسی سے رابطہ قائم نہ کیا - یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی ہے کہ ان میں اتحاد کے لیے روابط قائم نہیں ہوتے - ۱۸۶۷ء میں تاشقند پر روسی قبضہ ہوا - بخارا ۱۸۶۸ء میں ان کے ہاتھ لگا - خیوہ ۱۸۷۳ء میں اور مرو ۱۸۸۴ء میں - یہاں تک کہ ۱۸۹۴ء میں افغانستان کا کچھ حصہ روسی تاجیکستان کے ساتھ لگا دیا گیا - روسی جمہوریتیں ترکستان' تاجیکستان' ترکمانستان اور کرغیزیا سب ۱۹۲۱ء کے بعد کی تخلیقات ہیں - یہ سب امارتِ بخارا کے حصے بخرے ہیں -

روس زبردست سامراجی رہے ہیں - دنیا کی کئی سلطنتیں ختم ہوچکیں اور بھلا بھی دی گئیں ' لیکن روس موجود ہے - روس نے اپنے صوبوں (جمہوریتوں) میں صنعتوں اور دیگر وسائل کو اس طرح تقسیم کر رکھا ہے کہ کوئی خودکفیل نہیں اور ہر ایک کا انحصار دوسروں پر ہے - جب کہ صورت حال یہ ہے کہ وسط ایشیا کی جمہوریتیں مل کر ایک طاقت ور اسلامی بلاک بن سکتی ہیں - تاریخ کے لحاظ سے اگر روس منگول سلطنت ہی کا چربہ ہے تو کیا پھر ایک دن یہ بھی منگول سلطنت کی طرح ریزہ ریزہ ہوجائے گا؟ پیٹر کے زمانے میں اور اس کے بعد مغربی ادارے درآمد کرنے سے وہ ٹوٹ پھوٹ سے بچتی رہی - ۱۹۱۷ء کے بالشوئی انقلاب سے اس سلطنت کو ٹوٹنا چاہیے تھا ' لیکن کمیونزم میں سرمایہ دارانہ نظام کی سی لچک نہیں - اس نے روس کو تاریخ کے ایک خاص مقام اور مرحلے پر منجمد کردیا - اس کی ترقی رک گئی مگر ملک نہ ٹوٹا - اب گورباچوف جس پیرسترائیکا کو لائے ہیں تو یہ بہت دیر سے لایا گیا ہے - اگر یہ ناکام ہوا تو پھر روس میں طوائف الملوکی پھیلے گی - روس تو اسلام کے نقصان پر ایک سلطنت بن گیا ہے 'کیا اسلام اس کے زوال کا باعث ہوسکتا ہے؟ ایسا کہنا بہت مشکل ہے ' لیکن یہ ضرور امید کی جاسکتی ہے کہ جب روس رو بہ زوال ہوگا تو پھر اسلام دنیا

کی ایک بڑی طاقت بن جائے گا۔

لینن اور انقلاب اکتوبر

لینن، ان کی شخصیت اور ان کے انداز فکر و نظر پر عالمی سطح پر متعدد اندازے اور مختلف پہلوؤں سے بحث گزشتہ نصف صدی سے جاری ہے۔ اس ذیل میں مغربی انداز فکر خاصا قابل توجہ ہے اور ہمیں اسے ضرور سامنے رکھنا چاہیے۔ لینن ازم پر اسلامی انداز فکر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ عالم اسلام میں فکر و نظر کا انداز یہ رہا ہے کہ لینن ازم کو دائماً قرار حاصل نہیں ہوسکتا۔ میرا خود اپنا مطالعہ اس رائے کے حق میں ہے کہ عالمی سطح پر دوسرے نظریات جس شد و مد کے ساتھ فروغ پا رہے ہیں ان کے سامنے ایک دن ایسا آکر رہے گا کہ نظریات لینن شکست کھاجائیں گے، مگر یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ خود روس کے اندر اور روس کی کولونیوں میں نظریہ حیات روسیہ کو کب تک قرار رہے گا۔ اگر روس میں موجودہ اقتصادی اضمحلال جاری و ساری رہا اور اس کا کوئی حل دریافت نہ ہوسکا تو لینن کے نظریات کو لازماً ضعف پہنچے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ جب مغرب اور مشرق دونوں روس پر غلبہ حاصل کرنے کی سعی کریں گے مگر جہاں تک میرا مطالعہ ہے مغرب کا زبردست انداز فکر و نظر مشرق پر غلبہ قائم رکھنے کے سامان کرچکا ہے۔ اس لیے روس کے اندرونی انقلاب کا فائدہ یورپ ہی کو پہنچ سکتا ہے۔ عالم اسلام کا موجودہ اضمحلال اور آنے والا شدید اضمحلال روس کے اندر موجود مسلم طاقت کے لیے شاید ہی باعث تقویت ہو۔

خیر، آیئے، پہلے لینن ازم کا مغرب کی نگاہ سے مطالعہ کریں۔

دنیا میں پہلی سوشلسٹ مملکت کا بانی لینن آج بھی روس میں موجود ہے۔ اسے تصاویر، مجسموں، کتابوں کے سرورق اور پوسٹروں کی صورت میں ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی کی وہ تاریخ ساز شخصیت روس کی سرزمین پر آج بھی عقیدتوں کا مرکز ہے۔

کئی مغربی مورخین نے لینن کی ایک مختلف تصویر پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

وہ بلاشبہ ہمہ جہت مقتدر شخصیت تھا مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک شیطانی (demonic) روپ بھی تھا۔ روس کے تاریخ نگاروں نے اس پر سخت اعتراض کیا ہے اور اسے محض ایک بوژوائی غلط بیانی قرار دیا ہے۔ دراصل اس مسئلے پر ایک تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ موسکو کی سرکاری نصابی کتب میں ابھی حال تک یہ پڑھایا اور جتایا جاتا رہا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی پر لینن کا مکمل کنٹرول تھا۔ سنٹرل کمیٹی پارٹی کو کنٹرول کرتی تھی اور پارٹی عوام کو۔ یہ بات کئی عشروں سے سختی کے ساتھ لکھی اور پڑھائی جاتی رہی ہے چناں چہ اگر مغربی مورخوں نے لینن کے بارے میں مذکورہ بالا رائے قائم کی ہے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیئے۔ انھوں نے اس خیال کو رد کرتے ہوئے کہ لینن ایک پاک نفس مخلص سیاست داں تھا اسے شیطانی سیاست داں بتایا ہے۔ اس رویے پر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مغرب کی شہرہ آفاق روایتی بصیرت لینن کے لیے نہیں۔

یہ بات ہمیشہ دلچسپی کا موضوع رہی ہے کہ بالشویک پارٹی نے انقلاب اکتوبر کے ذریعہ سے اقتدار پر قابض ہونے کے لیے خود کو کس طرح منظم کیا اور کئی عشروں تک اقتدار کیوں کر سنبھالے رکھا۔ یہ حیرت انگیز اتفاق ہے کہ روس اور مغربی ممالک دونوں جگہ نصابی کتب میں لینن ہی کی شخصیت اور کارناموں پر توجہ دی گئی ہے۔ سنٹرل کمیٹی اور مقامی کمیٹیوں کے ارکان نیز پارٹی کے ممبروں کا ذکر کم ہی ملتا ہے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ پہلا سوشلسٹ انقلاب جس بڑی پارٹی نے برپا کیا اس کی فکری رہنمائی اور تنظیم کا کام تنہا ایک شخص نے انجام دیا ہو۔ پارٹی کی مقامی تنظیموں کے بارے میں جو تحقیقی کام ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۱۷ء میں اس سطح پر خاصی سرگرمی سے کام ہو رہا تھا۔ بالشویکوں میں خود اعتمادی موجود تھی۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں سے پارٹی کے چند ہی ممبروں نے مارکس یا لینن کو پڑھا ہوگا، لیکن وہ سب قصبات اور گاؤں میں انقلاب کے لیے خود ہی جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے سامنے دوسرا راستہ بھی نہ تھا اس لیے کہ سنٹرل کمیٹی کے لیے محدود ذرائع مواصلات اور تربیت یافتہ افراد کی کمی کے باعث ممکن ہی نہ تھا کہ وہ تمام مقامی پارٹیوں سے رابطہ

قائم رکھ سکے اور ان کی رہنمائی نیز سرگرمیاں کنٹرول کرنے کا کام انجام دے سکے۔

لینن ایک خود اعتماد لیڈر تھا، وہ کوئی ناکارہ شخص نہیں تھا مگر وہ عام طور پر جب کوئی قدم اٹھاتا تو گویا اسے یقین ہوتا تھا کہ وہ ناکام ہوجائے گا اور اس کی یہ کمزوری انقلابی تحریک کی قیادت سنبھالنے کے بعد دور ہوئی۔ دوسری جانب اس نے عوام کی امنگوں اور خواہشات سے آگاہی کے بعد ہی اسی بنیاد پر اپنے خیالات اور اصول قائم کیے۔ لینن نے بعض مسائل پر رائے عامہ کی رہنمائی کی تو بعض معاملات میں دوسروں کی رائے پر عمل بھی کیا۔ اس کا یہ مطالبہ تھا کہ کارخانوں کے نظم و نسق پر مزدوروں کا کنٹرول ہونا چاہئے۔ وہ بعض ایسی غیر اصولی پالیسیوں کی مخالفت نہیں کرتا تھا جس میں اسے کوئی سیاسی فائدہ نظر آرہا ہو۔ ۱۹۱۷ء میں جب پارٹی نے یورپی ممالک میں سوشلسٹ انقلاب کی ناکامی کی صورت میں ممکنہ تدابیر کی پالیسی زیر بحث لانی چاہی تو اس پر لینن کا اظہار ناپسندیدگی اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ لینن بیسویں صدی کی قدآور سیاسی شخصیت نہیں تھا، لیکن اس سے لینن کی کامیابیوں کا پس منظر سامنے آتا ہے اور یہ اس کی اس تصویر سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا جس میں اسے روزمرہ کی سیاسی مصروفیات سے الگ تھلگ اور بس ایک بلند سطح سے پارٹی اور عوام کی رہنمائی کرتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ لینن نے قبل از وقت معاملات پر غور کرکے فیصلے نہیں کیے۔ بالخصوص روس کی عبوری حکومت اغلباً ۱۹۱۷ء کے اواخر تک کسی نہ کسی طرح برطرف کردی گئی ہوتی خواہ لینن کا وجود نہ بھی ہوتا۔ اس کی موجودگی نے برطرفی کے پروگرام اور نئی حکومت کے اقدامات کو متاثر کیا، لیکن بہرحال لینن کے بغیر برطرفی یقینی تھی۔

میخائل گورباچوف کے پرسترائیکا کے نفاذ کے بعد جو واقعات سامنے آئے ہیں انھوں نے انقلاب اکتوبر کی تاریخ کو متاثر کیا ہے اور اس کا پرجوش خیر مقدم یہ ہوا کہ اسٹالن پر تنقید کی سرکاری مہم کے ساتھ ہی سیاست و معیشت میں "انتظامیہ کی بالادستی کے نظام" کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے جس کی سربراہی اسٹالن نے کی تھی۔ ۱۹۵۰ء

کے عشرے میں خروشچیف کی اسٹالن مخالف مہم کے برعکس ہر بات کا الزام صرف اسٹالن اور اس کے چند ساتھیوں پر ہی عائد نہیں کیا گیا۔ انتظامیہ کی بالادستی کے نظام پر بحیثیت مجموعی نکتہ چینی کی گئی ہے۔

دوسرے ممتاز بالشویکوں الیکسی ایکوف، میخائل تامسکی اور سب سے بڑھ کر نکولائی بخارین کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ بعض دستاویزات سے لینن کے کردار کے بعض انسانی پہلوؤں کا انکشاف ہوتا ہے۔ الیگزینڈر کونستائی نے لینن سے متعلق اپنی یادداشتوں میں، جو انھوں نے سوئزرلینڈ سے واپسی پر تصنیف کی، بتایا ہے کہ ابتدائی دور میں کسی بڑے ہجوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے لینن کس طرح بدحواس ہوجاتا تھا۔ مورخوں کی رائے ہے کہ خانہ جنگی کے دوران لینن کے کیے ہوئے فیصلوں کا اچھی طرح جائزہ نہیں لیا گیا جیسا کہ لیا جانا چاہیے تھا۔ اب یہ بات تسلیم کی جانے لگی ہے کہ روس میں سیاست و معیشت پر جو انحطاط آیا اور اس میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں وہ "انتظامیہ کی بالادستی کے نظام" کی کارروائیوں اور اقدامات کا نتیجہ تھیں۔

بہرحال لینن کے بارے میں عام تاثر ملک میں بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کے باوجود کسی مخالفت کے بغیر اب تک تسلسل کے ساتھ قائم ہے۔

لینن کے بارے میں نمایاں آرا اور غالب تاثرات دو مختلف نوعیتوں کے ہیں:

ایک وہ جس میں لینن کو نابغہ روزگار جینیئس کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے جس نے ۱۹۱۷ء کے سوشلسٹ انقلاب کی شعوری جدوجہد میں پارٹی اور عوام کو متحد رکھا اور بعد میں جو مشکلات اور رکاوٹیں پیش آئیں وہ ان محرکات و عوامل کا نتیجہ تھیں جو لینن کے قابو سے باہر تھے۔ ان مشکلات کا تعلق یورپ میں سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے میں ناکامی اور خانہ جنگی میں غیر ملکی مداخلت سے تھا۔ اس طرز فکر کا زور اس پر ہے کہ لینن کی زیر قیادت روس کی داخلی سیاست میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان میں لینن کے سوا دوسرے تمام لوگوں کا قصور تھا۔ اسی طرح خانہ جنگی کے دوران حد سے زیادہ اجارہ داری پر مبنی ریاستی معیشت کی ۱۹۲۱ء کی نئی معاشی پالیسی میں منتقلی کا عمل بھی غیر

انسانی بصیرت کی ضرب شدید کا مظہر تھا۔ نیز اس امکان کو بھی نظرانداز کیا گیا ہے کہ لینن کی سابقہ پالیسی کی جڑیں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء کے دوران اس کی اپنی پرجوش مطلق العنانیت میں ہوسکتی ہیں۔

مقصد صاف ظاہر ہے: آج کی روسی قیادت سیاسی اصلاحات ' سماجی افہام و تفہیم اور نجی معیشت کی تحریک سے متعلق اپنے وعدوں کو پائے تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہے اس مقصد کے لیے وہ لینن کے نظائر تلاش کرنے پر مجبور ہے' لیکن "اب کیا کرنا ہے؟" کے زیر زمیں بالشویک گروپوں کے سخت گیر من مانی کرنے والے نظریہ ساز کیا اس سے مطمئن ہوجائیں گے؟ ۱۹۰۲ء کے بالشویزم پر مفاہمت کے امکانات بھی کم ہی ہیں اور یہ بھی نہیں کہ خانہ جنگی کے دور کا لینن آج کے حالات میں اپنی شخصیت اور اقوال سے اس کی اہمیت بڑھا سکے۔ لینن نے ۱۹۱۸ اور ۱۹۲۰ء کے دوران جو تقاریر کیں اور جو مضامین لکھے ان کا مرکزی خیال یہی تھا کہ پارٹی کے تمام دشمنوں کے خلاف مستقل اور بھرپور جدوجہد کرنے کے لیے عوام کو تیار کیا جائے۔

۱۹۲۰ء کی معاشی پالیسی کا حال ہی میں جو ازسرنو جائزہ لیا گیا ہے وہ اچھی بات ہے. سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ پالیسی اسٹالن ازم کے دور سے بالکل مختلف اور بعید ہے۔ جہاں تک آج کے پرسترائیکا اور لینن کی نئی اقتصادی پالیسی کا تعلق ہے ان میں بہرحال ایک ربط موجود ہے مگر ان میں تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں بالشویکوں کی داخلی سیاست ' مطلق العنانیت میں کمی کے بجائے اضافے کے بعد سامنے آئی۔ غیر بالشویک پارٹیوں اور سیاسی رجحانات کے خلاف جبر و تشدد میں بھی کمی نہیں بلکہ بہت اضافہ ہوا۔ ثقافتی کنٹرول بھی خانہ جنگی کے زمانے سے زیادہ سخت تھا۔

۱۹۸۵ء کے بعد روس میں جو کچھ نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ انقلاب اکتوبر کے بعد بالشویک لیڈروں نے سیاست اور معیشت کا جو تصور اپنایا تھا اس کی اب کایا پلٹ ہوچکی ہے۔ پرسترائیکا کی معروضی صورت حال سے یہ دباؤ بڑھ رہا ہے کہ لینن کی زیادہ صحیح تصویر سامنے لائی جائے۔ گلاسنوسٹ نے اخبار نویسوں کو پہلے ہی اجازت دیدی ہے کہ وہ قبل از پرسترائیکا روسی تاریخ میں سے جانشینی کے مسئلے پر بحث و

تمحیص کا آغاز کرسکتے ہیں۔ اسٹالنی آمریت کے تسلط میں قبل روسی تاریخ کے نظریاتی پہلوؤں کے بارے میں لینن کی ذمہ داری کو تفصیل سے زیر بحث لاسکتے ہیں۔ قومی اہمیت کے مفکرین بہت پہلے ہی اپنی یہ رائے دے چکے ہیں کہ لینن ازم اور اسٹالن ازم دونوں ہم عصر اور ایک ہی دور کی پیداوار ہیں اور لینن کے بارے میں دور از کار سرکاری نقطہ نظر کی کامیابی کا امکان نہیں۔ لینن ' پارٹی اور عوام کے بارے میں یہ تاثر کہ وہ انسانیت کے لیے سائنسی طور پر طے شدہ منزل کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھے 'اب یہ اطمینان بخش نہیں رہا۔ اگر روس کے سرکاری مورخین کو یہ آزادی نہیں دی جاتی کہ وہ زیادہ حقیقت پسندانہ عکاسی کریں تو روسی ریاست کے قانونی جواز کا اس کے شہریوں کے ذہن میں مزید کم ہونے کا خطرہ ہے۔ شاید اس طرح زمین ان لوگوں کے لیے ہموار ہوجائے گی جو لینن کی نہایت سیاہ تصویر پیش کرتے ہیں۔ روس میں زار کا تختہ الٹنے اور عبوری حکومت کا خاتمہ کرنے میں مزدوروں نے جو کردار ادا کیا اسے نظرانداز کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں جو کچھ ہوا وہ محض ایک سیاسی تجربہ نہیں تھا جس کا رخ کچھ خواص نے عوام کی طرف موڑ دیا ہو۔ یہ مزدوروں ' کسانوں اور فوجیوں کی از خود آزادی حاصل کرنے کی ایک رزمیہ داستان بھی ہے جنھوں نے قصبوں اور دیہات میں خود اپنی تنظیمیں قائم کیں۔ ہر قصبے اور شہر کی اپنی سوویٹ اور کسانوں کی اپنی دیہی کمیون تھیں۔

دوسرے الفاظ میں ۱۹۱۷ کے دوران میں روس میں دو ہی انقلاب برپا نہیں ہوئے یعنی ایک فروری میں رومانوف بادشاہت کے خلاف اور دوسرا الیگزینڈر کرنسکی کی قیادت میں حکومت کے خلاف۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سال کے دوران میں وہاں ہزاروں انقلاب برپا ہوئے۔ قصبوں' دیہاتوں تک میں بلکہ یہ تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہے اس لیے کہ نواحی بستیوں اور کارخانوں تک میں عوام نے بڑھ کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس طرح ۱۹۱۷ء کا سال دراصل عوام کی جدوجہد کا سال تھا

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پیتر گراد میں اقتدار پر بالشویکوں کا قبضہ ہزاروں میں سے محض

ایک انقلاب تھا ۔ بلاشبہ یہ بہت نازک اور سنگین مرحلہ تھا مگر اس سے صرف چند مخصوص مسائل ہی حل ہو سکے ۔ کسانوں کو زمینیں ملیں ، کارخانوں میں مزدوروں کو حتمی اختیارات حاصل ہوئے ۔ اور روس کو ۱۹۱۸ء میں ایک معاہدے کے تحت پہلی جنگ عظیم سے نجات ملی ۔ دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ قصبوں اور دیہی علاقوں میں معاشی انحطاط کو روکنے میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ اس کے ساتھ ہی بورژوائی املاک پر حملوں نے صورت حال مزید خراب کردی ۔ چیکا کے قیام اور قانون ساز اسمبلی کی برطرفی کے بعد عوام کو دبا کر رکھنے کے رجحان میں اضافہ ہوا ۔ اور ان تمام اقدامات میں لینن کا ہاتھ تھا ۔

جی ہاں ! لینن خلوص کے ساتھ معاشی استحصال اور سیاسی جبر سے آزاد دنیا کا خواہشمند تھا ، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس نے اپنے خوابوں کی اس دنیا کا مشاہدہ جس عینک سے کیا اس کے شیشے سیاہ تھے ۔ مزید برآں اسے اپنی پسند کے انتخاب کی بھی زیادہ آزادی نہیں تھی ۔ ۱۹۱۷ء میں روس کا المیہ یہ ہوا کہ اس کے ماہرین ہر مرض کا علاج نہیں تھے ۔

۱۹۱۷ء کے بعد کشمکش کا جو پہلا دور گزرا ہے پرسترائیکا بیشتر اعتبارات سے اس سے مشابہ ہے ۔ اپنے نتائج اور اثرات کے لحاظ سے یہ پہلا پرسترائیکا نہیں ۔ جس طرح انقلاب اکتوبر عام انقلابی عمل کی صورت میں جدوجہد کو مزید آگے بڑھانے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکا اسی طرح اب جون ۱۹۸۸ء میں پارٹی کی ۱۹ ویں کانفرنس کے یہ فیصلے جو پرسترائیکا کی صورت میں سامنے آئے ہیں وہ بھی پنجہ آزمائی اور طاقت کے مظاہرے کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے ۔

رائے عامہ کی تشکیل کرنے والوں کے درمیان لازمی طور پر خود لینن کی شخصیت بھی میدان جنگ بنے گی ۔ یہ بات کہ انسٹی ٹیوٹ اوف مارکس ازم و لینن ازم کے مورخین کو پارٹی کی تاریخ سے متعلق ایک واحد حتمی سرکاری ٹیکسٹ بک تیار کرنے کی ہدایت نہیں دی گئی ہے ، ایک امید افزا شگون ہے ۔ ۱۹۸۵ء سے پہلے تو اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس موضوع پر روس اور مغربی ممالک کے اسکالر باہم بحث و

تمحیص کرسکیں ۔ مشرق اور مغرب کے مابین لینن کے بارے میں ایک دوسرے سے کہنے اور سننے کے لیے خاصا مواد ہے ۔ حالات اب اس کے حق میں ہیں کہ نزاعات کے بجائے اب مستقبل کی اس شخصیت کے بارے میں متوازن بحث و مباحثہ اور تبادل خیال کیا جائے جس نے موجودہ صدی کی عالمی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں ۔ میری مراد جناب گورباچوف صاحب سے ہے ۔ میں نے اب تک ہر کوشش کی ہے کہ روس جس انقلاب کی زد میں ہے ، اور جناب میخائیل گورباچوف جس انداز و خیال سے پیش قدمیاں کر رہے ہیں ان کو اپنے مطالعے میں رکھوں ۔ فطری طور پر مجھے روس میں مسلمانوں کے حالات سے دلچسپی ہے ۔ میری نگاہ اور میرا قلب اس مستقبل پر ہے جس میں روس کے مسلمان اور ان کی پانچ مسلم ریاستیں کس انداز سے رہیں گی ۔ کیا وہ آزادی سے لطف اندوز ہوں گی ؟ مجھے اس میں قطعی شبہات ہیں ۔ میرا مطالعہ ہے کہ روس میں ہر قسم کی آزادی دی جائے گی مگر پانچوں مسلم ریاستوں کے مسلمان زیر نگیں رکھے جائیں گے ، مگر کیا ایسا ممکن ہوگا ؟

مستقبل کی شخصیت

یورپ میں اشتراکیت کی شکست و ریخت نے جو غیر یقینی صورت حال پیدا کی ہے اس میں ہر شخص کم از کم اس ایک بات پر متفق ہے :

"میخائیل گورباچوف کا اقتدار میں رہنا ہی بہتر ہے ۔ یہ پرسترائیکا اور مشرقی یورپ کی آزادی کے مفاد میں ہے ۔"

اگر روسی بلاک میں تبدیلیاں اسی رفتار سے جاری رہیں جیسی گزشتہ چند ماہ کے دوران میں آئی ہیں تو گورباچوف بہت جلد ریفارمر کی حیثیت اختیار کرلیں گے ۔

گورباچوف مغرب میں ہیرو بن چکے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے تصادم کو روک کر اور مشرقی یورپ میں جمہوریت کی اجازت دے کر انھوں نے وہ کام کر دکھایا ہے جسے بیشتر لوگ ناممکن سمجھتے تھے ۔ انھیں ہیرو بنے رہنے کے لیے اب ایک دوسرے چیلنج کا سامنا ہے --- پرسترائیکا کے دوسرے اور سخت ترین مرحلے کا چیلنج --- اور وہ چیلنج

یہ ہے کہ مشرقی یورپ میں انھوں نے جس جمہوری انقلاب کی اجازت دی تھی وہ اب خود روس کی طرف بڑھ رہا ہے!

یہ واقعہ رونما ہوچکا ہے۔ بالٹک جمہوریتوں کے سیاست داں کریملن کے اعتراض کے باوجود کثیر جماعتی نظام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ موسکو میں یہ دباؤ بڑھ رہا ہے کہ کیمونسٹ پارٹی کی بالادستی کے لیے آئین میں جو ضمانت دی گئی ہے اسے منسوخ کیا جائے۔ مکمل اور حقیقی جمہوریت کے مطالبے کا زور پکڑنا بھی یقینی ہے۔ اس طرح گوربا چوف کے سامنے ایک ناخوشگوار انتخاب کا مسئلہ آکھڑا ہوا ہے۔ وہ کثیر جماعتی نظام کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر انھوں نے ایسا کیا تو وہ عظیم ریفارمر سے جلد ہی عظیم مزاحمت کار بن جائیں گے۔ یا وہ روسی شہریوں کو وہی آزادیاں دے سکتے ہیں جو مشرقی یورپ کے ممالک حاصل کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں روسی عوام خود گوربا چوف کو برطرف کرنے کی آزادی کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔ مشرقی یورپ نے اس سال اپنے عمل سے جو پیام دیا ہے وہ یہ ہے کہ نہایت آزاد خیال کیمونسٹ بھی اگر ایک بار کمزور پڑتا ہے تو عوام اپنی مرضی کے انتخاب کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

بلاشبہ روس مشرقی یورپ نہیں ہے۔ آئندہ مہینوں میں ہم کثرت سے "روس مختلف ہے" پر دلائل سنیں گے۔ کیا اس پر لازماً یقین کرنا چاہیے؟ کیا وہ دلائل ہوں گے یا محض عذر خواہی ہوگی۔ اس سلسلے میں سب سے کمزور بات یہ ہے کہ روس کی کیمونسٹ پارٹی ایک خصوصی تنظیم ہے اور مشرقی یورپ کی کسی بھی کیمونسٹ پارٹی کے مقابلے میں کہیں زیادہ قبول عام کا جواز رکھتی ہے۔ اس دلیل کو قبول کرنے کا مطلب روسی پروپیگنڈے کو تسلیم کرلینا اور رائے عامہ کی روز افزوں شہادت کو نظر انداز کر دینا ہے۔ پارٹی اس پر تو فخر کرسکتی ہے کہ اس نے ۱۹۱۷ء کا انقلاب برپا کیا اور اب پرسترائیکا پیش کرنے کے اعزاز کا بھی دعوا کرسکتی ہے لیکن ان دونوں کے درمیان غلط کاریوں کے ستر سالوں کا اعتراف بھی اس کو کرنا ہوگا۔ کوئی آزادانہ انتخاب ہو تو کیا کیمونسٹ یقینی طور پر نکال پھینکے جائیں گے؟

البتہ گوربا چوف بجا طور پر ایک خصوصی شخصیت ہونے کا دعوا کرسکتے ہیں۔ وہ نہ ہوسک ہیں اور نہ ہونیکر جنھوں نے کٹھ پتلیوں کی حیثیت میں اپنے ملک کو جمود و ناکارکردگی کا شکار بنایا۔ گوربا چوف انقلاب و تبدیلی کی قوت ہیں۔ انھوں نے اقوام عالم سے اپنے لیے عزت و احترم حاصل کیا ہے۔ لیکن کیا اس کے لیے ووٹ دینے والے عوام بھی ان کے ممنون ہوں گے؟ گوربا چوف نے بڑی احتیاط سے خود کو اب تک کسی جمہوری آزمائش میں پڑنے سے محفوظ رکھا ہے۔ بیرون ملک ان کی مقبولیت کا کوئی اثر اندرون ملک نہیں پایا جاتا۔ ان کے ہم وطن ان پر معیار زندگی کو پست کرنے ہی کا الزام نہیں لگاتے' انھیں کیمونزم کے المیے کا بھی ذمہ دار گردانتے ہیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ گوربا چوف نے 'بیک وقت لوتھر اور پوپ بننے کی کوشش کی وجہ سے نقصان اٹھایا ہے۔ یعنی عظیم ریفارمر بھی اور نظریہ کے محافظ اعلا بھی۔ آزادانہ انتخابات ہوں تو کیا وہ آسانی کے ساتھ ہار سکتے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ روس آزادانہ انتخابات پر تیار نہیں ہوسکتا"روس مختلف ہے" کے سلسلے کی یہ سب سے مضبوط دلیل ہے۔ مشرقی یورپ کے ہنگاموں میں کوئی شخص بھی جمہوریت کے لیے ہلاک نہیں کیا گیا۔ روس میں ایسا کوئی بھی انقلاب خونی ہوسکتا ہے اور اس کا اختتام بھی آزادی پر نہیں ایک نئی آمریت پر ہوگا۔ روس ایک ایسا ملک ہے جہاں جمہوریت کی کوئی روایت نہیں۔ اسے جوڑنے والی قوت کیمونسٹ پارٹی ہے۔ یہ رہی تو لسانی تنازعات کے نتیجے میں روس ٹکڑے ٹکڑے ہوسکتا ہے۔ ایک ایسے ملک کا ٹوٹنا جس کے پاس جوہری ہتھیار بھی ہوں نہایت تشویش کی بات ہوگی۔

جب تک ممکنہ متبادل نااہل ہیں اور مشرقی یورپ کی نئی اور کمزور آزادی کے لیے خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں اس وقت تک توقع کی جاسکتی ہے کہ گوربا چوف برسر اقتدار رہیں گے۔ میں نے یہاں یہ محسوس کیا ہے کہ روس کے کچھ انقلابی تو اس کے باوجود اسٹالن ازم کی واپسی کے خوف سے چاہتے ہیں کہ گوربا چوف رخصت ہوجائیں' لیکن یہ صورت حال فوری طور پر کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتی ہے۔ یہ فرض کرلینا

صحیح نہیں ہوگا کہ روسی شہری جمہوریت کے لیے جدوجہد کرنے پر لاقانونیت کے عہد تاریک میں رہنے کو ترجیح دیں گے ۔ گلاسنوسٹ نے انھیں پہلے ہی کثیر جماعتی نظام کے ذائقے سے آشنا کردیا ہے ۔ جمہوری قوتوں نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ عوامی محاذوں ، ہڑتال کمیٹیوں اورپارلیمانی بین العلاقائی گروپوں کی صورت میں خود کو منظم کرنا شروع کردیا ہے ۔ عشرہ ۱۹۸۰ء کے اواخر کا حیرت انگیز واقعہ کمیونزم سے جان چھڑانے کے لیے مشرقی یورپ کی کوششوں میں دی جانے والی رعائت اور نرمی تھا ۔ اگر ۸۰ کروڑ کثیرا لنسل ہندستانی جمہوریت کا نظام چلا سکتے ہیں تو آخر ۳۰ کروڑ کثیرا لنسل روسی ایسا کیوں نہیں کرسکتے ؟ اگر اس سوال پر گوربا چوف اور مثال کے طور پر ستاروف کے درمیان انتخاب کا مسئلہ پیدا ہو تو کیا اس وقت بھی مغرب کمیونسٹ باس (BOSS) ہی کی حمایت کرے گا؟

لینن ازم کے بعد

میں یہ کہنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کمیونزم سے نجات ہی روسی معیشت کی واحد امید ہے ۔ گوربا چوف کی اقتصادی پالیسیاں اب تک کام یاب نہیں رہی ہیں اور وہ اب تک ایسی کوئی اطمینان بخش پالیسی نہیں دے سکے ہیں جس کے نتیجے میں معیشت کو انحطاط کے بجائے مخالف سمت میں چلایا جاسکے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پارٹی نے جس کے سربراہ گوربا چوف ہیں ، نجی ملکیت اور آزاد منڈی کے اصول کو مسترد کردیا ہے ۔ چناں چہ گوربا چوف اب امداد باہمی اور سوشلسٹ مارکیٹ جیسے سہاروں سے کام چلانا چاہتے ہیں ، کمیونزم تحلیل شدہ صورت میں بھی جس کی نمائندگی گوربا چوف کرتے ہیں ، اقتصادی بحالی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔

یہی نہیں ملک کی مختلف جمہوریتوں کی ترقی کی راہ میں بھی یہی رکاوٹ ہے ۔ روس کے لیے قابل قبول وفاق سے بھی زیادہ ڈھیلا ڈھالا وفاق ضروری ہے ـــ قوم کی مایوسی ختم کرنے کے لیے بھی اور جمہوریتوں کو اپنی مرضی سے اصلاحات نافذ کرنے کی

آزادی دینے کے لیے بھی ۔ بالٹک جمہوریتوں کی علاحدگی اور کئی دوسری ریاستوں کے لیے " کسی قدر آزادی " کوئی بری بات نہیں ہوگی بشرطیکہ یہ عمل پرامن طور پر ہو۔ چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں ، دیو قامت روس اور دوسرے سب ابھرنے والے اس نئے مشترکہ یورپی گھر میں سکھ چین محسوس کریں گے ۔

مغربی ماہرین کا انداز فکر یہ ہے کہ گوربا چوف کے لیے مغرب کی حمایت مشروط ہونی چاہئے ۔ وہ حمایت کے اس وقت تک مستحق ہیں جب تک وہ تبدیلیوں کو آگے بڑھانے کا کام کرتے رہیں اور اس کی مزاحمت نہ کریں یا ان کی حمایت اس وقت تک کی جائے جب تک ان کا متبادل خطرناک نظر آرہا ہو ۔ ۱۹۹۰ء کے وسط تک رومانیہ کے استثنا کے ساتھ روس کے وارسائی اتحادی کم از کم نیم آزادانہ انتخابات کرالیں گے اور روس مشرقی یورپ میں مقیم اپنی افواج میں خاصی کمی کرنے پر رضامند ہوجائے گا۔ مشرقی یورپ کے غیر کمیونسٹ مستقبل کو زیادہ محفوظ ہونا چاہئے اور خود روس کے اندر جمہوریت کی تحریک کو پیش قدمی کرنی چاہئے ۔ صرف اسی طرح لینن کے ملک میں جمہوری انقلاب کی راہ ہموار ہوسکتی ہے ۔

میرا مطالعہ یہ ہے کہ گوربا چوف برسر اقتدار رہنے میں کامیاب ہوتے جائیں گے اور کمیونزم کی جمہوریت میں پائیدار منتقلی کے عمل میں کامرانیوں سے ہم کنار ہوں گے جیسا کہ پولینڈ میں جنرل جیروزیلسکی نے کیا ہے ۔ وہ انتخابات بھی جیت جائیں گے لیکن جیسا کہ ۱۹۴۵ء میں برطانوی عوام نے فیصلہ کیا تھا کہ چرچل جنگ کے دوران تو بلاشبہ بہترین رہنما ثابت ہوئے ہیں مگر زمانہ امن میں وہ کام یاب نہیں رہیں گے ، اسی طرح دنیا کو اس امکان کے لیے بھی تیار رہنا چاہئے کہ گوربا چوف اسٹالن ازم کا تیا پانچہ کرنے میں تو بہت کام یاب رہے مگر وہ جمہوری نظام لانے میں کام یاب نہیں ہوں گے ۔

اسٹالن کا دور اور جور

جناب گوربا چوف کو روس میں متعدد مسائل کا سامنا ہے ۔ ایک مسئلہ "اسٹالن

ازم " ہے جس کی حمایت میں وہ عناصر کار فرما ہیں جو خود گوربا چوف کے مد مقابل ہیں آیئے ذرا اختصار کے ساتھ سمجھ لیں کہ یہ مسئلہ کیا ہے ۔

فلپ وائیٹ ہیڈ اور جوناتھن لیوس نے اسٹالن پر ایک کتاب " فیصلے کا وقت " لکھی ہے ۔ اس کے ساتھ انھوں نے ٹی وی سیریز بھی تیار کی ہیں ۔ فلپ وائیٹ ہیڈ لکھتے ہیں کہ اب اتنا وقت گزر چکا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے قتل عام کرنے والے قاتل کا جائزہ لیا جاسکتا ہے ۔ بہت سے لوگ جو اسٹالن کے دور کے ہیں اب ۸۰ سے ۹۰ برس کی عمر کے ہیں ۔ ان میں سے ایک ۹۹ برس کا ہے ۔ اب اگر ان سے معلومات حاصل نہ کیں تو یہ موقع ہمیشہ کے لیے ضائع ہوجائے گا ۔ اس کتاب پر مصنفین نے ۲۴ مہینے صرف کرکے اسٹالن کے دور کے شاہدوں کے حیرت انگیز گروہ کے انٹرویو لیے ۔ ان میں لینن کی بھتیجی (یا بھانجی) 'ٹراٹسکی کا پوتا' اسٹالن کی بھتیجی (یا بھانجی) اور بھتیجا اور اسٹالن کی بیٹی بھی شامل ہیں ۔ علاوہ ازیں اسٹالن کے باڈی گارڈ ' اس کے ترجمان ' ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے زمانے کے لوگ اور گولاگ میں واقع غلاموں کے لیبر کیمپ کے لوگوں کے بھی انٹرویو لیے گئے ۔ مصنفین نے اوائل دور کے اسٹالن کے حریف بخارین کی بیوی سے بھی ملاقات کی اور اس مخبر سے بھی ملے جس کی شہادت پر اسٹالن نے بخارین کو گولی مارنے کا حکم دیا تھا ۔

اس کتاب اور اس کے ساتھ ٹی وی سیریز کے تین حصوں کے لیے وائیٹ ' لیوس اور ٹی وی پروڈیو سر ٹونی کیش نے کل ۱۵۰ آدمیوں کے انٹرویو لیے اور ۱۳۰ گھنٹوں کی ایک فلم بنائی ۔ اس کو ایڈیٹ کرکے اب ۸ گھنٹوں کا ایک ویڈیو بنایا گیا ہے جو اسکالروں کو ۲۵۰ پونڈ کے عوض فراہم کیا جاتا ہے ۔

کتاب اور ویڈیو سیریز دونوں اصولی طور پر سوانح عمریاں ہیں ۔ اسٹالن کا اصلی نام جوزف وساریونووچ جوگاشویلی تھا ۔ اسٹالن اس کا لقب ہے جس کا مطلب ہے مرد آہن ۔ (اسٹالن ۱۸۷۹ء میں جارجیہ کے شہر طفلس کے قریب ایک جوتے ساز کے گھر پیدا ہوا تھا ۔ اس کا بچپن بڑی عسرت سے گزرا تھا) ۔

مصنفین نے ان جرائم کی شہادتوں کا جائزہ لیا جو اسٹالن کی موت کے بعد چالیس

برس سے روس کی سخت پریشانی کا باعث تھے ۔۔ کہا جاتا ہے کہ اسٹالن کے دور میں جنگ عظیم دوم میں مرنے والے ڈھائی کروڑ آدمیوں کے علاوہ خود اسٹالن کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے جانے والوں کی تعداد ۲۰ ملین اور ۳۰ ملین یعنی دو اور تین کروڑ کے درمیان ہے ۔

اسٹالن نے اجتماعی کاشت کرانے کا فیصلہ کیا ۔ اس کے لیے اس نے ذاتی فائدے کے لیے کام کرنے والے کولیک کسانوں میں سے جو اجتماعی کاشت پر آمادہ نہ تھے تیس لاکھ کسانوں کو مروا ڈالا ۔ اس کے علاوہ اس نے یوکرین میں خود مصنوعی طور پر قحط پیدا کرایا ۔ اس سے سترلاکھ کسان مرگئے ۔ اب ہر جگہ اس کے دشمن پیدا ہوگئے ۔ اس نے ان دشمنوں کے خلاف دہشت گردی کا بازار گرم کیا اور سترلاکھ آدمیوں کو مروا ڈالا ۔

اس نے گولاگ کے علاقے میں غلاموں کے لیبر کیمپ قائم کرائے ۔ ان کیمپوں سے اجتماعی کاشت اور سرکاری صنعتوں کے لیے لیبر فراہم کی جاتی تھی ۔ روس کی دس فی صد آبادی کو جبراً غلام بنادیا گیا ۔ ان قیدی کیمپوں سے بہت تھوڑی تعداد زندہ بچ سکی ۔ اسٹالن کی بیٹی نے بتایا کہ اس کاربار میں وہ تنہا نہیں تھا ۔ اس کے حامی بھی تھے ۔ اس کے احکام کی تعمیل کرنے والے بہت تھے جن میں سے اکثر کو اس نے مروا دیا تھا ۔ ایک جنگل میں پانچ سو ایسے گڑھے پائے گئے جن میں ڈیڑھ سو سے تین سو لاشیں ہر ایک میں پائی گئیں ۔

اس کتاب کی تفاصیل میں بعض کسانوں نے بتایا کہ ان کے دوست بھوک سے مر رہے تھے اور غلے کے ذخیرے پر اسٹالن کے سپاہیوں کا پہرہ تھا ۔ ایک خاتون نے ایک جنگل میں اس جگہ پھول لگائے جہاں اس کے خیال میں اس کے خاوند کو گولی ماری گئی تھی ۔ ایک اور خاتون کے خاوند کو جبراً لے جاکر مار دیا گیا اور وہ ۶۰ سال سے اس المیے کو یاد کرتی ہے ۔

ان باتوں کے باوجود اس کے ایسے حامی بھی تھے جو اس کی دیوتا کی طرح پوجا کرتے تھے ۔ ایک خاتون نے بتایا کہ میں چھوٹی سی بچی تھی اور اس وقت یہ سمجھتی

تھی کہ خدا اور اسٹالن ایک ہی آدمی کے دو نام ہیں۔ گولاک کیمپ کے ایک قیدی نے جو زندہ بچ رہا بتایا کہ جب لوگ دفن کیے جا رہے تھے اور بگل بجائے جا رہے تھے، میں ایک خالی کوٹھری میں گیا اور چیخ چیخ کر رویا۔

مصنفین نے روس کے محافظ خانے کی تقریباً ایک لاکھ نیٹ فلم کا جائزہ لیا جس کا کبھی مغرب میں اجرا نہیں ہوا۔ اس میں قحط، بیگار کیمپوں اور قتل عام کے خوفناک مناظر ہیں۔ مصنفین بتاتے ہیں کہ ہم نے جب اس پر کام شروع کیا تو روس میں اس موضوع پر بات کرنا ممنوع تھا۔ اب بھی اس کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں ہے۔

اگر اسٹالن کا اچھا رخ پیش کیا جائے تو وہ ایک اعلا درجے کا سیاست داں تھا، لیکن اس کا تاریک رخ اس کی زندگی پر چھایا ہوا ہے۔

۶ نومبر ۱۹۸۹ء --- موسکو - روس

مصنوعی نیند

میرے دماغ میں جو الارم ہے اس میں چار بجے کا وقت مستقلاً لگ گیا ہے۔ میں کہیں ہوں، کسی ملک میں ہوں صبح چار بجے آنکھ کھل جاتی ہے۔ پھر ایک بار جب آنکھ کھل جائے تو پھر دوبارہ وہ لگتی نہیں ہے اور میں مزاجاً وقت کا ایک لمحہ ضائع نہیں کرسکتا۔ اگر وہ آرام میں صرف نہیں ہو رہا ہے تو پھر اسے کسی نہ کسی اچھے مصرف میں لگنا چاہیے۔ میں ایسے لاتعداد لوگوں کو جانتا ہوں کہ جو نیند پوری کرنے کے بعد بھی بستروں پر پڑے اینڈتے رہتے ہیں مگر اٹھتے نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے کہ اس کی توفیق سے وہ سوسکے، آرام کرسکے۔ نیند کے دوران جسم میں تمام دن کی توڑ پھوڑ کی مرمت ہوگئی۔ اسی طرح بدقسمت لوگ وہ بھی ہیں کہ وقت کی دولت جن کو میسر ہے مگر وہ اسے ضائع کرتے رہتے ہیں اور خدمت و تعمیر میں وقت کو صرف نہیں کرتے۔ میں نے یقین کے ساتھ یہ جانا ہے کہ لوگ قدرتی نیند سوسکتے ہیں مگر وہ ضرورت کے بغیر خواب آور گولیاں کھاتے ہیں اور اپنی نیند کی مدت کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی صحت کے دشمن ہیں۔ خواب آور گولیوں سے لائی گئی نیند قدرتی نیند نہیں ہے، ہرگز نہیں ہے۔ ایسی مصنوعی نیند سے خلیات جسم کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت بدرجہ کامل ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مصنوعی نیند سوتے ہیں، خواب آور گولیاں کھاتے ہیں، وہ تن درست رہ ہی نہیں سکتے، اور نہ ان کی عمریں طویل ہوسکتی ہیں، اور نہ ان کے جسم کا نشوونما ہوسکتا ہے۔ میں نے اپنے طویل و عمیق مطالعے میں اس حقیقت کو پایا ہے کہ بے خوابی کا آغاز ہمیشہ عدم قناعت سے ہوتا ہے۔ جب قناعت کا دامن ہاتھ سے چھٹ جاتا ہے تو حالات زمانہ اس دامن کو تار تار کردیتے ہیں۔ انسان ایک روٹی پر جب قناعت نہ کرکے دو روٹیوں کی طرف لپکتا ہے تو اس کے لیے اسے کئی جتن کرنے پڑتے ہیں۔

اسے تگ و دو زیادہ کرنی ہوتی ہے۔ ایک کے بجائے دو روٹیوں کے لیے یا تو محنت شاقہ کرنی ہوتی ہے یا پھر کسی کا حق مارنا ہوتا ہے۔ یہ دونوں نقصان کی صورتیں ہیں۔ ایک کم دوسری زیادہ! انسان کے جسم کے لیے ایک روٹی کافی ہے کہ اس سے وہ زندہ و توانا رہ سکے۔ اسی جسم کے لیے جب دو روٹیاں فراہم کی جائیں تو ان سے لازماً جسم میں فساد پیدا ہوگا۔ نظام ہضم میں ابتری پیدا ہوگی اور پھر نظام ہضم کی ابتری سے دل و دماغ لازماً متاثر ہوں گے اور اس طرح یہ دو روٹیاں جسم انسانی کے لیے مضرتوں کا سامان کردیں گی۔ عدم قناعت نے فسادات جسمانی پیدا کردیے۔

ایک کے بجائے دو روٹیاں حاصل کرنے کے لیے اگر جسمانی محنت کی ہے اور عقل صرف کی ہے تو اس محنت و عقل کو کسی اچھے کام میں صرف کرنا چاہیے تھا تاکہ ذہنی سکون حاصل ہو اور ضمیر انسان مطمئن ہو۔ لیکن اگر یہ دو روٹیاں کسی کا حق مار کر حاصل ہوئی ہیں تو قناعت سے محرومی کے ساتھ ہی ساتھ انسان کے ضمیر کا اطمینان ضائع ہو جاتا ہے۔ انسان کی یہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ کسی کا حق مار کر اور کسی کو دکھ اور اذیت پہنچا کر خود مطمئن رہ سکتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ ہر انسان کا ضمیر ہوتا ہے اور ضمیر کی چبھن بھی ضرور رہتی ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ اس چبھن کا احساس کب ہوتا ہے۔ جس کا حق مارا ہے اس کا وجود ضمیر کے جگانے کے لیے ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ پھر کسی کا حق مار کر خود حق مارنے والا اس بدترین عمل کی یاد سے کبھی خالی نہیں رہ سکتا۔ وہ مسلسل عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اب اس کی جان کو دوگونہ عذاب ہے۔ ایک کے بجائے دو روٹیاں کھا کر وہ اپنے جسمانی نظام میں ابتری پیدا کرتا ہے۔ دوسرا عذاب احساس گناہ ہے جس سے ذہن و ضمیر کبھی خالی نہیں رہ سکتے۔

تو ایسے انسان ہیں کہ جو ضمیر کو سلانے کے لیے خواب آور گولیاں کھاتے ہیں۔ یہ ان کی جان کو تیسرا عذاب لگ جاتا ہے کہ خواب آور گولیوں سے نیند بھی مصنوعی ہوگئی اور جسم کی تعمیر کا عمل بھی رک گیا۔

اب اس ایک سے دو روٹی پر انسان اپنی زندگی کے ہر لمحے میں نگاہ کرکے دیکھ

لے۔ ایک کو جب بھی دو کرنے کی کوشش کی جائے گی حوادث پیش آکر رہیں گے، کیوں کہ ایسے انسان زندگی کے مقاصد سے محروم ہوتے ہیں!

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ

حضرت محترمؒ علیل ہوئے۔ ایسے سخت علیل کہ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ بالآخر مریدین نے ایک سادھو کا ذکر کیا کہ اس سے علاج کرا کے دیکھ لینا چاہیے۔ حضرت محترمؒ نے منع فرما دیا۔ علالت بڑھی۔ اس حد تک بڑھی کہ ایک روز بے ہوشی طاری ہوگئی۔ ارادت مندان حضرت سخت پریشان ہوئے اور اس عالم پریشانی میں ان کو پھر ہندو سادھو کا خیال آگیا اور جوش محبت و عقیدت میں مریدین نے سادھو سے رابطہ قائم کرلیا، اور حضرتؒ کے علاج کی درخواست کی۔

سادھو نے کلمات خیر ادا کیے۔ توجہ کی اور دعا کی۔ حضرتؒ کو ہوش آگیا۔ طبیعت اچھی ہوگئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سادھو کو دیکھا۔ ضرور اس کا شکریہ ادا کیا۔ مگر حیرانی طاری ہوئی کہ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ ہندو سادھو کا علاج کارگر ہوا۔ کیسے؟ حضرتؒ سادھو سے گویا ہوئے "اے انسان! تجھ میں یہ صفت کیسے پیدا ہوئی! بتاؤ تو اس کا راز کیا ہے؟"

سادھو نے احترام سے جواب دیا۔ "حضرتؒ میں نے بھی اللہ ہی کا نام لیا ہے۔ میں اللہ کو رام کہتا ہوں۔ رام سے آپ کی صحت کی دعا مانگی۔ شاید رام کو میری یہ ادا پسند ہو کہ میں نے اپنی ساری زندگی وہ چیز نہیں کھائی جس کو میرے دل نے مانگا! میں نے کبھی اپنے نفس کی تواضع نہیں کی۔ میرے نفس نے کھانے کو جو مانگا میں نے اسے اس سے محروم رکھا۔ شاید میری بات میں اثر اس لیے ہے کہ میں نے اپنے نفس پر قابو پا رکھا ہے!"

انسانیت برائے اولیت

میں صبح آج چار بجے اٹھ گیا۔ اچھا موقع ملا۔ چھ رکعتیں تہجد کی ادا کرلیں۔

میں اب ایسے روس میں ہوں کہ جہاں مذہب پر کوئی سرزنش نہیں ہے۔ عیسائی آزاد ہیں اور اب مسلمان اپنی نمازیں ادا کرسکتے ہیں۔ ایک سخت دور تھا کہ قرآن حکیم کا رکھنا قابل گرفت تھا' اس کی بر سرعام اور روس کی مساجد میں تلاوت ممنوع تھی۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب مسلمان قرآن کریم کو چھپاتے نہیں ہیں۔ حکومت روس خود قرآن حکیم کو چھاپ کر فراہم کر رہی ہے اور اس نے رابطہ عالم اسلامی کو تقسیم قرآن حکیم کی اجازت دیدی ہے۔ اب یہ بات رابطہ کے لیے قابل غور و فکر ہے کہ کیا فقط قرآن حکیم تقسیم کر دینے سے تبلیغ کا حق ادا ہوجائے گا؟ کیا اس سے فرض پورا ہو جاتا ہے؟ میری رائے ہے کہ پورے عالم اسلام کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ آج کے حالات کا گہرا مطالعہ کرے۔ روس کے فکر و نظر میں جو تبدیلی آئی ہے اور "سوپر مزاج" کی جگہ مزاج کا جو اعتدال یہاں محسوس ہو رہا ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔ ان اسباب کو پہلے صدر روس جناب گورباچوف کی شخصیت میں تلاش کرنا چاہیے اور پھر اس سے بڑھ کر حالات اور واقعات کا مطالعہ کرنا چاہیے' اور گہرائیوں میں جاکر اس وقت کو صحت اور فہم کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ میری پہلی رائے یہ ہے کہ عالم اسلام کو من حیث المجموع روس سے اپنے تعلقات استوار کرنے چاہئیں۔ یہ صحیح ہے کہ روس کا دین اشتراکیت ہے۔ مگر کیا اسلام میں اشتراکیت موجود نہیں ہے؟ فرق صرف اس قدر ہے کہ روس کی اشتراکیت اللہ وحدہ لاشریک کے بغیر ہے اور اسلام کی اشتراکیت اللہ سبحانہ تعالیٰ کی تعلیمات میں ہے۔ روس اللہ کے وجود کا قائل نہیں مگر اس کے باوجود لینن اس کے قائد ہیں۔ گو جناب لینن گزر چکے ہیں مگر روس نے ان کے جسم کو مٹی میں نہیں ملنے دیا ہے۔ ان کا جسد خاکی محفوظ ہے اور مرجع خلائق ہے۔ روس بہرحال ایک قیادت کو تسلیم کرتا ہے۔ کسی کو رہنما مانتا ہے۔ حق یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں کسی کو تو خدا بنانا ہی ہوتا ہے۔ میں اس مسئلے پر بار بار غور کرتا ہوں کہ اشتراکیت ہو یا اسلامیت' عیسائیت ہو یا رہبانیت' دنیا کا کوئی دین ہو یا مذہب' ہر ایمان اور ہر ایقان نے انسان کو اہمیت دی ہے۔ انسان کو انسان تسلیم کیا ہے۔ اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات کہا ہے۔ دوسرے ادیان و مذاہب بھر

صورت انسان کو عظمت دیتے ہیں اور انسان کی رفعتوں کا سامان کرتے ہیں۔ جب اس کرہ ارض کا ہر دین اور ہر مذہب انسان کو اشرف اور افضل تسلیم کرتا ہے تو پھر اس کرۂ ارض کو انسانیات کو اولیت دینے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

اگر روس میں فکر انسان عظمت انسان ہے -- اور میری رائے میں ہے تو پھر کم از کم عالم اسلام کو اپنے فکر و نظر کا برملا اظہار روس میں کرنا چاہیے اور یہاں سے تحریک انسانیت کو عالمی درجہ و مرتبہ دینا چاہیے!

روس میں احترام انسان

جہاں تک موسکو کا تعلق رہا ہے یہاں قدم قدم پر انسان عظیم کا احترام موجود ہے۔ یہاں معماران روس کے احترام سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ شاعر ہو یا ادیب' مصنف ہو یا مؤلف' موسیقار ہو کہ مصور' معلم ہو کہ ماہر تعلیم' مفکر ہو کہ فلسفی' غرض ہر شعبہ حیات میں اکابر رجال کا نام کسی نہ کسی انداز سے زندہ رکھا گیا ہے۔ مقامات و عمارات' درس گاہیں اور تحقیق گاہیں حتیٰ کہ سڑکیں اور بازار تک معماران روس کے نام پر قائم ہیں۔ پورا موسکو ایک کتاب تاریخ ہے جس کے ہر ورق پر ہر نگاہ صبح و شام رہتی ہے۔ ایک آزاد قوم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تاریخ کو کبھی فراموش نہیں کرتی۔ تاریخ کو ہر انداز سے احاطہ تحریر میں لاتی ہے اور آزاد قوم تاریخ کی سچائی کو مسخ نہیں کرتی ہے۔ اس لیے اس کی تعمیری جدوجہد کامرانیوں سے عبارت رہتی ہے۔ روس میں ایک توازن یہ ہے کہ وہ کسی ایک کا پجاری نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے بس ایک شاعر ہی کو اپنا موضوع سخن اور موضوع حیات بنا رکھا ہو' یہاں ہر شاعر واجب الاحترام ہے اور اس کی یادگار کسی نہ کسی اعتبار سے موجود ہے۔ میرا مطالعہ اس میں زیادہ گہرا نہیں ہے' مگر میری رائے ہے کہ روس میں نظریات یا قومیت کی بنیادوں پر شخصیات پر تعصبات کی مہریں لگانے کا رواج و انداز نہیں ہے۔ گو ایسی مثالیں موجود ہیں کہ روس سے اہل فکر و قلم روس بدر ہوئے ہیں مگر ان کی شہرتوں میں سیاستوں کا دخل زیادہ رہا ہے۔ میل کا

بیل بنانے اور روس کے برخلاف محاذ جنگ کو تقویت دینے کے لیے وہاں کے معمولی واقعے کو غیر معمولی بنایا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی روس کا مزاج اپنی تاریخ کے تسلسل کی حفاظت کرتا ہے اور تاریخ شخصیات کی جد و جہد ہی کا دوسرا نام ہے۔ شخصیات کی جد و جہد کو مسخ کرکے تاریخ کو قرار حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ تاریخ نہیں ہوسکتی، صدق نہیں، کذب ہوگا۔

میں جب اپنے فکر و خیال کو پاکستان کے بیالیس سال کی طرف لے جاتا ہوں تو مجھے سب سے پہلے یہ درد ناک اور ہولناک تصویر دکھائی دیتی ہے کہ پاکستان کے بیالیس سال کردار کشی اور شخصیات کشی سے عبارت ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی فکر پاکستان کو عصبیت نے ڈس لیا ہے اور تعصبات نے پاکستان اور اہل پاکستان کو بے وقار کردیا ہے۔ اس کی بے وقاری کا حال یہ ہے کہ اس ریاست اسلامی کو نہ تو اس کی توفیق ہوئی ہے کہ وہ تحریک پاکستان کی تاریخ کو منضبط کرلے اور نہ اس کی قسمت میں یہ رقم ہوا ہے کہ یہ ریاست اپنی تاریخ رقم کرلے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ اوف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، اسلام آباد

اس انسٹی ٹیوٹ میں کئی سال ہوئے ایک اعلا مرتبہ مجلس مشاورت انعقاد پذیر ہوئی۔ اس میں پاکستان کے مورخین نے حصہ لیا۔ میں بھی بہ حیثیت رکن پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اس مجلس مشاورت میں شریک تھا۔ غور و خوض کے بعد طے پایا کہ تحریک پاکستان سے لے کر اب تک تاریخ پاکستان کم از کم دس بارہ جلدوں میں مرتب کی جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ اس کام کو تاخیر کے بغیر کیا جائے اور جو مورخین بقید حیات ہیں ان سے استفادۂ کامل کیا جائے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت دانش مندانہ فیصلہ تھا، یہ پاکستان کے مورخین کا فیصلہ تھا جو دیانت دار تھے اور صداقت شعار۔ اس مجلس کی پوری روداد موجود ہے۔ میں اس کا سربراہ بنایا گیا تھا، کیوں کہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی سربراہی میرا مقدر تھی اور پاکستان میں سب سے زیادہ فعال یہی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ہے جس کے پر بیوروکریسی نے رفتہ رفتہ قینچ کردیے ہیں۔

بارے یہ تجویز حکومت پاکستان کی خدمت میں پیش ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت کے صدر مملکت نے بھی اسے دیکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وزارت تعلیم کے سکرٹری صاحب نے اس پوری تجویز کو مسترد کردیا اور تاریخ پاکستان رقم کرنے کے لیے منتخب کمیٹی کو توڑ دینے کا حکم دیا اور پھر انسٹی ٹیوٹ کے ہر فیصلے کو نظرانداز کرکے ایک تین چار رکنی کمیٹی نامزد کی جس کی کوئی میٹنگ گزشتہ ۱۷۔۱۸ سال میں آج تک نہیں ہوئی.

اگر آپ اس سارے کام کو دیکھیں تو فقط اسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ہم خود اپنے دشمن ہیں۔ ہم تعصبات کی گرفت میں ہیں، ہم جہل مرکب ہیں۔ ہم پاکستان دوست نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کیا ہیں؟

تاریخی مقامات میں حاضری

آج ہمارے ساتھ محترمہ ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا ہیں۔ ہم چالیس فیٹ لمبی شاہی موٹر کار میں روانہ ہوئے۔ یہ موٹر کار ساختہ روس ہے۔ مگر شاید روس سے باہر نہیں جاتی اور فقط سرکاری مہمان (اسٹیٹ گیسٹس) کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نام ہے اس کا چائیکا (Chaika) ترجمہ اس کا ہے بحری بگلا (Sea Gull)۔

جن جن سڑکوں سے گزرے ان کے نام روس کی ان شخصیات پر ہیں جنھوں نے دفاع روس میں جنگیں لڑی ہیں اور کامرانیاں حاصل کی ہیں۔ یہاں ایسے جرنیل بھی ہیں کہ جن کو ایسے فیصلے کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ اپنی جان بچائیں اور روس کو خطرے میں ڈال دیں یا اپنی قربانی دے کر روس کو آزادی سے سرخ رو رکھیں تو انھوں نے اپنی جان دیدی۔ ان میں سپہ سالار کوتوزوف کا نام سرفہرست ہے۔ آج ہم جب کوتوزوف کی پروسپکٹ (ایوے نیو) سے گزرے تو محترمہ ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا خوشی سے بے قرار ہوگئیں۔ وہ بے اختیار سپہ سالار کوتوزوف کے حالات ہمیں بتانے لگیں جنہیں ہم نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔

کوتوزوف

فیلڈ مارشل میخائل ایلاریونووچ کوتوزوف (۱۷۴۵ - ۱۸۱۳ء) روس کا وہ شہرہ

آفاق جرنیل ہے جس نے روس - پولینڈ جنگ (۱۷۶۴ - ۱۷۶۹ء) اور روس - ترکی جنگ (۱۷۸۹ - ۱۷۹۱ء) میں اپنی جنگی تدابیر اور مہارت کا سکہ منوایا - انھیں سمولنسک کے شہزادے کا لقب دیا گیا ہے - ان کا عظیم کارنامہ نپولین کو موسکو سے پسپا ہونے پر مجبور کرنا تھا - اور پھر پسپائی کے دوران فرانسیسی فوج کو قدم قدم پر ایسی زک پہنچائی کہ نپولین کی چڑھائی زبردست شکست میں تبدیل ہو گئی - کوتوزوف کو بورو دینو کی جنگ کے بعد فیلڈ مارشل بنا دیا گیا تھا -

اہل روس کے دلوں میں اس جرنیل کے لیے بڑی عقیدت ہے - زار وقت نے انھیں بڑے بڑے انعامات اور مناصب عطا کیے تھے - تاریخ روس میں کوتوزوف پامردی اور استقلال کی علامت بن گئے -

بورودینو پانوراما

آج میں یہاں تیسری بار آیا ہوں - دو بار پہلے بھی معرکہ جنگ و جدل کی اس مصور داستان کو حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھ چکا ہوں - آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے اس روزنامچے کے قارئین کو اس کے بارے میں اختصار کے ساتھ بتاؤں کہ ایک آزاد قوم اپنی تاریخ کو کس انداز سے محفوظ رکھتی ہے اور اپنی تاریخ کو افراد ملت تک کس شان کے ساتھ پہنچا کر اسے تعمیر مستقبل کے لیے آمادہ و تیار کرتی ہے - اگر سعدیہ بیٹی میرے ساتھ نہ ہوتیں تو آج میں یہاں نہ آتا - اب آ گیا ہوں تو پھر اپنے دوستوں کو اس کی داستان کیوں نہ سناؤں !

۱۸۱۲ء میں جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تو وہ بحیرہ بالٹک کے شہر کو ننگس برگ سے کوناس ' ولنا ' ویتبسک اور سمولنسک کو فتح کرتا ہوا موسکو کے ۷۰ میل کے فاصلے پر ۲۶ اگست ۱۸۱۲ء بورودینو آ پہنچا -

یہاں نپولین اور روس کے جرنیل کوتوزوف کی فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی - کوتوزوف کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج میں سے پینتیس ہزار آدمی مارے گئے اور نپولین کی ایک لاکھ پینتیس ہزار فوج میں سے تیس ہزار آدمی مارے گئے جن میں انچاس

جرنیل تھے - مخالفین نے اپنے طور پر دعوا کیا کہ انھوں نے یہ جنگ جیتی - حقیقت یہ ہے کہ روس کا نقصان ضرور ہوا ' لیکن اس کا عزم ناقابل شکست تھا -

روس کے جرنیل کوتوزوف نے اپنی تدابیر جنگ میں تبدیلی کی اور بجائے میدان میں معرکہ لڑنے کے وہ شہروں کو خالی کروا دیتے اور رسد کو فرانسیسی فوج تک نہیں پہنچنے دیتے تھے - چنانچہ بعد میں نپولین کی پسپائی اور زبردست نقصانات سے مورخین بورودینو کو روس کی فتح قرار دیتے ہیں -

بورودینو میں اس جنگ کی تمام تفصیل کا ایک نہایت دلچسپ منظر نامہ بنا ہوا ہے - یہاں نوادر کے طور پر وہ فوجی سامان بھی محفوظ ہے جو اس جنگ میں استعمال ہوا - فوجیوں کے پتلے بر سر پیکار ہیں اور کہیں کہیں مصوری کے ذریعہ سے جنگ کی عکاسی کی گئی ہے -

پشکن آرٹس میوزیم

یہ نہایت دلچسپ جگہ ہے - میں آج یہاں دوبارہ آیا ہوں - اس میوزیم میں مجھے دلچسپی اس لیے ہے کہ یہ ایک فرد واحد کی فکر کا نتیجہ ہے - تعلیم گاہ کے ایک استاد محترم ناک تسویتف نے اس کا تصور قائم کیا اور پھر اس کی تفصیلات پر مشتمل ایک منصوبہ تیار کیا - اس فرد واحد نے سوچ کر اسے پشکن آرٹس میوزیم کی صورت دے دی - پشکن روس کے ایک بڑے شاعر ہیں - ان کی عظمت کے اعتراف میں اس نہایت عظیم الشان میوزیم کو معنون کیا گیا ہے -

الیگزاندر پشکن (۱۷۹۹ - ۱۸۳۷ء) جدید روسی ادب کی سب سے بلند قامت شخصیت ہیں - وہ ایک عظیم شاعر تھے - انھوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ حراست اور جلا وطنی میں گزارا تھا - ان کا کلام سیاست ' مزاح ' تغزل ' رزمیہ اور شعری داستانوں جیسی مختلف اصناف پر مشتمل ہے -

۱۷۵۰ء کے عشرے میں روس میں فائن آرٹس کا ایک میوزیم قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا - ۱۸۹۸ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا - عمارت کی تکمیل کے بعد ۱۹۱۲ء میں

اس کا افتتاح ہوا پھر تین عشروں تک آرٹ کے نوادر جمع کیے جاتے رہے ۔ ۱۹۳۷ء میں اس کا نام **پشکن** میوزیم اوف آرٹس رکھا گیا ۔

جنگ عالم گیر دوم میں کوئی ایک لاکھ نوادر جن میں **پینٹنگیں** ' مجسمے ' **ڈرائنگیں** 'کندہ کاریاں اور نادر کتابیں شامل تھیں ' بمباری کی تباہی سے بچانے کے لیے سائیبریا کو منتقل کردی گئیں تھیں ۔ جنگ کے بعد **پشکن** میوزیم میں لائی گئیں ۔

اس میں ۱۴ ویں صدی عیسوی سے لے کر ۲۰ ویں صدی کے نام ور **آرٹسٹوں** کی **پینٹنگیں** اور دیگر تخلیقات عہد بہ عہد رکھی گئی ہیں ۔ عیسائی بزرگوں سے متعلق تقریباً تمام شہرہ آفاق **پینٹنگیں** یہاں موجود ہیں ۔

ایک عسکری طالب علم

پشکن عجائب گھر میں میرے اپنے سفید لباس نے ایک طالب علم کو مجھ سے قریب کردیا ۔ اس نے سوال کیا کہ آپ کہاں کے ہیں ؟ پاکستان سے آیا ہوں ! یہ جواب سن کر اب اردو میں باتیں شروع ہوگئیں ۔ یہ طالب علم اچھی اردو جانتا ہے ۔ میں نے کہا کہ میرے ساتھ ایک روسی محترمہ ہیں ۔ خوب اردو بولتی ہیں ۔ میں نے طالب علم کی ملاقات ڈاکٹر لدمیلا سے کرادی ۔

اربات

ہمارا مہمان خانہ سرکاری قدیم موسکو میں ہے ۔ بڑی قدیم عمارات میں یہ ایک نئی عمارت ہے جس پر باہر سے قدامت کی چھاپ ہے مگر اندر اس میں جدت ہی جدت ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اب حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قدیم موسکو کو حتی الامکان محفوظ رکھا جائے ۔ یہاں قدیم عمارات کو مسمار نہ کیا جائے بلکہ ان کی مرمتیں کر کے ان کو محفوظ رکھا جائے ۔ تاریخ کے حفظ کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے ۔ اسی قدیم موسکو میں ان سات عظیم عمارات میں سے ایک عمارت ہے جس کی تعمیر میں جنگ کے قیدیوں کا خون پسینہ ایک ہوا ہے ۔ موسکو میں ممتاز عمارات یہ ہیں ۔ ایک میں پوری

موسکو یونی ورسٹی سمائی ہوئی ہے اور ایک میں وزارت خارجہ روس ہے جو قدیم موسکو میں ہے اور سرکاری مہمان خانے کے سامنے ہے۔ یہاں ہی ایک قدیم بازار "اربات" ہے جہاں اب ٹریفک ممنوع کردی گئی ہے۔ اس بازار کو از سر نو قدامت دی گئی ہے۔ اس سڑک کو بھی قدیم حسن دیا گیا ہے۔ اب اربات موسکو کی ایک سیرگاہ ہے۔ یہاں ہزار ہا آدمی ہر وقت موجود رہتے ہیں ۔ دلچسپی کے بڑے سامان ہیں ۔ آرٹسٹ بھی یہاں متعدد ہیں جو اپنی تخلیقات برائے فروخت پیش کرتے ہیں ۔ ایسے مصور بھی ہیں جو سیلانیوں کی تصویریں منٹوں میں بنا کر ان کے حوالے کردیتے ہیں ۔ ایک آرٹسٹ ایسا بھی دیکھا کہ جو کارٹون بنانے میں ماہر ہے ۔ آپ اس کے سامنے کھڑے ہوجایئے وہ آپ کا چہرہ مہرہ سامنے رکھ کر آپ کی شکل و صورت کو مزاحیہ انداز میں بنا دے گا ۔ ایک خاتون اپنا کارٹون بنوا رہی تھیں ۔ ہم بھی کھڑے ہوگئے ۔ مصور نے ان کی شکل کھینچ کر بس دانت ذرا بڑے کردیے ۔ وہ کارٹون بن گئیں !

ایک جگہ جانوروں وغیرہ کے مجسمے رکھے ہیں۔ کارٹون انداز کے مجسمے بھی دیکھے۔ بچے آتے ہیں ان پر سوار ہوتے ہیں ۔ فوٹوگرافر ان کی پولا رائڈ کیمرے سے فوٹو کھینچ کر ان کے حوالے کردیتا ہے ۔ غرض اس بازار میں دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہیں۔ اس بازار میں تقریر کی بھی آزادی ہے ۔ یہ ہائڈ پارک تو نہیں ہے ' مگر تقریریں یہاں بے حساب کی جاسکتی ہیں ۔ یہاں نوجوان بھی آزاد ہیں ۔ وہ گانے گاتے ہیں ۔ رقص و سرود کا بازار بھی گرم ہوجاتا ہے ۔ اربات میں متعدد ریستوراں بھی ہیں اور بہت سی دکانیں بھی ہیں جہاں سوویئیر وغیرہ بھی مل جاتے ہیں ۔ گرانی خوب ہے۔ میں نے ایک قراقلی ٹوپی کی قیمت پوچھی ' کوئی تین سو روبل قیمت بتائی گئی ۔ اس کے ہزاروں روپے بنے ۔ اربات ہی میں روس کے مشہور شاعر **پشکن** کا مکان بھی ہے جسے حکومت نے یادگار کے طور پر محفوظ کیا ہے ۔ دیوار پر سنگ سفید میں نام کندہ ہے ۔

عشائیہ جناب محترم سفیر پاکستان

میں نے ۴ نومبر کو مہمان خانے آکر سب سے پہلا کام پاکستان کے سفیر کبیر

جناب عبدالستار صاحب سے رابطہ قائم کیا تھا اور ان کی اور محترمہ بیگم انور ستار صاحبہ کی مزاج پرسی کی تھی ۔ الحمد للہ دونوں اچھے ہیں ۔ میں نے کراچی سے ان کی خدمت میں ایک ٹیلیکس بھجوا دیا تھا کہ میں روس آرہا ہوں ۔ جواب میں انھوں نے خوش آمدید فرمایا تھا اور لکھا تھا کہ ان کو روسی ذرائع سے اطلاع یہ ملی ہے کہ آپ اور آپ کی دختر نیک اختر روس آرہے ہیں ۔ نیز اطلاع تھی کہ انھوں نے ۶ نومبر کو میرے لیے عشائیہ کا اہتمام کر رکھا ہے ۔ اس ٹیلیکس سے مجھے بڑا اطمینان حاصل ہوا تھا ۔ آج جناب سفیر پاکستان کے ہاں رات کا کھانا ہے ۔ انھوں نے میرے اور سعدیہ کے علاوہ روس پاکستان انجمن دوستی کے ارکان ' نیز میرے دوسرے روسی احباب نیز وزارت خارجہ روس کے پاکستان ڈیسک کے نگران صاحب کو بھی مدعو فرمایا تھا ۔

ہم آٹھ بجے چانسری پہنچ گئے ۔ مجھے یہ جگہ معلوم تھی ۔ شوفر صاحب کو میں نے ہی بتایا کہ ہمیں اب یہاں اترنا ہے ۔ میں یہاں بارہا آیا ہوں بلکہ یہاں رہا بھی ہوں یہ جناب سجاد حیدر صاحب کا زمانہ تھا جب ان کے ارشاد پر میں لندن سے موسکو آگیا تھا اور عید الفطر یہاں ہی منائی تھی ! سال گزشتہ بھی جب یہاں جناب شاہد امین صاب سفیر تھے کھانے پر آیا تھا ۔ جناب شاہد امین صاحب اب فرانس میں پاکستان کے سفیر ہیں ۔ نہ معلوم یہ نفیس حضرات اب کب تک سفارت کے مراتب پر فائز رہیں گے ۔ اسلام آباد کا مزاج اب بہت بدلا ہوا ہے ۔ نئی حکومت نئے سفیروں کا تقرر بھی تیزی سے کر رہی ہے ۔ اسے پارٹی کے ارکان عزیز از جان ہیں ۔ ہر کلیدی عہدہ پارٹی کے کسی رکن کو ملنا چاہیے ۔ فکر کا یہ انداز فطری ہے ۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت ! یہ نئی حکومت کا حق ہے کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق تبدیلیاں لائے ۔ مگر ایسا جب ہی ہوتا ہے کہ جب حکومت قرار یافتہ ہو ۔ لیکن جب صورت حال بے قراری کی ہو ' استحکام حاصل نہ ہو ' ہر لحہ زلزلے کا خطرہ و امکان ہو تو زبردست تبدیلیاں مفید نہیں ہوسکتیں ۔ ابھی ہفتہ بھر ہی تو ہوا ہے کہ حکومت پاکستان کو ایک زبردست جھٹکا لگ چکا ہے جس سے وہ بال بال بچ چکی ہے ۔ حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی ایک تحریک بڑے اعتماد کے ساتھ پارلیمان میں پیش ہوکر مسترد ہوئی ہے ۔ مگر دوسری عدم اعتماد کی

تحریک تیار ہے ۔ ایک تحریک پر کئی کروڑ رپے صرف ہوئے ہیں ۔ اور اگر حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں کے اخراجات کا اندازہ لگایا جائے تو بات ارب رپے تک گئی ہے ۔ یہ اخراجات رائے کی خرید و فروخت کے ہیں ۔ ارکان پارلیمان کو ہم رائے بنانے کے لیے ان کی قیمت نقد بھی ادا کی جاتی ہے اور ہم رائے بنانے کی کئی اور قیمتیں ادا کرنی ہوتی ہیں ۔ مثلاً وزیر بنانا ' سفیر بنانا ' زمینیں عطا کرنا ' صنعتوں کے اجازت نامے دینا ' گناہوں کی معافیاں ' بنکوں سے مراعات دینا وغیرہ ۔ میں جب ارب رپے کی بات کر رہا ہوں تو نقد اور غیر نقد دونوں ملا کر اخراجات ہوئے ہیں ۔ حکومت کو زبردست جھٹکا لگا ہے ۔ اس نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے ۔ اب اگر ایک اور تحریک عدم اعتماد پیش ہوگئی تو ایک بار پھر اسی قدر اخراجات ہوکر رہیں گے ۔ صورت حال یہ ہے کہ پارلیمان میں کسی ایک پارٹی کو بھی اکثریت تامہ حاصل نہیں ہے ۔ ہر پارٹی دوسری پارٹی کا تعاون حاصل کرنے کے لیے مجبور ہے ۔ تحریک عدم اعتماد ہر وقت پیش کی جاسکتی ہے ۔ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری چوتھی ' کیوں کہ پاکستان کا دستور متعدد تحریک ہائے عدم اعتماد پیش کرنے میں مانع نہیں ہے ۔ اگر یہ صورت حال رہی ' اور ضرور رہے گی ' تو پھر ارکان پارلیمان کروڑ پتی بن کر نکلیں گے ۔ وہ ایسے بھی نیک نام نہیں ہیں ۔ جو نیک نام ہیں شاید اس لیے ہیں کہ ان کو مواقع حاصل نہیں ہیں ۔ تحریک عدم اعتماد نادر موقع آیا ہے کہ جو محروم رہتے ہیں وہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں ۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ میں کہہ رہا تھا کہ جب حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہے تو اسے کلیدی تبدیلیاں لانے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے ۔ کیوں کہ کل آنے والی حکومت پھر تبدیلیاں لاکر رہے گی ۔ اس سے ملک و ملت دونوں کو نقصانات ہوں گے ۔

جناب سفیر پاکستان نے ہمارا پر جوش استقبال کیا ۔ ان کے ذاتی اوصاف بکثرت ہیں ۔ وہ زیرک انسان ہیں ۔ ہندستان میں جب جناب عبد الستار صاحب سفیر کبیر تھے تو انھوں نے وہاں غیر معمولی اہمیت کے کام کیے تھے ۔ وہاں انھوں نے بکثرت دوست

بنائے ۔ ان میں میرے بڑے بھائی جناب حکیم عبد الحمید صاحب بھی ہیں ۔ وہ ان کے معالج رہے ہیں اور محترمہ بیگم صاحبہ کے بھی معالج ۔ محترمہ بیگم ستار نہایت دینی مزاج کی خاتون ہیں ۔ تہجد گزار ' پابند نماز و شرع ۔ اب جناب ستار صاحب کے لیے روس نیا میدان عمل ہے ۔ یہ میدان سخت ہے اور دشوار گزار ۔ اللہ تعالیٰ ان کو کام یاب رکھیں ۔

میرے ساتھ یہاں میرے دو معاون بھی مدعو ہیں ۔ یعنی ڈاکٹر لدمیلا اور جناب جنیدی پیترو وچ ۔ ایک میری اردو مترجمہ ہیں ۔ دوسرے میرے پروگراموں کے مرتب کرنے والے ہیں ۔ ان کی اہلیہ بھی مدعو ہیں ۔ ڈاکٹر الیگزنڈر کرمیشوف ایم ۔ ڈی ۔ بھی مدعو ہیں ۔ یہ روس کی بڑی مشہور سکلی فوسوفسکی سائنٹفک اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار ایمرجنسی مڈیسن کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں ۔ یہ اسی سال کے شروع میں پاکستان آچکے ہیں اور ۲۱ ڈاکٹروں ' سرجنوں کے ایک وفد کے قائد رہے ہیں ۔ کراچی میں یہ میرے مہمان تھے ۔ میں نے لاہور اور نئی دہلی میں بھی ان کے لیے سہولتوں کا اہتمام کیا تھا ۔ ان کے رائے یہ تھی اور آج بھی انھوں نے اس کا اظہار کیا کہ پاکستان میں ان کا استقبال نہایت اچھا تھا ۔ دل نواز تھا ' پرجوش تھا ۔

عشائیہ میں جناب الیکسی ایس ۔ دیکوف (Alexy S. Deykov) بھی شریک ہوئے ۔ روس میں دوستی کی جتنی انجمنیں ہیں ان کی ایک یونین ہے ۔ اس یونین میں دیکوف صاحب ساؤتھ ایشیا شعبے کے صدر ہیں ۔ پاکستان کا بھی شمار ساؤتھ ایشیا میں ہے ۔ حالانکہ خود ہم نے اپنے کو مڈل ایسٹ میں شمار کرایا ہوا ہے ۔ مگر روس میں ہمارا مقام ساؤتھ ایشیا میں ہے ۔ جناب ڈاکٹر پلی شوف (Dr. Pleshov) اور ان کی اہلیہ بھی مدعو ہیں ۔ یہ انسٹی ٹیوٹ اوف اورینٹل اسٹڈیز میں ہیں ۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ' یو ایس ۔ ایس ۔ آر اکیڈمی اوف سائنسز میں شامل ہے ۔ ڈاکٹر پلی شوف پاکستان میں رہ چکے ہیں ۔ سفارت خانہ روس میں پانچ سال کام کرچکے ہیں ۔ عشائیہ میں شریک ایک اہم شخصیت جناب وی ۔ پیروف کی ہے ۔ یہ روس کی وزارت خارجہ میں ساؤتھ ایشیا کے ماہر ہیں اور پاکستان ڈیسک گزشتہ ۲۵ سال سے ان کے پاس ہے ۔

تقریر جناب سفیر

یہ عشائیہ ایک اعتبار سے رسمی و احترامی ہوگیا ۔ جناب سفیر پاکستان نے دوران اکل و شرب ایک مختصر تقریر کی ۔ اس انداز کی تقریر رسمی و احترامی عشائیے پر ہی ہوتی ہے ۔ سفیر محترم کی تقریر کے چند نکات یہ ہیں :

* جناب حکیم محمد سعید صاحب کا دلی شکریہ کہ وہ آج اس عشائیے میں اپنی بیٹی کے ساتھ شریک ہوئے ۔
* جناب حکیم محمد سعید صاحب پاکستان کی اہم شخصیت ہیں اور طب و صحت اور علم و حکمت کے میدانوں میں فلاح و صلاح کے جذبات کے ساتھ معروف خدمت ہیں ۔ ان کی تگ و تاز پاکستان تک محدود نہیں ہیں ۔ حکیم صاحب پاکستان سے باہر بھی شہرت رکھتے ہیں ۔
* جناب حکیم صاحب کا دورۂ روس یقیناً خیر سگالی کا دورہ ہے اور روس و پاکستان کے مابین بہترین تعلقات کے قیام کی ایک پرخلوص جدوجہد ہے ۔ پاکستان روس سے بہترین تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے ۔
* آج کے عشائیے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ باوجود یہ کہ ان دنوں بوجہ جشن اکتوبر روس میں عام تعطیلات ہیں اور دوران تعطیلات عشائیوں میں شرکت محدود ہوتی ہے ' مگر آج کے عشائیے میں اہم شخصیات روس شریک ہیں ۔ یہ غیر معمولی شرکت سفارت پاکستان کے لیے قابل لحاظ ہے اور کہنا چاہیے کہ حکیم صاحب کی شخصیت کا اعتراف بھی ہے ۔
* میں ایک بار پھر اپنی اور اپنی اہلیہ کی طرف سے جناب حکیم صاحب اور تمام شرکائے عشائیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

جوابی تقریر کے نکات !

* عالی مرتبت جناب سفیر صاحب ! میں اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ کا اور محترمہ بیگم ستار صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے آج مجھے بڑی عزت دی ہے اور بڑا

احترام دیا ہے۔

* افراد پاکستان مزاجاً مہمان نواز ہوتے ہیں اور مہمانوں کا احترام و اکرام ان کی سرشت ہوتی ہے۔ اس سرشت و مزاج کا آج بہترین مظاہرہ ہوا ہے۔

* میرا یہ دورۂ روس دوستوں سے ملاقات کا عنوان ہے۔ میں یہاں روس میں ان سے ملنے آیا ہوں۔ میں پاکستان میں ان کو تلاش کرتا ہوں۔ یہ وہاں نہیں آتے تو میں خود ان کو لینے یہاں آگیا ہوں۔

* پاکستان دنیا کے ہر ملک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ روس ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ روس سے دوستی ہمارا مزاج ہے۔ ہم اچھے اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے آرزو مند ہیں۔

* کراچی میں ایک شہر علم و حکمت -- مدینتہ الحکمتہ آباد ہو رہا ہے۔ اس میں علمی و تحقیقی ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو صبح عالی مرتبت صدر گرامی قدر پاکستان اس شہر میں بیت الحکمتہ کا افتتاح فرمائیں گے۔ میں اس افتتاح میں شرکت کے لیے موسکو یونیورسٹی کے چانسلر صاحب اور تاشقند یونیورسٹی کے چانسلر صاحب کو دعوت دوں گا۔ میری بہ حیثیت چانسلر ہمدرد یونیورسٹی یہ خواہش ہے کہ ہمدرد یونیورسٹی اور موسکو و تاشقند یونیورسٹی کے مابین علمی تعلقات قائم ہوں۔

* حکومت روس نے مجھے دورۂ روس کی دعوت دے کر مجھ پر کرم فرمایا ہے۔ پھر یہاں میرے لیے بہترین انتظامات ہوئے ہیں۔ میں تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اپنی طرف سے اور اپنی بیٹی کی طرف سے۔

ہماری تقریریں اردو زبان میں ہوئیں۔ میرے ساتھ ڈاکٹر لدمیلا شریک طعام تھیں۔ وہ مترجم کی حیثیت سے میرے ساتھ ہیں۔ انھوں نے ہماری تقریروں کے روسی زبان میں ترجمے کیے۔

تبادل خیال

وزارت خارجہ روس کے جناب محترم وی پیروف سے بعد عشائیہ تبادل خیال

ہوا۔ انھوں نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ With respect کے الفاظ لکھ کر دیا۔ ساؤتھ ایشیا کے ان ماہر کے لیے بھی میرے قلب و ذہن میں احترام پیدا ہوا۔ ہم دونوں نے روس پاکستان دوستی کو معنویت دینے پر زور دیا۔ میں نے کہا کہ روس میں اور پاکستان میں دونوں جگہ باہم دوستی کی انجمنیں ہیں، مگر ان کی حیثیت رسمی ہے اور نمائشی، میں ان کو اصلیت اور معنویت دینے کے حق میں ہوں۔ جناب پیروف صاحب نے افغانستان کے بارے میں بات کی۔ ان کے حاشیہ خیال میں یہ تھا کہ میں پاکستان کی سیاست میں دخل انداز ہوں۔ میں اولاً اس کی وضاحت کردوں کہ میں پاکستان کی سیاست میں نہ کل دخیل تھا اور نہ آج ہوں۔ مگر میں ایک محب وطن ہوں اس لیے حالات پر میری نگاہ ہے اور میں واضح اور بین طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ افغانستان میں جو حالات گزشتہ آٹھ نو سال سے جاری ہیں ان سے پاکستان پورے تسلسل کے ساتھ متاثر ہو رہا ہے۔ پاکستان کو مسلسل نقصانات کا سامنا ہے اور کل اس حقیقت کا احساس و اعتراف ہوگا کہ ان حالات نے پاکستان کو معاشی اور معاشرتی طور پر نقصانات پہنچائے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے زیادہ مجھے ایک انسان کی حیثیت سے حالات افغانستان پر شدید دکھ ہے۔ وہاں جان انساں جس قدر ارزاں ہوئی ہے اسے محسوس کرنا چاہیے۔ افغانستان سے نکل کر افغانی پاکستان میں پناہ گزیں ہوئے ہیں، ان کے دکھ درد کو انسان کی حیثیت سے محسوس کرنا چاہیے اور اہل پاکستان ان حالات کی وجہ سے جن شدائد میں گرفتار ہیں ان کا ادراک اور احساس کرنا انسانی فریضہ ہے۔ خود روس کو اس کی توقع کے خلاف افغانستان میں جن شدائد سے مسلسل واسطہ رہا ہے اس کے سیاسی، معاشی اور اقتصادی پہلوؤں کو اگر نظر انداز کرنے کی غلطی کی جائے تو اس کا انسانی پہلو قابل توجہ ہونا چاہیے۔ میں اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں کہ ایک روسی کی اور ایک افغانی کی انسانی حیثیت یکساں ہے۔ ان میں سے کسی انسان کو تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔

جناب پیروف نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ مسئلہ افغانستان میں پاکستان اور امریکا کی دخل اندازی نے خراب حالات پیدا کیے ہیں۔ مجاہدین کا مرکز پاکستان بنا ہوا ہے اور ان کو تمام امداد پاکستان کے ذریعہ سے پہنچ رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ پاکستان میں کم از کم تیس لاکھ افغان مہاجر ہیں۔ ان کی اکثریت افغانستان کے حالات سے پریشان ہے، وہ قطعی طور پر روس کو جارح کہتے ہیں اور اپنے پیارے وطن کو روس کے زیر اثر دیکھنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے فیصلہ جہاد کیا ہے۔ پاکستان ان کو اس فیصلہ جہاد سے روک نہیں سکتا۔ ایک تو اس لیے کہ ہر افغانی کو افغانستان کو آزاد رکھنے کا حق ہے۔ دوسرے یہ کہ افغانستان کا مہاجر مسلمان ہے اور مسلمان پر دینی اعتبار سے کفر کے خلاف جہاد فرض ہے۔ یہ وہ دو بنیادی نکات ہیں کہ مسلمان پاکستان ان کی تکذیب نہیں کر سکتا اور تعلیمات اسلامی کی رو سے پاکستان شرعاً اور اخلاقاً افغانستان کی مدد کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اس دینی اور اخلاقی پہلو سے قطع نظر کیا یہ پاکستان کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرے نیز نظریاتی سرحدوں کا نگراں ہو؟ ماہرین معاشیات اور علمائے اقتصادیات کی رائے قطعی طور پر یہی ہو سکتی ہے کہ افغانستان میں روس کے داخلے کے نتیجے میں اس کا معاشرتی پہلو بھی نہایت سنگین ہے۔ پاکستان کو آخر یہ حق کیوں نہیں ہے کہ وہ اپنی سرحدوں پر پیدا ہونے والے طوفانوں سے بچنے بچانے کا سامان کرے؟ پاکستان کو اس حق سے محروم کردینے کا آخر کون سا اخلاقی پہلو ہے؟

مجھے اس رائے سے کلیہ اختلاف ہے کہ پاکستان افغانستان پر حملہ آور ہو رہا تھا اس لیے افغان حکومت نے روس سے مدد مانگی اور روس نے افغانستان کی حفاظت کے لیے اپنی افواج سرزمین افغانستان پر اتار دیں۔

پاکستان افغانستان پر کوئی حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کرنا چاہیے کہ یہ ایک خود ساختہ کہانی ہے۔ حقیقت کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ذرا اس صورت حال پر بھی غور کرلینا چاہیے کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان پر کون سا

حملہ کرنے چلا تھا؟ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مابین کس جنگ کا امکان تھا؟ اس فتح و نصرت کا کیا سوال تھا؟ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان ایک ہی ملک تو تھے۔ مگر وہاں ہندستان نے جو حالات پیدا کیے اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین منافرت کا جو سامان کیا اس تاریخی حقیقت کا بطلان کیسے ممکن ہے؟ پھر ہندستانی افواج مشرقی پاکستان میں داخل ہوگئیں اور اسے مغربی پاکستان سے انھوں نے آزاد کرا لیا۔ ذرا غور فرمائیے اس میں شرافت کا کون سا پہلو ہے؟ ہندستان کا یہ کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہندو کثرت سے ہیں اس لیے ان کی حفاظت ہندستان کا فرض تھی۔ اگر اس فرض کو مان بھی لیا جائے تو پھر یہ غور کرنا ہوگا کہ افغانستان میں کون سے روسی بس رہے تھے جن کی حفاظت ضروری تھی؟

میری رائے میں مشرقی پاکستان پر ہندستان کی جارحیت اور افغانستان پر روس کی جارحیت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور ساری دنیا کے صلحا اس کو غلط قرار دیتے ہیں، اور کبھی اسے صحیح نہیں کہیں گے۔

اس وقت روس میں جو قیادت ہے اس کی حیثیت صلح پسند کی ہے۔ خود اس قیادت کی رائے یہ ہے کہ افغانستان سے افواج روس کو نکال لینا چاہیے۔ قیادت روس کا یہ فیصلہ بجائے خود اس کی تائید میں ہے کہ افغانستان پر روس کی فوج کشی صحیح نہیں تھی۔ اس سے ایک انسانی حق پامال ہوا ہے۔ میں جناب محترم گورباچوف صاحب کے فکر و عمل کو جس حد تک ممکن ہے گہرائی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ ان کی حیثیت ایک مصلح کی ہے، اس لیے میں ان کا حد درجہ احترام کرتا ہوں۔ میری رائے ہے کہ گورباچوف صاحب بذات خود انسان دوست ہیں۔ ان کی طرف سے انسان دوستی کے متعدد مظاہرے ہوئے ہیں۔ میں اس حقیقت کا پوری طرح ادراک رکھتا ہوں کہ روس کے سامنے پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں۔ روس کی بے پناہ طاقت کا پاکستان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ گورباچوف صاحب کو اپنی اس طاقت کا بہ خوبی احساس و ادراک ہے۔ بہ ایں ہمہ، وہ جب یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ افغانستان سے افواج روس کو واپس جانا چاہیے تو اس فیصلے میں پاکستان کی طاقت کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ

یہ فیصلہ قطعی طور پر انسانی فیصلہ ہے اور انسان و انسانیت کا بین احترام ہے ۔ اس باب میں دنیا کا ہر شخص جناب محترم گورباچوف صاحب کا احترام کرے گا اور ان کی انسان دوستی کا اکرام کرے گا کہ انھوں نے افغانستان میں امریکا کی بدیہی پیش رفت اور اس کے نتائج و عواقب سے قطعی بے پروا ہو کر انخلائے افواج روسی کا فیصلہ کیا ہے ۔ روس اور پاکستان دونوں جانتے ہیں کہ امریکا اپنا دوست سب سے پہلے ہے ۔ ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے اسے دوسری بڑی طاقت سے سابقہ ہے ۔ وہ توازن طاقت کا خواہاں ہے ۔ اسے اساسی طور پر اور بنیادی طور پر پاکستان کے مفادات سے کوئی محبت ہے اور نہ اسے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ امریکا کی ایک اور بے چینی یہ ہے کہ حالات ایران نے امریکا کے انداز فکر کے مطابق توازن طاقت بگاڑ دیا ہے ۔

ایران میں جناب امام خمینی صاحب کے اقتدار کے بعد اور اس کے بعد ایران میں روس کی بالادستی امریکی طاقت و اسباب کی ایسی شکست ہے جو اسے گوارا نہیں ہے اس لیے افغانستان میں امریکی دخل امریکا کی شدید ضرورت بن گیا ہے ۔ امام خمینی صاحب کے چاہنے نہ چاہنے کے باوجود ایران عراق جنگ نے جو صورت اختیار کی ہے اس نے ایران و عراق کو تو ہر لحاظ سے تباہ کر ہی ڈالا ہے مگر اس طویل جنگ نے دنیائے عرب کو بھی کنگال کردیا ہے اور اسرائیل کے لیے برتری کا ہر موقع فراہم کردیا ہے ۔ میری رائے کے مطابق عالم عرب کی بدحالی فقط مالی بدحالی نہیں ہوئی ہے بلکہ عراق ایران جنگ نے ان کی اخلاقی قوتوں کو یکسر سلب کرلیا ہے ۔ عراق و ایران آخر دونوں ہی مسلمان بھائی ہیں ۔ ان دونوں میں جنگ بذات خود پر اخلاقی شکست ہے ۔ اسی طرح اگر عرب دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں تو جاننا چاہیے کہ ان کی اخلاقی قوتیں کم زور ہوچکی ہیں اور ان کی ایمانی قوت زمین بوس ہوچکی ہے ۔ میں اس صورت حال کو بہ نگاہ تشویش دیکھتا رہا ہوں ۔ اگر نقشہ دنیا کو سامنے رکھ کر بارہ اقوام عرب کو دیکھا جائے تو ایک طرف چھے اور دوسری طرف چھے ہیں اور یہ بارہ عرب حکومتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں ۔ اس صورت حال کو اس لیے تشویش کے ساتھ دیکھنا ضروری ہے کہ چھے کو امریکی حمایت حاصل ہے اور دوسری چھے پر

روس کا فکری غلبہ ہے ۔ میں اس صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ اقوام عرب کی "یہ تقسیم" سپر طاقتوں کی تنظیم ہے ۔ آج کے نہایت سنگین حالات کی روشنی میں کل یہ دکھائی دے سکتا ہے کہ یہ عرب اقوام ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں گی اور بالآخر بارہ کی بارہ پسپا ہو کر امریکا اور روس کے رحم و کرم پر رہ جائیں گی

ایران اب اپنی خودی سے محروم ہو کر فقط روس پر بھروسا کرسکتا ہے ۔ امریکا اس کو اپنی شکست تسلیم کرچکا ہے ۔ وہ اب افغانستان میں دخیل رہنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں اس نے پاکستان کا سہارا لیا ہے ۔ اس لیے افغانستان میں پاکستان کو جارح قرار دینا نادانی ہے ۔ روس کو تو پاکستان سے ہمدردی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے فیصلوں میں آزاد نہیں ہے ۔ یہاں امریکا اپنی من مانی کرسکتا ہے ۔

اگر جناب محترم گورباچوف صاحب کی انسان دوستی کو قرار حاصل ہوگیا تو پاکستان کے دل سے روس کا خوف نکل جائے گا ۔ اس خوف کو نکالنے کا سامان کرنا چاہیے ۔ افغانستان میں حکومت افغان کی ہونی چاہیے ۔ روس کو یہ حالات پیدا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے ۔ ایسی صورت میں پاکستان کو آزادانہ فیصلوں کا موقع مل جائے گا ویسے بھی قدرتی طور پر پاکستان اور روس میں دوستی ہونی چاہیے کہ قریب ترین پڑوسی ہیں ۔ میں ذاتی طور پر اس دوستی کے حق میں ہوں ۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ روس نے خود اپنے زیر نگیں پانچ مسلم ریاستوں کے حقوق بحال کر دیے ہیں ۔ ان کو آزادی دیدی ہے کہ وہ اپنے دین پر چلیں اور آزادی کے ساتھ اپنی روایت و ثقافت کو بحال کریں ۔ مدارس و مساجد آزاد اور بحال کی جا رہی ہیں ۔ اب نئی مساجد تعمیر ہوتی چلی جا رہی ہیں ۔ گورباچوف حکومت کا یہ عادلانہ نظام ہے جس کی تعریف کرنی ضروری ہے ۔ میں اس صورت حال کا مطالعہ باہر سے کرتا رہا ہوں اور اب روس کے اندر آکر حالات کا مشاہدہ کر رہا ہوں ۔ یہ انداز فکر انسانی ہے ۔ اس کا مظاہرہ روس کے اندر اور روس کے باہر دونوں جگہ ہونا چاہیے ۔

سال گزشتہ میں ریگن گورباچوف ملاقات کے وقت میں خود موسکو میں تھا اور میں نے اس ملاقات پر اپنے سفرنامے "ماوراء البحار" میں تبصرے کیے ہیں ۔ اب دسمبر

میں گورباچوف بش ملاقات سامنے ہے ۔ اس ملاقات میں سب سے اہم فیصلہ یہی ہوسکتا ہے کہ امریکا اور روس دونوں اقتدار کی جنگ کو ختم کریں اور دنیا کے ہر ملک اور دنیا کی ہر قوم کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کا موقع فراہم کریں ۔ امریکا اور روس دونوں کولونیاں بنانا ترک کریں ۔

اگر یہ فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر دنیا سے جنگ کا ہر خطرہ ختم ہوجائے گا ۔ پھر مشرق و مغرب دوست بن جائیں گے ۔ انسان اور انسانیت کا رتبہ بحال و بلند ہوجائے گا ۔ انسان انسان کا دوست ہوجائے گا ۔ احترامات باہم قائم ہوجائیں گے ۔

جناب سفیر صاحب کے ہاں آج نہایت ستھری مجلس رہی ۔ رات ساڑھے دس بجے یہ مجلس برخاست ہوئی ۔ میں نے یہاں سرکاری موٹر کار سے اترتے وقت یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہمارے میزبان نے اس کار کو رخصت دیدی ہے اور واپسی ہماری محترمہ ڈاکٹر لدمیلا کی کار میں ہوگی ۔ میں نے سفارت پاکستان کے جناب قاضی صاحب سے کہہ دیا تھا کہ سفارت خانے کی کار کھڑی کردیں تاکہ میری واپسی اس میں ہوسکے انھوں نے ازرہ کرم ایسا ہی کیا ۔ میں اور سعدیہ اطمینان سے اپنی قیام گاہ آگئے ۔

افغانستان میں روسی فوج بھیجنے کا فیصلہ

مسئلہ افغانستان یقیناً نہایت پیچیدہ ہوچکا ہے ۔ صورت حال پر غور کرنے کے متعدد پہلو ہوسکتے ہیں ۔ ان کو سمجھنے کے لیے اندرون روس فیصلوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے ۔

روس کے وزیر دفاع دمتری استینوف نے عین اس وقت کہ جب وہ اعلا ترین فوجی حکام کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے روانہ ہو رہے تھے ' سرخ پنسل اٹھائی اور اپنے کاغذات کے حاشے پر جن پر کچھ نوٹس تحریر تھے "انتہائی خفیہ" (priority top secret کے الفاظ لکھ دیے ۔

یہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۹ء کا دن تھا ۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا کہ روسی قیادت نے افغانستان میں فوج بھیجنے کا سیاسی فیصلہ کر لیا ہے ۔ اسی دن

استینوف اور چیف اوف جنرل اسٹاف نکولائی اگارکوف نے ایک دستاویز پر دستخط کیے جس کے ذریعہ سے منصوبے پر عمل در آمد کی ہدایت کی گئی تھی ۔ روسی فوج کو ۲۵ دسمبر کو روسی وقت کے مطابق ۳ بجے شام سرحد عبور کرنی تھی ۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے حقائق جن سے افغانستان میں فوج بھیجنے کے فیصلے کے اسباب و وجوہ پر روشنی پڑتی ہے ' لیفٹنٹ کرنل اے اولینک کے ایک مضمون کے ذریعہ سے سامنے آئے ہیں جو ۱۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو کرسنایا " زویزدا " نے شائع کیا ہے ۔

آج بھی چند ہی لوگوں کو اس کا علم ہے کہ افغانستان میں روسی فوج بھیجنے کا حتمی فیصلہ سنٹرل کمیٹی کے جنرل سیکریٹری اور یو ایس ایس آر سپریم سوویت پریزیڈیم کے صدر برژنیف کے دفتر واقع کریملن میں ۱۲ دسمبر ۱۹۷۹ء کو کیا گیا ۔ یہ فیصلہ اتنا خفیہ تھا کہ عوام تو ایک طرف رہے سپریم سوویت کی پریزیڈیم سنٹرل کمیٹی اور پولٹ بیورو تک کو اس کا علم نہ تھا ۔ اس فیصلے سے اعلا فوجی حکام کو بھی حیرت اور تشویش کا جھٹکا لگا جنھیں اپنے فرائض کے نقطۂ نظر سے افغانستان کے واقعات و حالات کے سلسلے میں کچھ ضروری اقدامات کرنے ہوتے اور جنھیں افغانستان کے معلوم حقائق کی بنا پر اس ملک میں فوج بھیجنے کے اقدام کی کام یابی پر شبہ تھا ۔

اولینک نے اپنے مضمون میں جو انکشافات کیے ہیں ان کی تائید میں روس کے اعلا فوجی حکام کے حوالے بھی دیے ہیں ۔ مثال کے طور پر فوج کے ایک جنرل آئی ۔ پاؤلوسکی نے جو استینوف کا نائب اور بری فوج کا کمانڈر تھا ' کہا کہ وہ نومبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان سے واپس آیا تھا اور اسی دن استینوف کو رپورٹ کرنے کے لیے وزارت دفاع گیا ۔ اس نے استینوف کو افغانستان کی صورت حال سے آگاہ کیا اور آخر میں خیال ظاہر کیا کہ مختلف وجوہ کی بنا پر افغانستان میں فوج بھیجنا ضروری نہیں ہے ۔ اس نے دوسری باتوں کے علاوہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ پولٹ بیورو کے کسی ممبر کو ہدایت کی جائے کہ وہ حفیظ اللہ امین سے ملاقات کرے اس لیے کہ وہ شکوک و شبہات کا شکار ہے ۔ اس نے استینوف کو حفیظ اللہ امین کے اس ذاتی پیغام کے بارے میں بھی بتایا جو امین نے برژنیف کو افغانستان میں مقیم چیف ملٹری ایڈوائزر کے ذریعہ سے

ارسال کیا تھا۔ وزیر دفاع استینوف نے پاؤلوسکی کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں کی۔

بہرحال پاؤلوسکی ہی واحد شخص تھا جس کی رائے کو نظر انداز کیا گیا۔ سیاسی قیادت اور وزارت دفاع دونوں نے جنرل اسٹاف کی ان مضبوط دلائل پر بھی توجہ نہیں کی جو افغانستان میں روسی افواج بھیجنے کے خلاف پیش کی گئیں۔ فوج کے ایک جنرل **ویرینیکوف** نے جو اس وقت ڈپٹی چیف اوف جنرل اسٹاف تھے بتایا کہ انھوں نے بذات خود مارشل اوگارکوف اور ان کے فرسٹ ڈپٹی جنرل اخرومیف نے وزیر دفاع کے ساتھ مسئلہ افغانستان پر بات چیت کرنے پر اصرار کیا۔ جنرل اسٹاف کی رائے تھی کہ افغانستان کی صورت حال پر قابو پانے کے لیے ۷۵ ہزار روسی فوج بھیجنے کا منصوبہ قابل قبول نہیں اس لیے کہ یہ تعداد مقصد حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں۔ مزید برآں جنرل اسٹاف کے خیال میں افغانستان میں روسی افواج کی موجودگی سے باغیوں کی تحریک کو تقویت پہنچ سکتی تھی جو ظاہر ہے کہ روسی فوج کا ہدف ہوں گی۔

مضمون نگار نے ان اعلا روسی حکام کا بھی ذکر کیا ہے جو افغانستان میں مقیم تھے اور جنھوں نے روسی فوج کے افغانستان میں داخل ہونے سے پہلے واقعات کا مشاہدہ کیا تھا' بلکہ ان میں حصہ بھی لیا تھا۔ وہ ان بیشتر نئے حقائق کا بھی حوالہ دیتا ہے جن سے اپریل ۱۹۷۸ء کے بعد افغانستان کی ڈرامائی صورت حال کا پتا چلتا ہے۔ اوینک اپنے مضمون میں لکھتا ہے کہ صرف افغان ہی اپنے داخلی مسائل کا صحیح اندازہ لگا سکتے تھے۔ ہماری دلچسپی کی بات صرف اتنی ہے کہ ماسکو نے ۱۹۷۹ء میں افغانستان کی صورت حال کا جائزہ کس انداز میں لیا تھا۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ یہ تجزیہ تشویش انگیز تھا۔ اس مسئلے پر امریکا اور پاکستان کا نا مناسب کردار زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا جارہا تھا۔ اس کے باوجود کہ امریکا نے ڈیموکریٹیک ری پبلک اوف افغانستان کو تسلیم کرلیا تو حقیقت یہ ہے کہ جوں ہی پیپلز ڈیموکریٹیک پارٹی نے اقتدار پر قبضہ کیا امریکا نے ترہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبے پر کام شروع کردیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان میں بادشاہت کے حامیوں' جاگیرداروں اور دوسری رجعت پسند قوتوں سے سی آئی اے کے روابط سے فائدہ اٹھاکر نئے نظام کو اندر سے ہی تباہ کر دیا جائے۔ کابل سے

روس کے فوجی اتاشی نے دارالحکومت میں امریکن کلچرل سنٹر کی مخالفانہ سرگرمیوں اور افغان امریکی مشترکہ فضائی کمپنی آریانا کے قیام کے بارے میں رپورٹ بھیجی تھی۔ امریکا ہی کی تحریک پر فضائی کمپنی ڈگلس کی نمائندگی کرنے والے ماہرین کا ایک بڑا گروپ امریکا سے کابل پہنچا تھا۔ اس گروپ کا ہر ممبر افغان زبانیں دری اور پشتو سے خوب واقف تھا اور بولتا تھا۔ وہ سب مقامی رسوم و رواج سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ انقلاب ایران کے بعد تقریباً اسی موقع پر سی آئی اے نے اپنا ہیڈکوارٹر کسی ایسی جگہ منتقل کردیا تھا جہاں سے ایران اور افغانستان دونوں ملکوں کی صورت حال کو کنٹرول کیا جاسکے۔ خود مختار افغانستان کے معاملات میں براہ راست مداخلت بڑھ گئی تھی۔ پاکستانی سرحد سے ہتھیار اور افغان مہاجرین میں سے لڑنے والے (مجاہدین) خفیہ طور پر افغانستان میں داخل ہونے لگے تھے۔ روسی فوج کے محکمہ خفیہ کے مطابق ۱۹۷۹ء کے اختتام تک تقریباً چالیس ہزار باغی افغانستان میں سرگرم عمل تھے اور ان کی مدد کے لیے مزید افراد پاکستان سے آرہے تھے۔

ان تمام حالت کا افغانستان حکومت ہی کو نہیں روسی قیادت کو بھی اچھی طرح علم تھا۔ تمام ضروری اطلاعات انھیں محکمہ خفیہ' سفارتی و فوجی ذرائع سے باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھیں۔ ان رپورٹوں میں بتایا گیا تھا کہ افغانستان کی صورت حال خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے اور اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ مسلح قبائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں بلکہ افغان فوج میں بھی بغاوتیں پھوٹ پڑی ہیں۔ فوج کے حوصلے پست اور اس میں عسکری صلاحیت بھی کم ہے۔ پارٹی کے اندر خلق اور پرچم دھڑوں کی معرکہ آرائی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ افسروں اور جوانوں کی بڑی تعداد کو گرفتار کرکے موت کے گھاٹ اتارا جارہا ہے۔ افغان حکومت کے مطابق اس وقت تقریباً گیارہ ہزار سیاسی قیدیوں کو ختم کر دیا گیا۔

کرسنایا زویزدا نے متعدد ایسی دستاویزات بھی شائع کی ہیں جن میں حکومت افغانستان نے روس سے درخواست کی ہے کہ روسی فوج افغانستان بھیجی جائے۔ اس نوعیت کی درخواستیں ترہ کی اور حفیظ اللہ امین کی طرف سے ہوئیں اور روسی سفیر

پوزاسوف ' کے جی بی کے نمائندے لفٹنٹ جنرل ایوانوف اور چیف ملٹری ایڈوائزر لفٹنٹ جنرل گوریلوف کے ذریعے سے کریملن پہنچیں ۔ ترہ کی نے سنٹرل کمیٹی کے سکرٹری بورس پونومیریوف کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کے دوران یہ سوال دوبار اٹھایا جب کہ حفیظ اللہ امین نے جنرل پاؤلوسکی سے اس وقت بات کی جب وہ کابل میں اگست تا نومبر ۱۹۷۹ء مقیم تھے ۔ ۱۹۷۹ء کے دوران افغان حکومت نے روسی فوج کی مدد کے لیے اٹھارہ بار درخواست کی جس کا کوئی واضح اور حتمی جواب نہیں دیا گیا ۔

ان واقعات کی یادیں تازہ کرتے ہوئے روس کے سابق چیف ملٹری ایڈوائزر لفٹنٹ جنرل لیو دگورنوف نے بتایا کہ کے جی بی کے لفٹنٹ جنرل ایوانوف کے ساتھ اسے بھی افغانستان سے متعلق پولٹ بیورو کمیشن میں شامل ہونے کے لیے موسکو بلایا گیا ۔ اس کمیشن کے ارکان میں آندرے گرومیکو ' یوری آندروپوف ' دمتری استینوف اور اوگارکوف نیز فرسٹ ڈپٹی منسٹر برائے امور خارجہ کورنیکو بھی شامل تھے ۔ وہاں صاف بتادیا گیا کہ افغان حکومت اور بالخصوص پی ڈی پی اے گورنمنٹ میں فوجی امور کے انچارج امین کی متعدد درخواستوں کے باوجود افغانستان میں مقیم روسی فوجوں کی تعداد میں اضافہ مناسب نہیں ہے ۔ انقلاب میں بحران پیدا کرنے کے سوا وہاں روسی فوج بھیجنے کا اور کوئی فائدہ نہیں ۔ پست ہمتی اور عسکری مشکلات کے باوجود افغان فوج تنظیم نو کے بعد از خود انقلاب اپریل کا دفاع کرنے کے قابل ہوجائے گی ۔ لفٹنٹ جنرل ایوانوف جس کو اولینک کے بعد خطاب کرنا تھا ' افغان فوج کی عسکری صلاحیت اور پی ڈی اے کے داخلی معاملات کے بارے میں ایوانوف کی رائے بالکل مختلف تھی اور بد قسمتی ہے کہ روسی لیڈر اس سے پوری طرح مطمئن بھی ہوگئے ۔

اولینک لکھتا ہے کہ افغانستان میں فوج بھیجنے کا فیصلہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں رونما ہونے والی انتہائی پیچیدہ اور متصادم بین الاقوامی صورت حال ' اقتدار ' پالیسی اور روس و امریکا کے درمیان بے اعتمادی اور شکوک و شبہات کے نتیجہ تھا ۔ اس سیاسی اقدام کے حق میں کتنے ہی دلائل لائے جائیں اور کیسی ہی وضاحتیں کی جائیں بہرحال اس کا جواز ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔

۷ نومبر ۱۹۸۹ء --- موسکو

گریٹ اکتوبر سوشلسٹ ریوولیوشن ـ ۷۲ ویں سالگرہ !

میں ان دنوں دنیا کی ایک عظیم مملکت روس میں ہوں کہ یہاں پوری قوم ' ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ' اپنے ۷۲ ویں گریٹ اکتوبر سوشلسٹ ریوولیوشن کا جشن منا رہی ہے ۔ عمارتیں اور گلی اور بازار سرخ جھنڈوں سے لپٹے پڑے ہیں ۔ شہر موسکو میں عظیم انقلابی لینن اعظم کی بڑی بڑی تصاویر بڑی بڑی دیواروں پر آویزاں ہیں ان کے اقوال زریں جگہ جگہ لکھے گئے ہیں ۔ عورتوں اور مردوں ' بچوں اور بوڑھوں کے سینوں پر اور بازوؤں پر انقلابی نشانات آویزاں ہیں ۔ پورا شہر موسکو جاگ رہا ہے ' سرخ ہو رہا ہے ۔ آزادی کی قدر داں قوم آزادی فکر اور آزادی گفتار کا جشن منا رہی ہے ۔ مساوات انسانی اور عظمت آدمی کے گیت گائے جا رہے ہیں ۔ تمام ذرائع ابلاغ اس جشن میں پوری دیانت کے ساتھ شریک ہیں ۔ ٹیلے وژن کے پروگرام پوری قوم کو حوصلہ تازہ دے رہے ہیں اور عظمت روس اور رفعت فکر روس کے حوالے دے کر تربیت ذہن و فکر کا سامان کر رہے ہیں ۔ انقلاب روس کے عظیم رہنما کی یاد تازہ کی جا رہی ہے اور اس کی عظمت کو روس کا بچہ بچہ آج سلام کر رہا ہے ۔ میں اور سعدیہ آج کے جشن میں مدعو ہیں ۔ ہمارے نگراں جناب گنادی صاحب پوری رعنائیوں کے ساتھ ہمارے ساتھ ہیں ۔ ان کی رہنمائی میں ہم قیام گاہ سے روس کی تیار کردہ خوب صورت لمبی چوڑی موٹر کار میں روانہ ہوئے ۔ ناہموار سڑکوں پر یہ کار جیسے تیر رہی ہو ۔ اس کا نام " بحری بگلا " اسی لیے رکھا گیا ہے کہ یہ نشیب و فراز سے بے پروا رواں دواں رہتی ہے ۔ یہ موٹر کار ہمیں چین کی میزبانی یاد دلاتی ہے جب سعدیہ اور میں سرکاری مہمان (اسٹیٹ گیسٹ) تھے اور ہمیں اسی سائز کی ایک اسٹیٹ کار ملی تھی !

ہمارے ہاتھوں میں دعوت نامے تھے اور اپنے اپنے پاس پورٹ ۔ کم از کم تین

جگہ ہمارے دعوت نامے دیکھے گئے۔ ہمارے نام پاس پورٹ سے ملائے گئے۔ ہماری تصویروں اور ہمیں بہ غور دیکھا گیا۔ اس قدر احتیاطوں کے سایوں میں ہم ریڈ اسکوئر پہنچ گئے جہاں ایک کونے سے دوسرے کونے تک افواج روس نے میدان سرخ کا احاطہ کیا ہوا تھا۔

"ریڈ" کے معنی روس میں خوب صورت کے ہیں۔ یہ بالکل اتفاق ہے کہ عظیم لینن نے سرخ رنگ کو اختیار کیا۔ ان کے ذہن میں حسن کا تصور تھا۔ وہ انسان ارض کو حسن و جمال سے آراستہ کرنے کے مدعی اور خواہاں تھے۔ اب یہ ریڈ انگریزی زبان کا ریڈ ہوگیا ہے جس کے معنی سرخ ہیں۔

افواج روس کے ہر سپاہی کے سینے پر اور بازوؤں پر سرخ پٹیاں واقعی بڑی خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ آج پریڈ میں جو بھی افواج حصہ لے رہی تھیں ان میں ہر سپاہی کی وردی نئی تھی۔ جوتے چمک دار تھے۔ تمام بلے سینوں اور کندھوں پر چمک رہے تھے۔ جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ کریملن کے بڑے گھنٹے نے دس بجائے اور ریڈ اسکوائر پر پریڈ شروع ہوگئی۔ نہایت وقار کے ساتھ مختلف افواج کے سپاہی مارچ کر رہے تھے۔ ان کا نظم و ضبط قابل دید اور لائق آفرین تھا۔ سخت سردی کو ان سپاہیوں کی گرمی جذبات نے گرما دیا تھا۔ ایک گھنٹہ یہ مارچ جاری رہا۔ ہم سے دور روس کے صدر جناب محترم میخائل گورباچوف سلامی لے رہے تھے۔ شاید ان کے قلب و ذہن میں انقلابات جنم لے رہے تھے۔ جس مزاج کے وہ انسان ظاہر ہوئے ہیں اس کو سمجھتے ہوئے شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنے والے سال میں انقلاب اکتوبر کی معنویت مشتبہ ہوجائے گی چوں کہ ان کے خیالات ظاہر ہوچکے ہیں اور ان کا انداز فکر اس کا غماز ہے کہ روس میں لینن کی شخصیت کی اہمیت برقرار نہیں رہے گی، انقلاب اکتوبر کی بنیادیں کم زور ہوجائیں گی اور وہ عمارت جلد زمیں بوس ہوجائے گی جس کی عمر ۷۲ سال ہے۔

افواج کے مارچ کے بعد مختلف قسم کے ٹینک، توپ بردار گاڑیاں وغیرہ بھی ریڈ اسکوائر پر دندناتی گزریں اور گزرتی رہیں۔ ٹھیک ۱۱ بجے سلامی کی توپوں کے گولوں کی

گھن گرج سے دل جواں ہوئے تھے۔ اب یہ جواں دل دھڑک رہے تھے۔

سب سے آخر میں ہم نے دیکھا کہ روس کے عوام ریڈ اسکوائر سے گزرے۔ ان میں صنعتی کارکنان بھی تھے اور تاجر بھی۔ ان میں کسان بھی تھے اور طلبہ بھی۔ غرض روس میں ہر شعبہ زندگی کے عوام اپنے اپنے نشانات کے ساتھ اور اپنی اپنی ایجادات کے ساتھ لاکھوں دیکھنے والوں کے سامنے سے گزرتے رہے اور یہ سلسلہ گھنٹوں جاری رہا۔

سخت سردی تھی، مگر اس کا ذرا احساس نہ ہوا۔ گھنٹوں کھڑے کھڑے جب اپنا ہوش آیا تو ٹانگیں اور پیر سن ہو چکے تھے۔ اب چلنا مشکل ہوگیا !

میں جانتا ہوں کہ روس میں بھی آئے دن انقلابات آتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی حالات اقتدار کی جنگ سے خالی نہیں رہتے۔ ایک برسر اقتدار آتا ہے تو دوسرا اقتدار کی مسند پر متمکن ہونے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ ہرچند کہ میخائل گورباچوف صاحب کو عوام کی محبت حاصل ہے۔ انھوں نے تعلقات استوار کیے ہیں۔ انڈیا سے وہ دوستی کو بڑھا رہے ہیں۔ دنیائے عرب و اسلام سے دوستی کے وہ خواہاں ہیں اور آرزو مند۔ اس کے باوجود ان کو ایک حریف کا سامنا ہے جس سے وہ ہمہ دم اور ہمہ وقت چوکنا رہتے ہیں۔ ان کا حریف شاید ان کی تخفیف اسلحہ کی پالیسی سے متفق نہیں ہے۔ ان کا حریف شاید طاقت سے دنیا فتح کر لینے کا آرزو مند ہے۔ ان کے حریف کو شاید امن کی بات کرنے کی روش ناپسند ہے۔

میں جانتا ہوں کہ گزشتہ پچاس سال سے روس میں اندرونی انقلابات آتے رہے ہیں اور آتے بھی رہیں گے۔ مگر اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ روس کا نظریہ حیات اور فلسفہ زندگی ہر انقلاب کا رہنما رہا ہے۔ ایسا آج تک نہیں ہوا کہ روس کے کسی بھی انقلاب نے نظریہ زندگی اور فلسفہ حیات میں کوئی تبدیلی کی ہو۔ ہر انقلاب کے بعد نظریہ و فلسفہ جواں تر ہوتا رہا ہے۔ آج بھی جناب گورباچوف کی زیر قیادت نظریہ و فلسفہ زندگی پر رچاؤ اور رعنائیت تازہ آتی جا رہی ہے۔

گزشتہ دنوں روس میں اس پر اظہار تشویش ہوا تھا کہ روس میں مسلمانوں کی

طاقت بڑھ رہی ہے اس پر قدغن قائم کرنا چاہیے ۔ یہ وہی بات ہے کہ جو امریکا میں بھی ڈنکے کی چوٹ پر کہی گئی ہے ۔ مگر اس قسم کی باتیں اس وقت ہورہی ہیں کہ جب امریکی استعمار دنیائے عرب کو بے چارہ اور دنیائے اسلام کو ناکارہ کرچکا ہے ۔ امریکا میں یہ چیخ پکار کہ مسلمان عالم تازہ دم ہو رہا ہے اس وقت ہورہی ہے جب مسلمان ارض بے دم ہوچکا ہے ۔ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ یہ ایک ظالمانہ مذاق ہے ۔ یہ اہانت آمیز استہزا اور یہ ظالمانہ مذاق اس لیے ہو رہا ہے کہ دنیائے عرب و اسلام اپنے حال زار پر غور نہ کرسکیں اور اپنی بے حالی کا انھیں احساس نہ ہو اور اپنی بدحالی کا انھیں ادراک نہ ہوسکے ۔

مسلمانوں کے باب میں سوپر طاقتی جادو اس قدر سرچڑھ کر بولا ہے کہ عراق ایران جنگ ۸ ۔ ۹ برس جاری رہتی ہے اور کم از کم سات ارب ڈالر کے ہتھیار ایران و عراق کو مسلمان کے ازلی دشمن اسرائیل سے فراہم کرادیے جاتے ہیں اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ان ہتھیاروں سے قتل کر ڈالتا ہے ، مگر اسے یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ بھائی کو قتل کر رہا ہے ۔ احساس کا یہ قحط اور ادراک کا یہ فقدان کیا یہ سمجھنے کے لیے ناکافی ہے کہ آج کا مسلمان اپنے وجود سے غافل ہوچکا ہے ؟ کیا اس کے لیے کسی اور ثبوت کی ضرورت ہے کہ مسلمان قرآن و سنت سے غافل اور گریزاں ہوچکا ہے ؟ کیا اس کے لیے اور بھی حقائق درکار ہیں کہ ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان ملک کا دوست نہیں رہا ؟ حتی کہ اب مسلمانوں کی سربراہ کانفرنسیں جن پر کروڑوں اربوں ڈالر خرچ آتا ہے اختلافات پر ختم ہوتی ہیں !

امریکا اس مسلمان سے خائف ہے ؟

روس کو ایسے مسلمان سے کوئی ڈر ہوسکتا ہے ؟

میں نے روس کو ماضی میں بھی گہرائی کے ساتھ دیکھا ہے اور میں آج بھی یہاں حالات کو گہرائی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں ۔ میں طرز فکر اور انداز حکومت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ اور اپنی رائے اس وقت قائم کروں گا جب میں ازبکستان اور آذر بائیجان کا دورہ کرچکا ہوں گا ۔

روس کی سرخ فوج

انقلاب اکتوبر روس کے موقع پر آج ریڈ آرمی کے مظاہرے دل پسند تھے اور دل دوز بھی ۔ اس سرخ فوج کے بارے میں خود روس میں جو حالات پیدا ہو رہے ہیں میں نے ان پر غور کیا ہے ۔ صورت حال یہ ہے کہ روس کی سرخ فوج پر جسے سرکاری طور پر اب تک مادر وطن کا دلیر محافظ قرار دیا جاتا رہا ہے زبردست تنقید کرتے ہوئے ایک گروپ نے الزام عائد کیا ہے کہ استحصال ' اقربا پروری اور زندگی کے پست ترین معیار نے مسلح افواج کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے ۔ تقریباً دو سو روسیوں نے جن میں سے بعض نے فوج کے اونی کوٹ بھی پہن رکھے تھے موسکو کے جنوب مشرقی علاقے میں جمع ہوکر شیلڈ نامی ایک تنظیم کے زیر اہتمام ایک پارکنگ لاٹ پر مظاہرہ کیا ہے ۔ مذکورہ تنظیم خود افواج ہی سے فوجیوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کچھ عرصے پہلے قائم کی گئی ہے ۔ مظاہرین نے جو بینر اٹھا رکھے تھے ان پر اس قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے

"روس کی افواج میں تشدد اور بے رحمانہ و وحشیانہ طرز عمل ختم کیا جائے ۔"

"فوجیوں کو بھی جینے اور صحت مند رہنے کا حق حاصل ہے ۔"

اس کے ساتھ ہی روس کے ذرائع ابلاغ نے بھی فوج کی مراعات یافتہ حیثیت بے نقاب کرنے کی مہم چلا رکھی ہے اور عام طور پر یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ روس کی مسلح افواج میخائل گورباچوف کے سماجی اصلاحی پروگرام پرسترائیکا کا پوری طرح ساتھ نہیں دے رہی ۔

لیفٹننٹ ویتالی نے مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ روسی فوج اب بھی بے عمل اور ناکارہ ہے ۔ اس میں بدعنوانی ' رشوت ستانی اور اقربا پروری پائی جاتی ہے ۔ فوج میں تمام رجعت پسند قوتیں مرتکز ہوگئی ہیں ۔ اس کا خطرہ موجود ہے کہ برژنیف دور کے جنرل اور فیلڈ مارشل فوجی انقلاب برپا کرکے پرسترائیکا کو ختم کردیں ۔ اس سلسلے میں انھوں نے برژنیف کی ۱۹۶۴ تا ۱۹۸۲ء حکمرانی کا بھی حوالہ دیا ۔

فوجی جوانوں کی ماؤں کی ایک تنظیم کی سربراہ ماریا کرباسودا نے بھی اس مظاہرے

میں تقریر کی اور انکشاف کیا کہ جبراً بھرتی کیے گئے جوانوں سے فوج میں بیگار لی جاتی ہے ۔ وہ حقائق کے بارے میں زبان کھولتے ہوئے بھی خوف زدہ رہتے ہیں ۔ انھیں زد و کوب کیا جاتا ہے ۔ ان پر جنسی حملے کیے جاتے ہیں ۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ فوجیوں کی ماؤں کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنے بیٹوں کو کھانے پینے کی اشیا پہنچا سکیں جنھیں صرف ۱ء۶۰ روبل (2.60 ڈالر) کی قیمت کا کھانا یومیہ فراہم کیا جاتا ہے اور ماہانہ ۷ روبل (۱۱ء۳۴ ڈالر) تنخواہ دی جاتی ہے ۔

ولاڈیمیر سیووشن نے جو لینن ملٹری پولیٹیکل اکیڈمی کے ایک افسر ہیں ، ان الزامات کی تردید کی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ فوج میں جوانوں کو بہترین فرد بنانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ فوج سے سبک دوش ہونے کے بعد آزادانہ محنت و مشقت کی زندگی بسر کر سکیں ۔ دوسرے شہریوں کی طرح فوجی جوانوں کو بھی انصاف کے تمام حقوق حاصل ہیں ۔

دوسری طرف روسی اخبارات مختلف تصویر پیش کرتے ہیں ۔ اس کے اہم نکات یہ ہیں :

1 فوجی جوانوں کے قتل اور اذیت رسانی کا سلسلہ — لفٹننٹ شتوف نے گزشتہ اگست کے دوران ادبی جریدہ زونامیہ میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں انکشاف کیا ہے کہ ایک فوجی اپنی ملازمت کے دوسرے ہی سال "دادا" بن گیا ، چنانچہ اسے "منیجر" کی حیثیت سے فرائض انجام دینے پر لگا دیا گیا ۔

2 شتوف کا کہنا ہے کہ یہ نام نہاد "ہیزنگ" شدید اذیت رسانی کا دوسرا نام ہے ۔ ظاہر ہے ان کے ارد گرد ہتھیار تو موجود ہوتے ہی ہیں چنانچہ ایسے نوجوان فوجی بعض اوقات خود کو گولی مار کر اپنی اذیتوں کا خاتمہ کر لیتے ہیں ۔

3 ایسے فوجیوں کی بھی تعداد اچھی خاصی ہے جن کا ریکارڈ محکمہ پولیس میں موجود ہے ۔

4 اہم شخصیات کے بیٹوں کے لیے فوج میں خصوصی مراعات دی جاتی ہیں ۔

5 فوجی مشقیں اکثر غیر ضروری اور وقت ضائع کرنے والی ہوتی ہیں ۔

6 جونیئر فوجی افسروں کا معیار زندگی سرکاری طور پر اعلان کردہ غربت کی پست ترین سطح سے قریب ہے ۔

یہ مہم اتنی شدت اختیار کر گئی ہے کہ مسلح افواج اور کمیونسٹ پارٹی سنٹرل کمیٹی کی شاخوں نے ۶ ر جولائی ۱۹۸۹ء کو مشترکہ طور پر اخباری مضامین کی مذمت کی اور کہا کہ اس مہم کے ذریعہ سے مسلح افواج کی اتھارٹی ، فوجی ملازمت کے وقار اور فوج و عوام کے باہمی تعلق کو نقصان پہنچایا جارہا ہے ۔ ریڈ آرمی روس کی ایک طاقت ہے ۔ اس کے بارے میں اندرون روس جن تاثرات کا اظہار ہو رہا ہے اس کے دور رس نتائج پر نگاہ کرنی ضروری ہے ۔

جدوجہد کی داستانِ روس

ماسکو کے بعد اب میں روس کے دوسرے علاقوں میں جارہا ہوں ، اور اپنے ساتھ اس روزنامچے (سفرنامے) کے پڑھنے والوں کو بھی لے جارہا ہوں ۔ اس لیے مناسب ہے کہ ذرا روس میں نظام حکومت کو بھی سمجھ لیا جائے اور روس کے خط و خال سے آگاہی حاصل کر لی جائے ۔

روس دنیا کی دو عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک ہے ۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے ۔ مشرق سے مغرب تک اس کی لمبائی ۶۵۰۰ میل اور شمال سے جنوب چوڑائی ۱۸۰۰ سے ۲۳۰۰ میل تک ہے ۔ اس کی آبادی تقریباً ۲۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ہے ۔ روسی عوام ۱۷۰ سے زیادہ نسلوں پر مشتمل ہیں جو تقریباً ۱۰۰ زبانیں بولتے ہیں ، لیکن پورے روس میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان روسی ہے ۔ روس کی سب سے بڑی قوم سلاف ہے جو زیادہ تر آر ۔ ایس ۔ ایف ۔ ایس ۔ آر (رشیئن سوویت فیڈریٹڈ سوشلسٹ ریپبلک) ، یوکرین اور بائیلو رشیا (سفید رشیا) میں آباد ہے یہ روس کی کل آبادی کے ۷۰ فی صد پر مشتمل ہے ۔

تاریخ

۴۰۰ عیسوی کے زمانے میں سلاف قوم روس میں آباد ہونا شروع ہوئی ۔ روس

میں عیسائیت اس وقت آئی کہ جب کیف کے حکمران ولادیمیر نے ۹۸۹ء میں عیسائیت کو قبول کیا ۔ روسی عوام کے دلوں میں اس حکمران سے بڑی محبت ہے ۔ یہ پہلا عیسائی حکمران تھا جس نے اپنی حکومت (۹۸۰ ۔ ۱۰۱۵ء) کے دوران میں روس کی توسیع کی اور اس کو استحکام بخشا ۔ روسی حکمرانوں میں زار کا لقب پہلی بار شاہ ایوان چہارم (۱۵۳۰ ۔ ۱۵۸۴ء) نے ۱۵۴۷ء میں اختیار کیا ۔ روس میں زار بادشاہوں کا خاندان ۱۶۱۳ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء تک یعنی تین سو برس حکمران رہا ۔

روس میں اپنی تاریخ میں جو زبردست اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں ان میں سے تین قابل ذکر ہیں ۔ ۱۲۱۸ سے ۱۲۲۵ء میں چنگیز خان نے اور پھر ۱۲۳۷ سے ۱۲۴۰ء میں ان کے پوتے باتو خان وولگا عبور کر کے روس ، پولینڈ اور ہنگری کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۔ شہر تباہ کردیے ۔ لاتعداد آدمی قتل ہوئے ۔

دوسری بار نپولین نے ۱۸۱۲ء میں پانچ لاکھ افواج لے کر روس پر حملہ کردیا ، لیکن بہادر روسیوں نے اسے پسپائی پر مجبور کردیا اور وہ صرف تیس ہزار سپاہی بچا کر لے جاسکا ۔

تیسری بار دوسری جنگ عظیم اول کے دوران ۱۹۴۱ء میں ہٹلر نے روس پر زبردست حملہ کیا ۔ جگہ جگہ زبردست لڑائیاں ہوئیں ۔ بالاخر روسی بہادروں نے ڈٹ کر مقابلہ کرکے پیش قدمی کو روک دیا اور تمام اتحادیوں نے مل کر ہٹلر کو شکست فاش دی ۔

سیاسی تاریخ

زار روس کی تین سو سالہ بادشاہت میں ایسا فیوڈل نظام قائم ہوگیا جس سے غریب عوام نہایت عسرت اور مظلومیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے ۔ روس بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا ۔ اس میں امیروں اور جاگیرداروں ، پادریوں اور راہبوں کو بڑا اقتدار حاصل تھا ۔ انھوں نے کاشت کاروں کو موروثی مزارعین بنادیا ۔ وہ اپنے مالک اور زمین سے قانوناً چمٹے رہنے پر مجبور تھے ۔ انھیں پیداوار کا حصہ دینے کے

علاوہ مالکوں کے لیے بادشاہ کے لیے بیگار کرنی پڑتی تھی ۔ اس کے علاوہ بادشاہ ، امرا اور جاگیرداروں ، راہب خانوں اور گرجوں کو مقرر رقوم دینی پڑتی تھیں ۔ یہ بڑا ظالمانہ نظام تھا ۔ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی ۔

۲۲ ر جنوری ۱۹۰۵ء (۹ ر جنوری پرانے روسی کیلنڈر کے مطابق) کو سینٹ پیٹرزبرگ میں فوج نے مزدوروں پر گولی چلادی ۔ اس سے جگہ جگہ مزاحمتی مظاہرے ہونے لگے ، ہڑتالیں ہوئیں ۔ اگرچہ زار نکولاس نے منتخب پارلیمنٹ بنانے کا وعدہ کیا تھا ، لیکن عوام مطمئن نہ تھے اور یہ لاوا اندر ہی اندر ابلتا رہا ۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں زبردست انقلاب آیا ۔ انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء کے بعد یہ دنیا کا دوسرا بڑا انقلاب تھا ۔ بادشاہت کا تختہ الٹ دیا گیا ۔ موسکو میں انقلابیوں نے حکومت قائم کرلی ۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک کمیونسٹ کے مخالفین جگہ جگہ شورشیں کرتے اور کمیونسٹ انقلابی حکومت ان سے لڑتی رہی ۔ اس دور کو خانہ جنگی کا دور کہتے ہیں ۔ بالاخر لینن کو مکمل فتح حاصل ہوئی اور کمیونسٹ حکومت کا اقتدار قائم ہوگیا ۔

انتظام سلطنت

روس کا سرکاری نام یونین آف دی سوویت سوشلسٹ **ریپبلکس** ہے ۔ اس میں جو صوبے شامل ہیں انھیں ریپبلک کہا جاتا ہے ۔ اس لیے یہ ۱۵ **ریپبلکس** کا ایک وفاق ہے ۔ روس میں مندرجہ ذیل جمہوریائیں شامل ہیں ۔ ۲ سے ۱۵ تک ہر جمہوریہ کے نام کے ساتھ ایس ۔ ایس آر (یعنی سوویت سوشلسٹ ریپبلک آتا ہے):

ریپبلکس (جمہوریتیں)	صدر مقام
۱) رشین سوویت فیڈریٹیڈ سوشلسٹ ریپبلک	ماسکو
۲) یوکرین	کیف

۳)	کازکستان	الما اتا
۴)	بائلو رشیا (سفید رشیا)	منسک
۵)	ازبیکستان	تاشقند
۵۶)	جارجیا	تبلسی
۷)	آذر بائیجان	باکو
۸)	لتھوانیا	ولنیس
۹)	مولداویا	کیشی نیف
۱۰)	لیٹ ویا	ریگا
۱۱)	کرغیزیا	فرونز
۱۲)	تاجیکستان	دوشامبے
۱۳)	آرمینیہ	ایرے وان
۱۴)	ترکمانستان	اشقاباد
۱۵)	اسٹونیا	ٹالن

ان میں سے اسٹونیا ' لیٹ ویا اور لتھوانیا بحیرۂ بالٹک پر واقع ہیں۔

ان کے علاوہ کئی اوٹونومس (Autonomous) **ریپبلکس** ' اٹونومس اوبلاسٹ (ریجن) اور نیشنل اوکروگ (اضلاع) بھی ہیں جن میں خاص خاص علاقوں کو ترقی دینے کے لیے دستوری تحفظ دیا گیا ہے - یہ خصوصی علاقے جس ریپبلک میں واقع ہیں انھی میں شمار ہوتے ہیں۔

روس کی سیاسی جماعت

۱۹۱۷ء سے اب تک روس میں صرف ایک سیاسی جماعت رہی ہے جس کا نام کمیونسٹ پارٹی اوف دی سوویت یونین (CPSU) ہے۔ ملک بھر میں اس کے ۱۵ ملیون ارکان ہیں۔ گزشتہ ستر برس سے روس پر اسی کی حکومت ہے۔ تمام صوبوں اور مرکز کی حکومت کے تمام عہدوں پر اسی پارٹی کے ارکان حکمران ہیں۔

اس کی ایک سنٹرل کمیٹی ہے جس کے ۳۵۰ ارکان ہیں اور ان میں سے ایک گورننگ باڈی چنی گئی ہے جسے پولٹ بیورو کہتے ہیں۔ اس کے ۲۰ ارکان ہیں جن میں ۱۱ ممبروں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور ۹ ارکان کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ اب تک کمیونسٹ پارٹی کا سکریٹری جنرل روس میں سب سے زیادہ طاقت ور آدمی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ہر چار سال بعد کمیونسٹ پارٹی کی ایک آل یونین کنگرس ہوتی ہے جو ہنگامی صورت میں کسی وقت بھی بلائی جاسکتی ہے۔ کنگرس کے علاوہ اس پارٹی کی ایک کانفرنس بھی ہوتی ہے۔ یہ دنیا کی ایک نہایت منظم سیاسی جماعت ہے۔

سپریم سوویت

روسی زبان میں کونسل کو سوویت کہتے ہیں۔ چنانچہ سوویت کا سلسلہ گاؤں اور قصبے سے لے کر ریپبلک اور مرکز تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن مرکزی سپریم سوویت ملک کا اعلا ترین ادارہ ہے جو قانون سازی کا مجاز ہے۔ سپریم کورٹ کے ججوں کو مقرر کرتا ہے ' وزیروں کی کونسل اور پریزیڈیم (Presidium) کو چنتا ہے۔ اس کے تحت دو ایوان ہیں۔ ایک سوویت اوف دی یونین ہے جس میں ملک کی ہر تین لاکھ آبادی سے ایک نمائندہ منتخب ہوکر آتا ہے۔ دوسری سوویت اوف نیشینلیٹیز ہے جس میں ہر ریپبلک اور دیگر مخصوص علاقوں کے نمائندے شریک ہیں۔ پریزیڈیم گویا سپریم سوویت کی اسٹینڈنگ کمیٹی ہے۔ اس کے ۳۷ ارکان ہیں جو دونوں ایوانوں سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ اس کا چیئرمین روس کا صدر کہلاتا ہے ' لیکن انتظامی اختیارات وزیروں کی کونسل کو حاصل ہیں۔ وزیروں کی کونسل کا چیئرمین پریمیئر (وزیر اعظم) کہلاتا ہے۔ اس میں وفاقی وزرا کے علاوہ تمام **ریپبلکوں کے پریمیئر** (وزرائے اعلا) شامل ہوتے ہیں۔

جناب گورباچوف کا دور

جناب گورباچوف ۱۹۸۵ء میں اقتدار میں آئے۔ اس سے پہلے وہ پولٹ بیورو کے

ممبر تھے ۔ روس میں معیشت کے تمام وسائل مرکزی حکومت کے ماتحت تھے ۔ روس تیل ، کوئلے اور لوہے جیسے وسائل میں خود کفیل تھا ۔ روس میں ۲۰۸۰۰ اسٹیٹ فارم اور ۲۶۵۰۰ اجتماعی فارم قائم تھے ۔

لیکن ان تمام وسائل اور مرکزی کنٹرول کے باوجود روس کی معیشت ایک مقام پر آکر رک سی گئی تھی ۔ اگرچہ خروچیف ، کوسیجن ، برزنیف ، بڈگورنی جیسے طاقت ور لیڈروں نے اپنے اپنے دور اقتدار میں مختلف قسم کے منصوبے چلائے ، لیکن بہ حیثیت مجموعی روس کی معیشت جامد رہی اور کبھی مغربی معیشت کے مقابلے میں نہ آسکی ۔

انقلابی تبدیلیاں

۱۹۸۵ء میں جناب گورباچوف نے روسی صورت حال کے بارے میں اپنا تجزیہ ظاہر کیا اور ترقی کے لیے تجاویز پیش کیں ۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب تک روسی نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ لائی جائیں ، روس ترقی نہیں کرسکے گا ۔ انھوں نے اپریل ۱۹۸۵ء کی کمیونسٹ پارٹی کی پلینری میٹنگ ، جس میں تمام ارکان شامل ہوتے ہیں ، میں اپنا تجزیہ اور ترقی کی تجاویز پیش کیں ، پھر ۲۷ ویں پارٹی کانگرس میں اور پھر ۱۹ ویں پارٹی کانفرنس میں یہ تجاویز پیش کیں ۔ ان تینوں آرگنوں نے ان کی تجاویز کی حمایت کی ۔

پہلی تجویز " پرسترائیکا " ہے یعنی ملک کی سیاسی اور اقتصادی تعمیر نو ، دوسری گلاس نوسٹ (کھلاپن ۔ کشادگی) اور تیسری ڈیموکریٹائزیشن (جمہوری عمل) ۔ ظاہر ہے کہ ان تجاویز میں ملک کے پوری نظام کو نئے خطوط پر استوار کرنا مقصود ہے ۔ اس عظیم پروگرام کے تحت عوام کو اظہار رائے کی آزادی دی گئی ۔ ممکنہ طور پر سیاسی قیدیوں کو رہا کیا گیا ۔ نجی کاروبار کی گنجائش نکالی گئی ۔ نجی ملکیت کی ایک حد کے اندر اجازت دی گئی ۔ لوگوں کو اپنے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق چلنے کی آزادی دی گئی ۔ پارلیمانی نظام شروع کیا گیا ۔ ملک بھر میں مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۹ء میں کانگرس اوف دی پیپلز ڈپٹیز کے انتخاب کرائے گئے ۔ سپریم سوویت کی ہیئت بدل گئی ۔ انھی اصلاحات

میں افغانستان سے فوجوں کی واپسی کا مسئلہ بھی شامل ہے ۔

چرنوبل کا سانحہ

میں " موسکو نیوز " دیکھ رہا تھا تو مجھے اس میں چرنوبل سانحہ کے بارے میں ایک نوٹ ملا ۔ میں نے اس نوٹ کو غور سے پڑھا ۔ روس کے مقام چرنوبل میں واقع ایٹمی بجلی گھر کا حادثہ گزشتہ دنوں ہوا تھا وہ شاید اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ تھا ۔ اس حادثے کے نتیجے میں ایٹمی پلانٹ پر موجود کارکنوں اور اس کے ہلاکت خیز اثرات سے بعد میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ڈھائی سو تک پہنچ چکی ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ چرنوبل ایٹمی پاور پلانٹ کا یہ حادثہ دوسرے نقصانات کے علاوہ انسانی جانوں کے اتلاف کی صورت میں بھاری قیمت وصول کررہا ہے ۔ چنانچہ اب بھی نہیں کہا جاسکتا کہ مرنے والوں کی تعداد کہاں تک پہنچے گی ۔ اس عظیم حادثے کے متاثرین کے لیے روس میں ایک نئی تحریک شروع کی گئی ہے اور چرنوبل سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کردیا گیا ہے جس نے اپنا نصب العین " مدد اور تحفظ " قرار دیا ہے ۔ ہر شخص جو چرنوبل حادثے کے متاثرین سے ہمدردی اور ایسے حادثوں کی روک تھام سے دلچسپی رکھتا ہے وہ اس تنظیم کا رکن بن سکتا ہے ۔

چرنوبل سوسائٹی کے منتظمین اعلا وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایٹمی بجلی گھر کے سنگین حادثے کے اثرات و نتائج کا خاتمہ کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا ہے اور پہلی بار متعلقہ محکمے کی کوتاہیوں اور ظالمانہ رویے کے خلاف آواز اٹھائی ہے ۔ اب وہ ان اعلا سرکاری حکام کو الگ تھلگ اور لاتعلقی کا رویہ اختیار کرنے سے روکتے ہیں جن کی اپنی سوانح حیات کے دلائل و حقائق اعداد و شمار کی نفی کرتے ہیں ۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ انفرادی آوازیں حکام بالا کے دفاتر تک نہیں پہنچتیں البتہ عوام کی کسی تحریک پر کان نہ دھرنا اس سے بھی زیادہ خراب ہے ۔

سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جوہری توانائی سے بجلی پیدا کرنے کی انجینئرنگ کو پبلک کے موثر کنٹرول میں رکھا جائے جس میں ڈیزائن ، تعمیر اور ایٹمی سہولتوں کے

استعمال کا طریقہ کار شامل ہے ۔ اس سلسلے میں سوسائٹی نے ایٹمی بجلی گھروں میں تابکاری کی سطح پر پہلے ہی آزادانہ کنٹرول قائم کرلیا ہے ۔

لیکن سوسائٹی کے کام کا تعلق معاملے کے صرف تکنیکی پہلوؤں تک ہی محدود نہیں ۔ ایٹمی تعمیرات کے ایک ممتاز روسی انجینئر رابرٹ ٹلس کا، جو چرنوبل کی عمارت کی تعمیر میں بھی حصہ لے چکے ہیں، کہنا ہے کہ جو لوگ متاثرہ علاقوں میں رہتے تھے یا اب بھی وہیں مقیم ہیں ان کو اور خود سوسائٹی کے منتظمین کو بھی ماہرانہ طبی و مادی امداد نیز قانونی تحفظ کی ضرورت ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ سوسائٹی اعداد و شمار جمع کر رہی ہے تاکہ اس میں ان تمام لوگوں کو بھی شامل کیا جاسکے جو کسی نہ کسی طرح تابکاری سے متاثر ہوئے ہیں ۔ اس طریقہ کار سے ان لوگوں کی بھی مدد کرنا ممکن ہوجائے گا جنھیں تابکاری کے کسی دوسرے ذریعے سے نقصان پہنچا ہے ۔ ان میں جوہری توانائی کے مختلف مراکز پر کام کرنے والے، فوجی اور وہ باشندے شامل ہیں جو ایٹمی تجربات کے لیے مخصوص علاقوں سے متصل مقامات پر رہتے ہیں ۔ چرنوبل سوسائٹی کا ڈاک کا پتا یہ ہے: پوسٹ آفس بکس نمبر ۱۷ ۔ ۱۲۹۰۱۰ موسکو ۔

سوسائٹی ان دنوں اس بات پر غور کر رہی ہے کہ تابکاری سے متعلق ضروری معلومات عام کرنے اور اس ضمن میں عوام کی ناواقفیت دور کرنے کا کام کس طرح بہتر طور پر منظم کیا جاسکتا ہے ۔ سوسائٹی نے جدید ترین آلات تشخیص، دواؤں اور ڈوزی میٹر (Dosimeter) کی خریداری کے لیے دوسرے ممالک سے مذاکرات کا آغاز کردیا ہے ۔ یہ بھی طے پاچکا ہے کہ تابکاری سے شدید متاثر افراد کو علاج کے لیے بیرون ملک اور ایسے بچوں کو تفریح کے لیے صحت افزا مقامات پر بھیجا جائے گا ۔

میں یہ غور کرتا رہا کہ پاکستان میں بہ مقام کراچی ایک ایٹمی بجلی گھر ہے ۔ گزشتہ دنوں وہاں بھی کوئی حادثہ پیش آیا تھا ۔ چرنوبل حادثے کا سبب یقیناً کوئی سازش نہیں ہوسکتا، مگر میں ڈرتا ہوں کہ پاکستان میں تخریب کار کون سے کم ہیں ۔ ہمارے ہاں ہنود و یہود کے نمائندے بکثرت ہیں جن کے ایمان کی قیمت اب ٹکے برابر رہ گئی ہے ۔ کراچی کے ایٹمی بجلی گھر میں بھی کوئی حادثہ کبھی پیش آسکتا ہے ۔ میں اس خیال سے

لرز جاتا ہوں جب کوئی تخریب کار اس حد تک چلا جائے کہ مرگ انبوہ کا جشن پیدا کردے!

سخاروف --- روس کی ایک بیباک آواز

آج کی تمام دن کی جدوجہد کے بعد رات جب میں اپنے کمرے میں آیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ۔ تھکن غالب تھی ۔ مگر گرم پانی سے نیم غسل کے بعد طبیعت بحال ہوگئی ۔ میں نے نماز عشا ادا کی ۔ سعدیہ نماز ادا کرکے اپنے بستر پر لیٹتے ہی غائب ہوگئیں اور میں نے صوفے پر نیم دراز ہوکر آج کے تمام دن پر غور کرنا شروع کردیا ۔ ارادہ کیا کہ ٹیلی وژن کھول لوں ۔ مگر اس کی آواز تھکی ماندی سعدیہ کو بیدار کردے گی ۔ میں نے " زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے --- بج رہا ہے اور بے آواز ہے " کے اصول پر ٹیلی وژن کھول لیا ۔ آواز بند کردی ۔ مناظر دیکھتا رہا ۔ حالات روس پر غور کرتے کرتے اچانک میرا ذہن روس کی بے باک آواز سخاروف کی طرف منتقل ہوگیا ۔ آج صبح جو مہلک ہتھیار ریڈ آرمی پریڈ کے دوران دیکھے تھے ان کے بارے میں سخاروف صاحب کے خیالات سے میں آگاہ تھا ۔ نہ جانے کیوں خیال آیا کہ میخائل گوربا چوف کے لیے آج ایک سخاروف چاہیے ! چرنوبل حادثے پر غور نے میرا دھیان سخاروف صاحب کی طرف دوڑا دیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک روشن ضمیری اور منصفانہ آزاد خیال کو دبانے کا تعلق ہے، روس اور دیگر ایک پارٹی والے ممالک تو درکنار، بے شمار جمہوری ملکوں میں بھی اس پر پہرے بٹھائے جاتے رہے ہیں ۔ ایک زمانہ تھا کہ خود میرے پاکستان میں اس کی گرفت تھی ۔ اسی دور میں میرے دوست جناب جسٹس کیانی اس میدان کے بطل بن کر اٹھے ۔ وہ سیاسی آدمی نہ تھے، مگر اشاروں کنائیوں میں وہ وہ نکتے بیان کر گئے کہ سیاسی فلسفی دنگ رہ گئے ۔ ایک پارٹی والے ملک کی بات البتہ اور ہے ۔ وہاں ایک اور صرف ایک موقف کو جائز سمجھا جاتا ہے ۔ حکومت رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر رکھتی ہے ۔ اگر حق کہنے کی کوئی جسارت کرتا بھی ہے تو کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا ۔ اگر صاحب مرتبت شخص ہوتا ہے

تو اسے اپنے ماہی مراتب اور آرام و سکون کو پہلے ہی سے خدا حافظ کہہ دینا پڑتا ہے۔

آج کے روس میں جناب دمیتری وچ آندرے سخاروف روس کی قد آور شخصیتوں میں سے واحد ہستی ہیں جنھوں نے ایٹمی ٹیسٹوں کو ختم کرنے، ایٹمی جنگ کے امکانات کو دور کرنے، اختلاف رائے کے احترام اور حقوق انسانی کے لیے اپنے ضمیر کی آواز بڑی بے باکی سے بلند کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عالم گیر اصولوں کے لیے آواز بلند کرنا خود اپنے ملک اور پوری انسانیت پر احسان کرنے کے مترادف ہے۔ سخاروف روس کا مخالف نہیں، اس کا دوست ہے۔ سخاروف کی رگوں میں روسی وفاداری کا خون دوڑ رہا ہے۔ اب کہ جب گورباچوف جیسے جری لیڈر نے قوم کو گلاس نوسٹ (کھلے پن) اور پرسترائیکا (سیاسی اور اقتصادی تعمیر نو) کا نعرہ دیا ہے اور کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل اور صدر کی طاقتیں اپنی ذات میں مرکوز کرلی ہیں تو ان کو سخاروف کی سخت ضرورت ہے۔ خود اپنی بہتری اور روس کی بہتری کے لیے۔ بے پناہ طاقت کے ساتھ کشادگی کہیں سے کہیں لے جاسکتی ہے۔ یہ دانشوروں کے منھ سے نکلا ہوا حرف حق ہی ہے جو اسے صحیح سمت برقرار رکھنے میں مدد دے سکتا ہے۔

جناب سخاروف ۲۱ مئی ۱۹۲۱ء کو موسکو میں پیدا ہوئے۔ موسکو یونیورسٹی میں ۱۹۴۲ء میں طبیعیات میں گریجویشن کیا۔ یہ دوسری عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا۔ وہ دریائے وولگا کے کنارے ایک بڑی اسلحہ ساز فیکٹری میں کام کرنے لگے۔ جناب ایگور تام نے، جنھیں بعد میں نوبیل انعام ملا، ہائیڈروجن بم تیار کرنے والی ٹیم میں، اس جوہر قابل کو شامل کرلیا۔ جناب سخاروف نے ہائیڈروجن بم کی تیاری میں نمایاں کارنامہ سرانجام دیا۔ جلد ہی انھیں وہاں تمام مراعات حاصل ہوگئیں جو چند خوش قسمت حضرات کو ملتی ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں انھیں سائنسز اکیڈمی کا رکن بنایا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ برس تھی۔ اتنی کم عمری میں اس سے پہلے کوئی سائنس داں اس اکیڈمی کا رکن نہیں بنا تھا۔

اب ان کے سفر میں ایک موڑ آیا۔ ان کا ضمیر جاگ پڑا۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے کہا کہ بلند مرتبہ سائنس دانوں کو اسلحہ ساز کارخانوں میں نہیں لگانا چاہیے، اور ملک

کی دولت کو صرف اسلحہ اور تباہ کن اسلحہ پر صرف نہیں کرنا چاہیے۔

اگرچہ مغرب و مشرق کے بے شمار سائنس دانوں اور ارباب دانش نے اس بات کے خلاف آواز اٹھائی تھی، لیکن روس میں اس کی خاص اہمیت تھی۔ جناب برٹرینڈ رسل نے بھی برطانیہ کو ایسی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں جناب سخاروف نے وزیر اعظم جناب خروچیف سے اپیل کی کہ ایٹمی ٹیسٹ بند کردیے جائیں۔ اس موقع پر روس کے ارباب اختیار سے ان کی ایک کھلی ٹکر ہوگئی۔ یا تو وہ ہائیڈروجن بم کے موجدوں میں سر فہرست تھے یا اب اس کے سخت مخالف بن گئے۔ آئن شٹائن بھی ہیروشیما کے واقعے کے بعد ہمیشہ امن کا پرچار کرتے رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جناب خروچیف نے انھیں فہمائش کی کہ تحقیقی کام سے کام رکھیں اور روسی پالیسی میں ٹانگ نہ اڑائیں۔

بتدریج وہ اپنے موقف میں پختہ تر ہوتے گئے۔ ۱۹۶۸ میں انھوں نے روس۔امریکا بات چیت کی حمایت کی اور ۱۹۶۷ء کی اسرائیل عرب جنگ کے لیے خود روس ہی کو مورد الزام ٹھیرایا۔ اسی سال ان کی پہلی بیوی کلاڈیا کا کینسر سے انتقال ہوا۔ بعد میں انھوں نے ۱۹۶۹ میں لینن گراڈ کی ایک لیڈی ڈاکٹر بونر سے شادی کرلی۔ اس سے کچھ گھریلو مسائل پیدا ہوگئے۔ کلاڈیا کا لڑکا اور دو لڑکیاں اپنے باپ سے الگ ہوگئے۔

جناب سخاروف کی بیگم بونر سیاسی موقف میں ان کا ساتھ دینے لگی تھیں۔ ۱۹۷۰ء میں ایک غیر سرکاری حقوق انسانی کمیٹی قائم ہوئی تو دونوں میاں بیوی اس کے بانی ممبروں میں شامل تھے۔ اس کمیٹی کے کچھ ممبر شہربدر ہوئے، کچھ جیل بھیجے گئے، لیکن جناب سخاروف کے اعلا مقام کے پیش نظر انھیں نہ چھیڑا گیا۔

۱۹۷۳ء میں حکومت نے انھیں تنبیہہ کی کہ جس قسم کے بیانات وہ مغربی میڈیا کو دے رہے ہیں ان کی بنا پر وہ قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں انھوں نے افغانستان میں روس کی مداخلت پر سخت تنقید کی اور نتیجہ ۲۲ر جنوری ۱۹۸۰ء کو انھیں اپنے تمام اعزازات و القابات سے ہاتھ دھو کر موسکو سے ۴۰۰ کیلو میٹر دور "گورکی" میں نظربند ہونا پڑا۔ ان کی بیوی بونر کی بہو اور بونر کی

بیٹی بیرون ملک جانے کی خواہاں تھیں، انھیں اجازت نہیں مل رہی تھی۔ نومبر ۱۹۸۱ء میں میاں بیوی دونوں نے بھوک ہڑتال کردی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ بونر کی بہو اور بیٹی کو ویزا دیا جائے۔ بالآخر بونر کی بہو کو ویزا مل گیا۔ یہ بھوک ہڑتال سے بیمار ہوگئے تھے، انھیں ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔

۱۹۸۳ء میں پریس نے بونر پر بھی الزام لگایا کہ وہ سخاروف کو خلاف قانون کارروائیوں پر اکساتی ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں جناب سخاروف اپنی بیوی کو بغرض علاج روس سے باہر بھیجنا چاہتے تھے۔ انھیں اجازت نہیں مل رہی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر انھوں نے بھوک ہڑتال کی۔ اس بار ان کی بیوی کو بھی ان کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا اور مغرب سے ان کا تعلق بالکل منقطع ہوگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نظربندی کے دوران انھیں زبردستی ڈرگس دی گئیں اور بستر سے اٹھنے کی اجازت تک نہ دی گئی۔

حالات بدل رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں اچانک ان کے کمرے میں ایک ٹیلے فون لگا دیا گیا۔ جناب گورباچوف نے ان سے باتیں کیں، لیکن سخاروف نے ایک بار پھر سخت موقف اپنایا اور اپنی رہائی کے لیے یہ پیشگی شرط رکھی کہ تمام سیاسی قیدیوں کو پہلے رہا کیا جائے۔

رہائی ہوئی اور اس کے بعد جناب سخاروف نے جناب گورباچوف کی پالیسیوں کی بھرپور حمایت کی۔ کچھ عرصے بعد سائنسز اکیڈمی میں انھیں ان کی جگہ پر بحال کرکے اکیڈمی کی طرف سے نمائندگان عوام کی کانگرس (کانگرس آف پیپلز ڈپٹیز) کا رکن منتخب کرلیا گیا۔

جناب سخاروف ایٹمی نیستوں کو تکنیکی نقطہ نظر سے بے سود اور تاب کار مادے کے پھیلاؤ کے سلسلے میں مہلک سمجھتے تھے۔ وہ فوجی طاقت میں سبقت کی دوڑ کے خلاف تھے۔ وہ اسلحہ کے ارتکاز پر سخت معترض تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو شہری آزادی حاصل ہو، پریس آزاد ہو کیوں کہ آزاد شہریوں کی رائے عامہ ہی حکومت پر موثر کنٹرول کرسکتی ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں ان کی دلیرانہ کوششوں کے اعتراف میں انھیں ۱۹۷۵ء کا

نوبیل انعام برائے امن دیا گیا۔

روس ایک عظیم ملک ہے۔ اب جب کہ ستر برس کے بعد وہ گلاس نوسٹ (کھلے پن) اور پرسترائیکا (سیاسی اور اقتصادی تعمیر نو) پر عمل پیرا ہوچکا ہے تو اسے سخاروف جیسی شخصیتوں کی سخت ضرورت رہے گی۔ صرف روس ہی کو نہیں پاکستان کو بھی سخاروفوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے وطن عزیز کا آدھا حصہ سخاروفوں کے نہ ہونے کی وجہ سے چھن گیا ہے۔ قومی زندگی ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے ہر مسئلے کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ہر پہلو کے حامی پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس سے اختلاف رائے وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ اختلاف رائے جمہوری حکومت کا لازمی حصہ ہے بلکہ اس کا بنیادی طریق کار ہے۔ اصحاب اقتدار پر لازم ہے کہ وہ دوسروں کی رائے کو سنیں اور سمجھیں۔ ہاں اگر اختلاف رائے کا مقصود دنگا فساد اور اقتدار پر قبضہ ہو تو بات دوسری ہے۔ ہماری اسلامی ثقافت میں ایسا اختلاف جس کا مقصد معاشرے کی جڑوں کو مضبوط کرنا ہو، جس کا مقصد قوم کی سرفرازی ہو، وہ باعث رحمت قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ امت مسلمہ ہر شخص کو اور خاص طور پر ارباب عقل و دانش کو اس بات کا ذمہ دار ٹھیراتی ہے کہ وہ ہمہ وقت ماضی، حال اور مستقبل پر نظر رکھ کر قوم کو خوشحال تر اور مضبوط تر بنائیں۔ ہمارے ہاں تو مستقبل بھی دو ہیں ایک دنیاوی اور دوسرا اخروی۔ ارباب دانش دنیا کے لیے بھی اور آخرت کے لیے بھی جواب دہ ہیں۔ لیکن اظہار رائے کا مقصد اولی قوم کا مفاد ہونا چاہیے نہ کہ جلب زر اور طول اقتدار۔ مغرب کے لیے تو یہ ایک جمہوری تقاضا ہے اور ہمارے ہاں دینی تقاضا بھی ہے کہ حرف حق کہیں، لیکن صرف قوم کے مفاد میں اور اس بات کو ذہن نشین رکھ کر کہ اس کے لیے ہمیں آخرت میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اسی لیے میں نے یہ کہا ہے کہ ہمیں سخاروفوں کی ضرورت ہے۔

پرسترائیکا (PERESTROIKA)

پرسترائیکا ان دنوں روس کے نظام حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک نیا نظریہ

حیات روس ہے جو سرعت رفتار کے ساتھ روس کے نظام معاش و اقتصاد کو اپنے آغوش میں لے رہا ہے۔ پرسترائیکا کے مفکر جناب گورباچوف ہیں۔ وہ لینن ازم کے خط و خال سے پوری طرح واقف ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لینن ازم اور روس لازم ملزوم ہیں۔ پرسترائیکا کی سمت اس سے قطعی مختلف ہے۔ مگر میخائل گورباچوف اس حقیقت کو پوری گہرائیوں کے ساتھ جانتے ہیں کہ روسی قوم بہ حیثیت مجموعی ایک نظام نو کی طلب گار ہے۔ روس کے باہر مشرق مغرب میں جو طرز حیات ہے اور طریق زندگی ہے روس کو اس سے دور رکھنا اب ممکن نہیں رہا ہے اس لیے ایک فکر نو کی حاجت ہے۔ میخائل گورباچوف کی نظر پورے عمق کے ساتھ حالات عالم پر ہے اور وہ اپنے اقتدار سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر دنیا میں اپنے لیے ایک نیا اور ارفع مقام حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ وہ انسانی فطرت کے تابع ہیں۔ روس میں لینن انقلاب کے بعد اب ایک انقلاب نو کی وہ بنیادیں استوار کردینے پر کمربستہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس حقیقت سے خوب خوب آگاہ ہیں کہ پرسترائیکا کے بعد لینن ازم باقی نہیں رہے گی اور جب لینن ازم کا عدم ہوگا تو نہ صرف روس میں بلکہ پورے یورپ بالخصوص مشرقی یورپ میں انقلاب نو آئے گا اور وہ نوید آزادی ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس سے لے کر عشرہ ۱۹۸۰ء تک روس میں زبردست کمیونسٹ نظام رائج رہا ہے۔ زمین' تیل' دھاتیں' کوئلا' مکانات اور صنعتیں سب حکومت کی ملکیت میں رہی ہیں۔ کارکنوں اور انتظامیہ کو ایک محدود اجرت دی جاتی تھی جو ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔

حکومت کے زبردست کنٹرول اور ستر برس کے عرصے میں رائج ہونے والے مختلف منصوبوں اور اسکیموں کے باوجود پیداوار کی شرح سرمایہ دارانہ نظام والے ملکوں سے کم اور بہت کم تھی۔ روس میں بننے والی مصنوعات کا معیار ادنا تھا۔ لوگوں کا معیار زندگی بھی جمہوری یورپ اور مغربی دنیا سے خاصا پست تھا۔ روس کے عوام کو دنیا سے الگ تھلگ دباؤ میں رکھا گیا تھا۔ اگرچہ بعض لوگوں کو اس پس ماندگی کا احساس تھا لیکن کمیونسٹ پارٹی کے سخت دباؤ کی وجہ سے وہ جرات اظہار سے محروم

تھے۔

۱۹۸۵ء میں پہلی بار جناب گورباچوف نے ایک کتاب لکھ کر اور تقریریں کرکے اس حقیقت کا کھلے طور پر انکشاف کیا کہ روسی معیشت جس انداز میں چل رہی ہے' اس میں مزید ترقی نہیں ہوسکتی اور یہ کہ پرسترائیکا یعنی معیشت کی تشکیل نو ضروری ہے۔

جناب گورباچوف چوں کہ روس کے سب سے زیادہ طاقت ور ادارے پولٹ بیورو کے رکن تھے' اس لیے وہ معیشی پالیسی پر ان خیالات کا اظہار کرسکے۔ پولٹ بیورو اور روسی کمیونسٹ پارٹی میں اور بھی لوگ موجود تھے جو ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

معیشت کی تشکیل نو میں کمیونسٹ پارٹی کے بنیادی نظریات پر زد پڑتی تھی اس لیے اس تحریک کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا گیا۔ یہاں تک کہ فضا ایسی پیدا ہوگئی کہ خود کمیونسٹ پارٹی نے معیشت کی تشکیل نو کی اجازت دیدی۔ ایک حد تک زمین کی ملکیت کے حقوق اور اس پر کاشت کا اختیار لوگوں کو دیدیا گیا۔ سرکاری صنعت کے علاوہ پرائیویٹ صنعت اور کاربار کی اجازت دیدی گئی۔ اس طرح کئی اقدامات کیے گئے اور اب تو میں دیکھ رہا ہوں کہ مکمل سرمایہ دارانہ نظام روس میں رائج ہورہا ہے۔

گلاس نوسٹ اور جمہوریت کا عمل

پرسترائیکا (معیشت کی تشکیل) اس وقت تک موثر نہیں ہوسکتی جب تک وہ بندشیں دور نہ کردی جائیں جو کمیونسٹ پارٹی نے عائد کر رکھی تھیں۔ چناں چہ تنگ نظری یا سختی کے مقابلے میں کھلے پن (گلاسٹ نوسٹ) کو اپنایا گیا۔ لوگوں کو اظہار کی آزادی ملی۔ گرجے اور مسجدیں کھول دی گئیں۔ سیاسی قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کے لیے اتنا کچھ کافی نہ تھا اس لیے جمہوری عمل کو بھی اختیار کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کی اجارہ داری ختم کی گئی۔ کھلے انتخاب منعقد کرائے گئے۔ جمہوری اداروں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے عہدے دار انتخاب کے ذریعہ سے چنے

جاتے ہیں نیز ان میں اختلاف رائے کی اجازت ہوتی ہے ۔ یہ تمام عمل ۱۹۸۵ء سے لے کر اب تک بتدریج ہوتا چلا آیا ہے اور ابھی تک ہو رہا ہے ۔

چنانچہ سب سے پہلے معیشی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے پرسترائیکا کا جواز پیدا کیا گیا ۔ جب وہ قبول کرلیا گیا تو گلاس نوسٹ (کھلے پن) کا نظریہ پیش کیا گیا' کیوں کہ معیشت سخت پابندیوں میں نہیں بلکہ آزادی میں پنپتی ہے ۔ جب یہ بھی قابل قبول سمجھا گیا تو جمہوری عمل پیش کیا گیا کیوں کہ اس میں مطلق العنان حکومت کی گنجائش نہیں ہوتی ۔ اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے اور فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے ۔ آج کا روس ان انقلابات سے گزر رہا ہے جو فکر کے بعد اب عمل کی صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں ۔

پرسترائیکا کے راستے میں منفی سوچ

جب کہ ہم جانتے ہیں ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے تاریخ کا ایک نیا باب رقم کیا تھا اور اس کے ستر سال بعد روس کے صدر جناب گورباچوف کے تین پروگراموں گلاس نوسٹ (کھلے پن) ' پرسترائیکا (سیاسی و اقتصادی تعمیر نو) اور ڈیموکریٹائزیشن (جمہوریت لانے کے عمل) نے اس میں اضافہ کیا ہے ۔ ستر سال کے لگے بندھے نظام میں پہلی بار ایسی کایا پلٹ تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں جن کے پوری دنیا پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے ۔

روس اور دیگر کمیونسٹ ملکوں نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر اور بڑے خلوص سے اپنے نظام کو چلایا تھا مگر عشرۂ ۱۹۵۰ء ہی میں دنیا نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ روس کی معیشت ایک مقام پر رک گئی ہے ۔ وہ اپنے نقطہ انتہا (سچوریشن پوائنٹ) کو پہنچ گئی ہے یعنی اب اس میں مزید ترقی کی گنجائش نہیں رہی ۔ مزید تیس برس میں طرح طرح کی کوششیں کرلی گئیں ' لیکن اقتصادیات کسی لحاظ سے بھی مغرب کی سطح پر نہ پہنچ سکی ۔ چنانچہ ایک طویل تجربے کے بعد کمیونسٹ ممالک کے ارباب دانش نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اجتماعی نظام کے تحت سرکاری فارموں ' فیکٹریوں اور کاروباری اداروں کی

پیداوار اس لیے رک گئی ہے کہ لوگ زیادہ کام نہیں کرتے کیوں کہ انھیں کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہوتا ۔ حالیہ دور میں سب سے پہلے چین نے بڑی جسارت سے عشرۂ ۱۹۸۰ء میں ایک خاص حد تک نجی کاروبار کی اجازت دی ۔ پھر کیا ہوا کہ لوگ نجی کاروبار پر لوٹ پڑے ۔ انھوں نے دن رات ایک کرکے پیسہ کمانا شروع کردیا ۔ دیہات خالی ہونے لگے ۔ جہاں بھی لوگ کاروبار کی ترقی کی گنجائش سمجھتے وہاں چلے جاتے ۔ ایک تو دیہات میں زرعی پیداوار پر اثر پڑا ' دوسرے سرکاری پیداوار بھی متاثر ہوئی ۔ چنانچہ حکومت چین کو نجی کاروبار کو پھر قدرے دھیما کرنا پڑا ۔ صرف معیشی وجہ کی بنا پر نہیں بلکہ اس سے مغربی جمہوریت کو مقبولیت حاصل ہوگئی تھی ۔

اس سے قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ اگر لوگوں کو ذاتی فوائد حاصل کرنے کے مواقع دیے جائیں تو لوگ جان مار کر کام کرتے ہیں اور معیشی پیداوار بڑھ جاتی ہے ۔ چنانچہ روس میں جناب گورباچوف پہلے لیڈر ہیں جنھوں نے نجی کاروبار کو کواپریٹو (انجمن امداد باہمی) کے طریقے سے رائج کیا ۔ اس سے کئی قسم کے کام شروع ہوگئے اور جن لوگوں نے ہمت کرکے کسی کام کو اپنایا انھیں خاصا فائدہ ہونے لگا ۔

اس کے ساتھ روس میں ایک خاص حد تک نجی ملکیت اور کھلی اسٹاک مارکٹ کی بھی اجازت دی گئی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روس میں بعض اشیائے صرف کی راشن بندی ہوتی ہے اور صابن اور دوسری چیزوں خاص طور پر غذا کے لیے لمبی لمبی قطاریں لگتی ہیں ۔ لیکن ملک کی کچھ آبادی نے کواپریٹو نظام پر نہ صرف نکتہ چینی کی ہے بلکہ اس کو ناکام بنانے کی کوشش کی ہے ۔ اب تک اخبار و رسائل میں جو تجزیے آچکے ہیں ان کے مطابق ایک تو حکام کا طبقہ خود نجی کاروبار کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے کیوں کہ ان کو یہ خطرہ ہے کہ اس سے اقتدار پر ان کی اجارہ داری کم ہوجائے گی ۔ دوسرے خود سرکاری اداروں کو یہ محسوس ہوا ہے کہ ہم تو ایک مقررہ آؤٹ پٹ دیتے ہیں اور نجی کاروبار والے زیادہ آؤٹ پٹ دے رہے ہیں ۔ اس سے ایک تو ہماری پوزیشن خراب ہوگی دوسرے بہت زیادہ کام کرنا پڑے گا ۔

تیسری بات نفسیاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ روس کے کارکنوں کا ایک خاص طبقہ

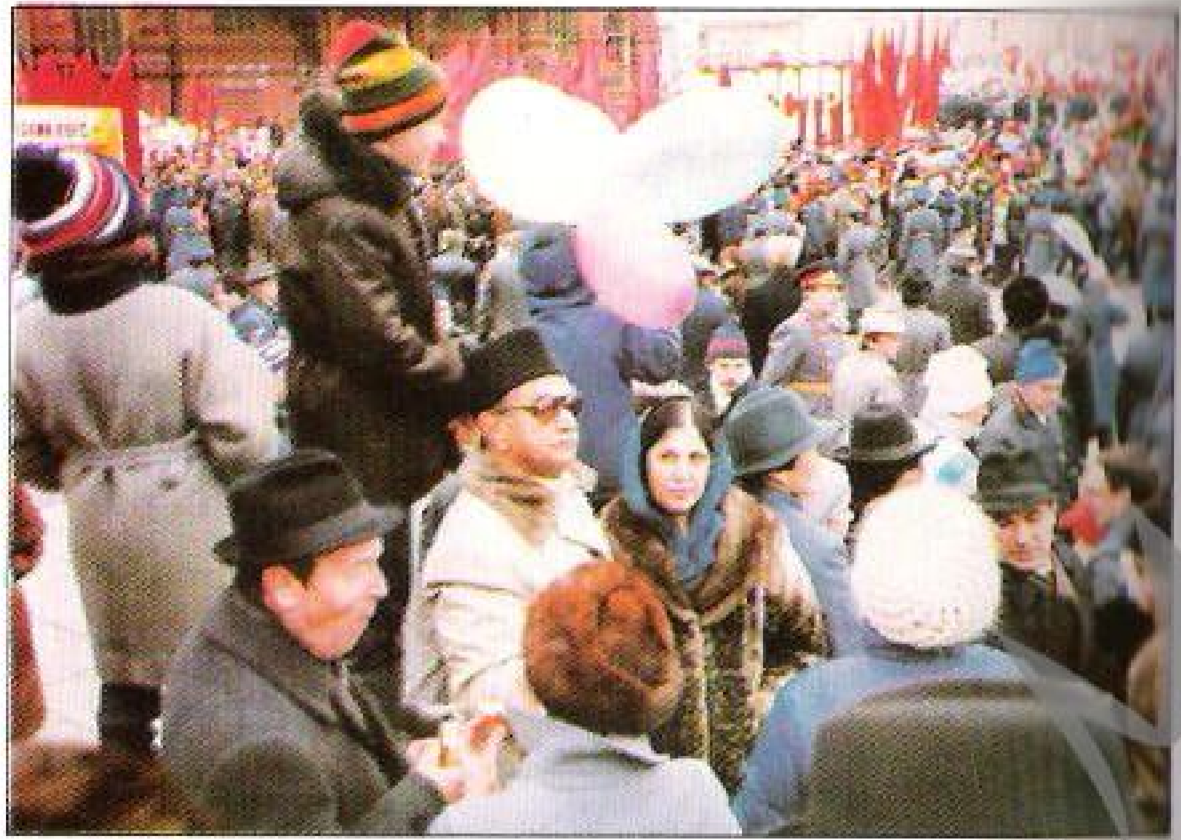
خاص طور پر ۴۵ اور ۵۰ برس کی عمر کے لوگ پرانے نظام کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ کسی اور فرد کی خوش حالی کو برداشت نہیں کرسکتے ۔ کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ جیسے ہم ہیں دوسرے بھی ویسے رہیں ۔ چنانچہ تجزیہ نگاروں نے اپنے مطالعات میں کہا ہے کہ جب نجی کاربار والا آدمی اپنی موٹر کار لے لیتا ہے یا اپنا ٹیلے فون لگوا لیتا ہے یا ڈرائیور رکھ لیتا ہے تو یہ لوگ ان سے جلتے ہیں اور دھمکی دیتے ہیں کہ ہم یہ جلادیں گے اور وہ جلادیں گے ۔ ایک عمر کی عادت کی وجہ سے اور جمود کی وجہ سے ان میں تبدیلی اختیار کرنے کی سکت نہیں جب کہ نوجوان طبقہ آگے بڑھنا چاہتا ہے اور ویسا ہی خوش حال بننا چاہتا ہے جیسے کہ یورپ کے لوگ ہیں ۔

نجی کاربار کی یہ لہر ہنگری اور مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی آگئی ہے ۔ ہر ملک اپنے اپنے طریقے سے اس کا انتظام کر رہا ہے ۔ مغرب نے جو اعداد و شمار دیے ہیں ان میں روس کے ۴۰ ملین لوگوں کی اوسط ماہانہ آمدنی ۱۱۲ ڈالر بتائی گئی ہے ۔ روس کا مقابلہ یورپ اور امریکا سے ہے اس لحاظ سے یہ آمدنی خاصی کم ہے ۔ اسی لیے جناب گورباچوف نے معیشت میں اس بنیادی تبدیلی کی اجازت دی تھی ۔

جہاں تک پرسترائیکا کے تصور کا تعلق ہے امریکا اور یورپ میں رائے عامہ اس کے حق میں ہے بلکہ حکومتوں نے بھی اسے کامیاب کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے ۔ اب اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار خود روس کے عوام پر ہے ۔

لیکن ایک بات قطعی ہے کہ منفی سوچ سخت نقصان دہ ہوتی ہے ۔ کوئی نظام بھی راتوں رات نہیں بدل جاتا ۔ اس کے لیے طویل سوچ بچار کی جاتی ہے ۔ اس پر عمل کرنے میں غلطیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ ان کی اصلاح کا عمل جاری رہتا ہے ۔ مستقل مزاجی اور استقامت بہرحال ضروری ہیں کہ وہی کامیابی کی ضامن ہیں ۔

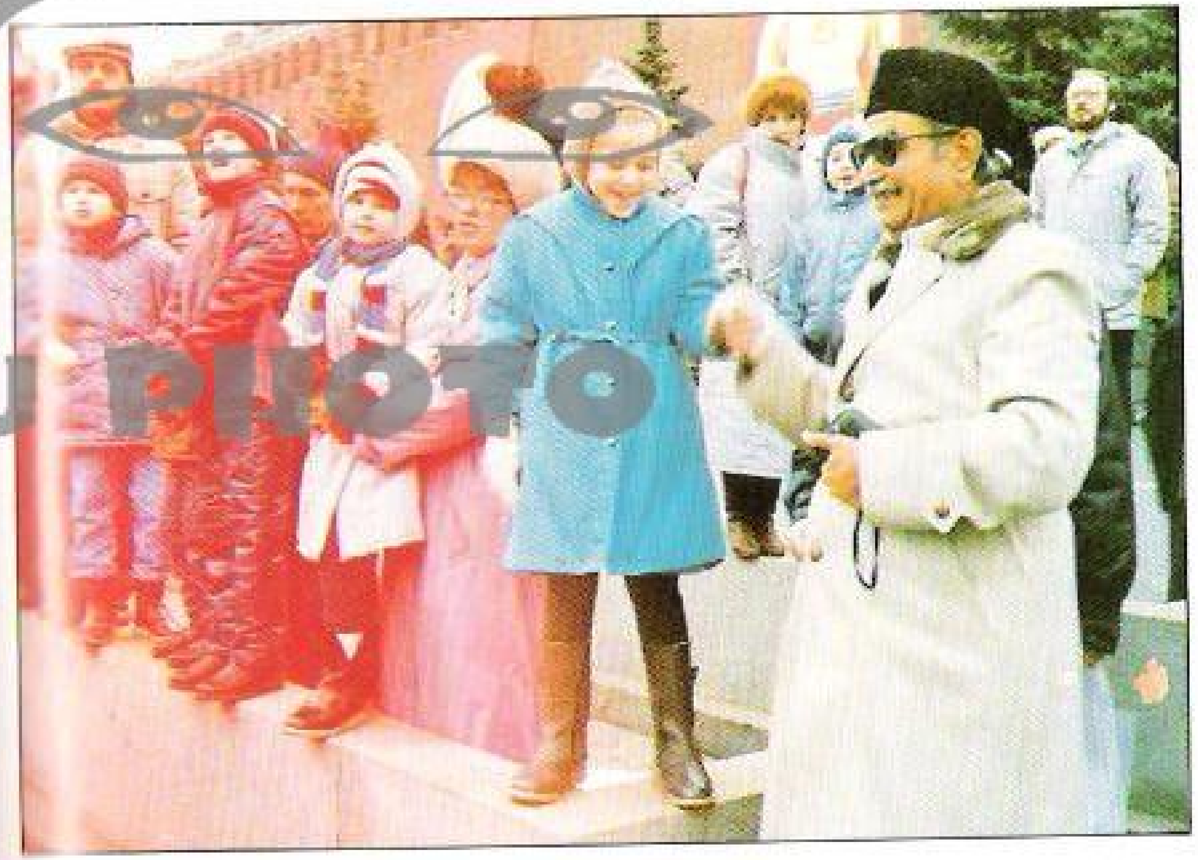
روس کے عوام کئی باتوں کے عادی ہوگئے ہیں ۔ ان کی عادت سے ذرا ہٹ کر کوئی بات ہو تو وہ پسند نہیں کرتے ۔ مثلاً روس میں ہمیشہ حکومت نے ہر جگہ قیمتوں کی سطح ایک رکھی ہے ۔ کواپریٹو کاربار میں کوئی ۶ یا ۷ فی صد قیمتیں بڑھی ہیں تو ان سے وہ سخت مضطرب اور مشتعل ہوئے ہیں ۔ جناب گورباچوف ہوں یا دنیا کا کوئی اور لیڈر





موسکو' روس ۔ ۷ نومبر ۱۹۹۱ء ۔ عظیم انقلاب روس کے جشن کے مناظر ۔





انقلاب روس کے جشن کے مناظر۔ نیچے ایک روسی بچی مصنف سے ہاتھ ملا رہی ہے

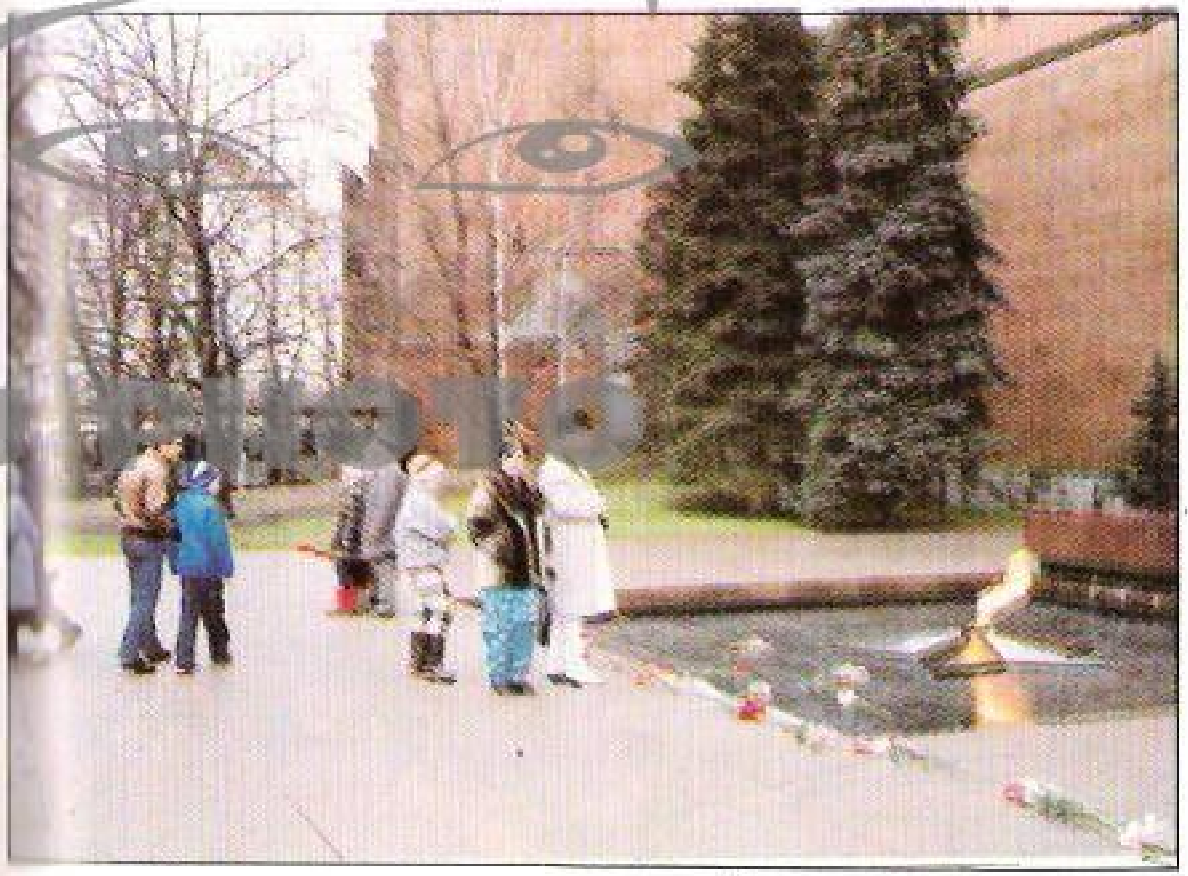




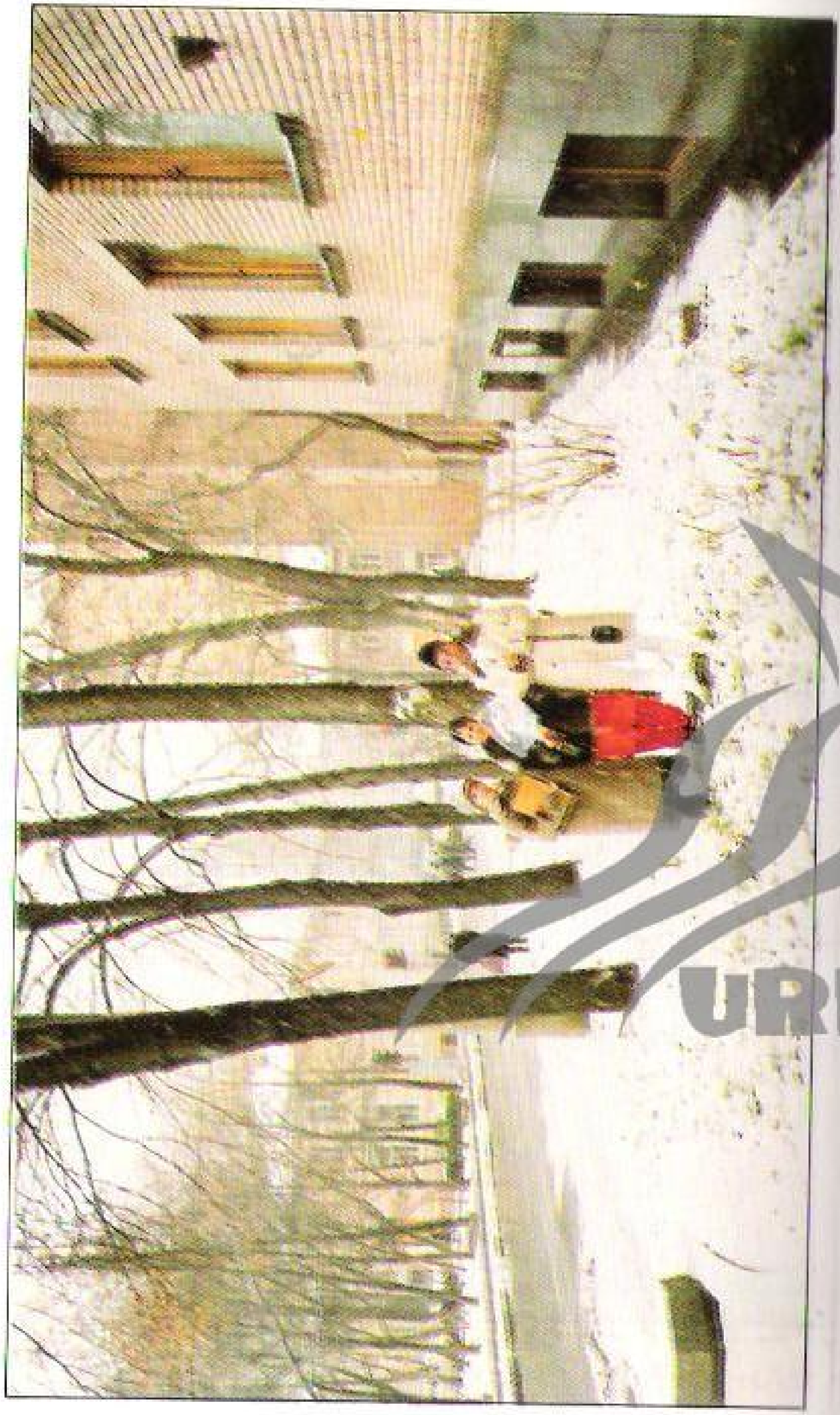
جشن انقلاب روس کے چند اور مناظر۔

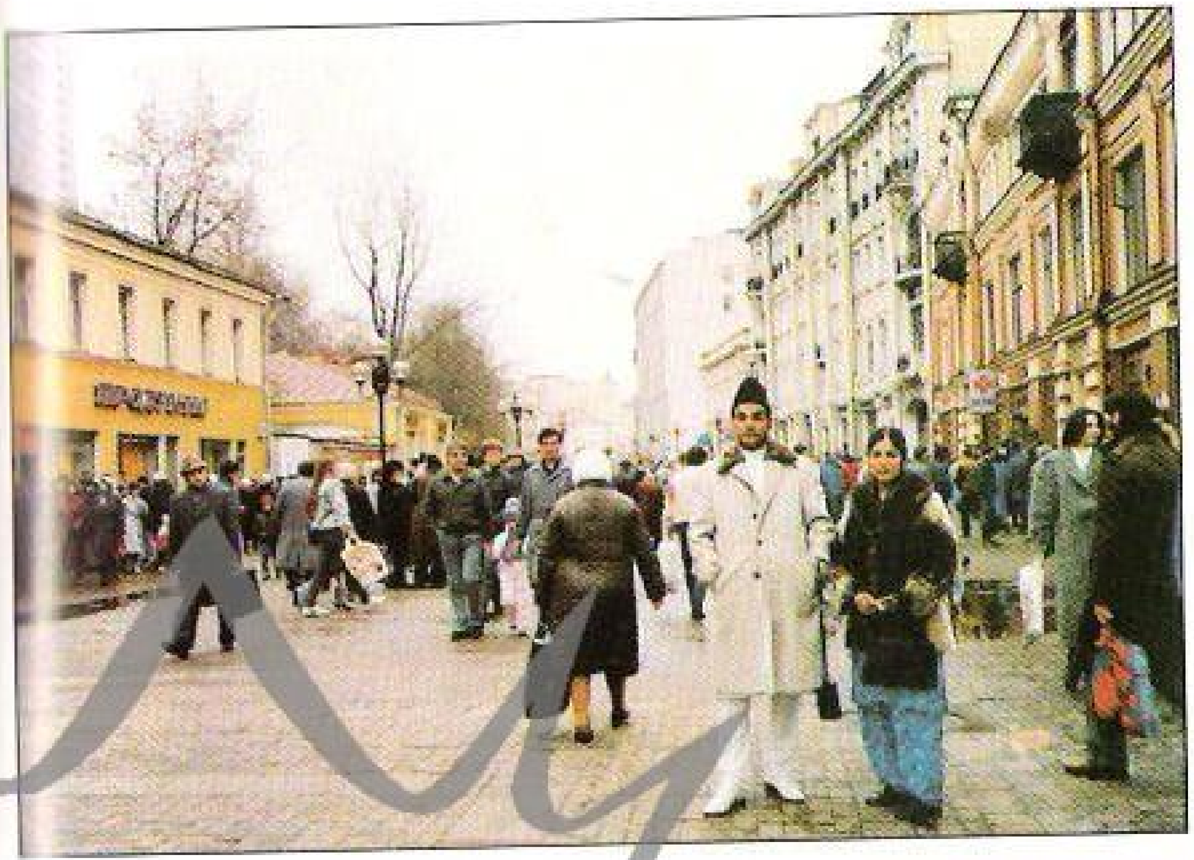


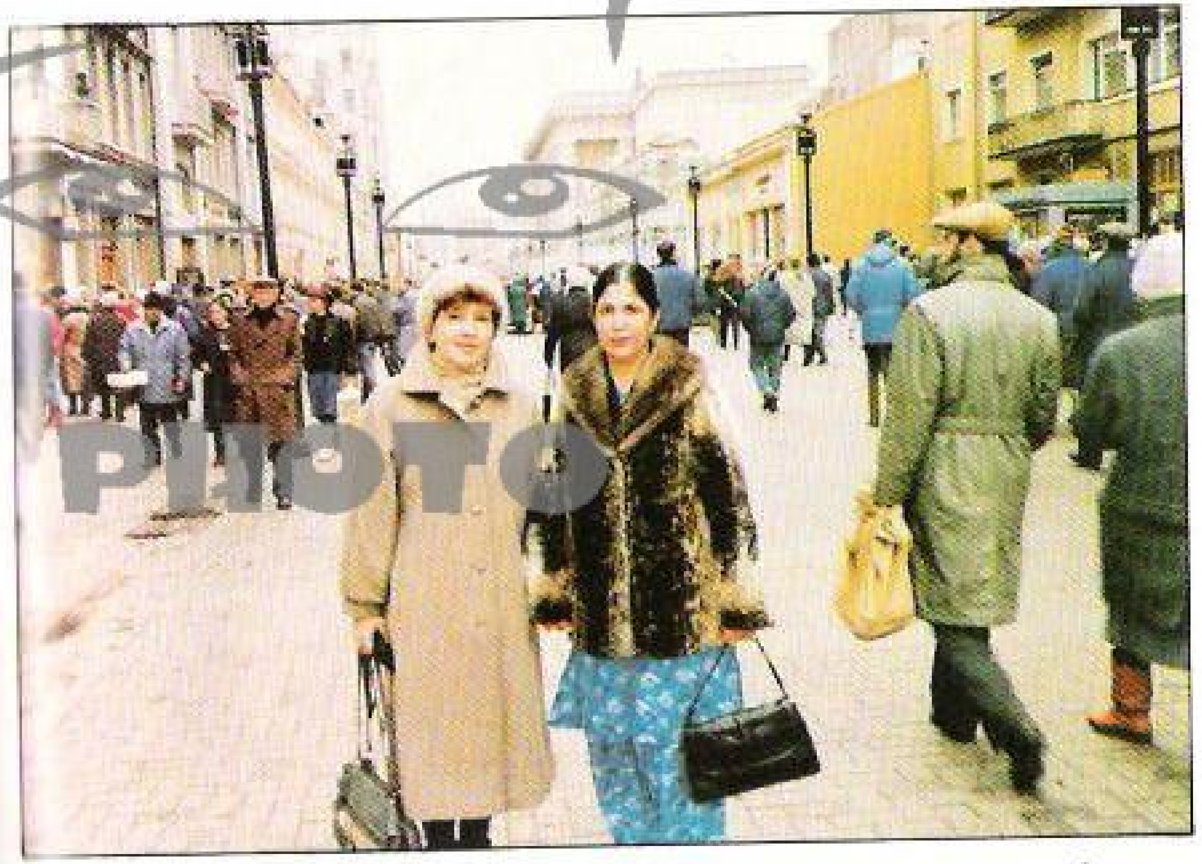
مصنف اور جناب گنادی اداریو' نائب صدر روس پاکستان دوستی ۔



موسکو ' لینن کی آرام گاہ پر عسکریوں کی یاد میں ایک شعلہ روشن ہے ۔ عقب میں
خراج عقیدت پیش کرنے والوں کی لمبی قطاریں ہیں ۔



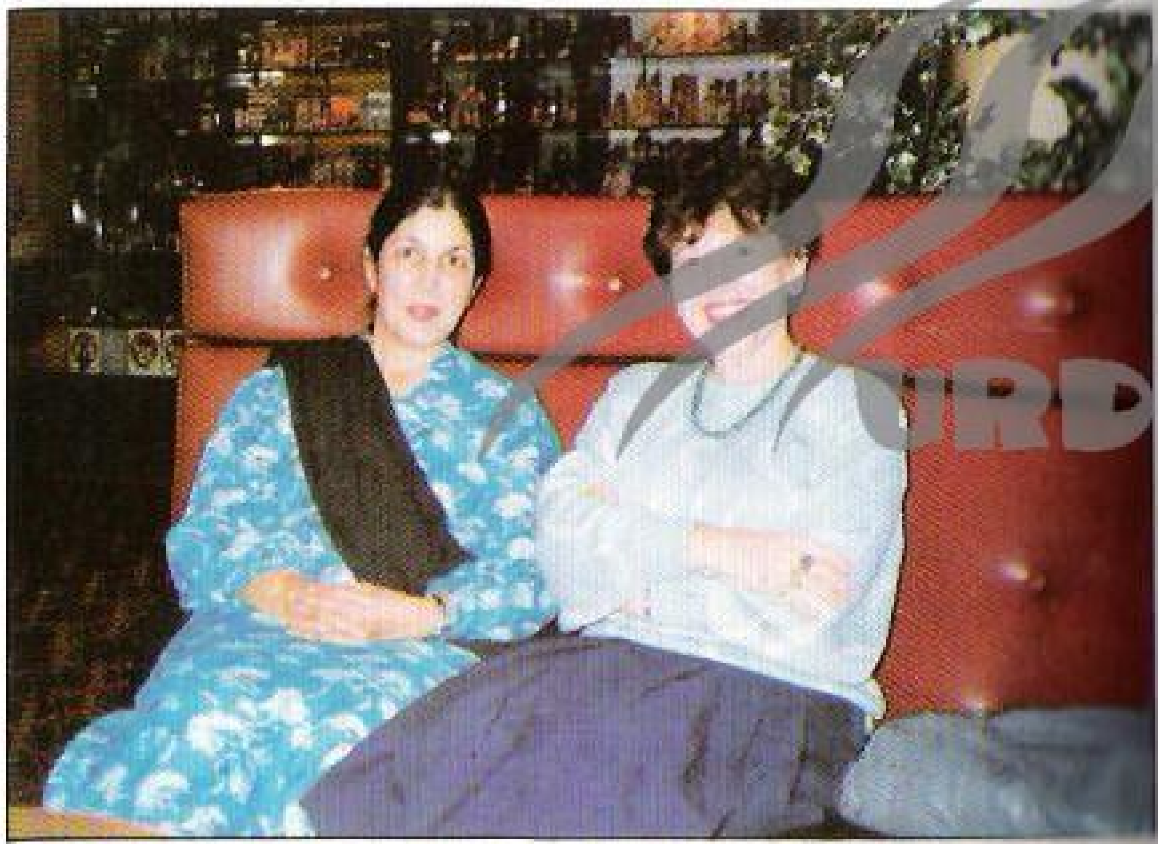




موسکو کا بازار ارباط - اس میں موٹریں وغیرہ ممنوع ہیں - کھانے پینے کے خوب انتظامات ، سرعام موسیقی اور دن رات رونق ہوتی ہے -



ارباط کا ایک اور منظر



دو سہیلیاں - اردو زبان میں ڈاکٹر اوف لٹریچر محترمہ لدمیلا واسی لیوا اور محترمہ سعدیہ -

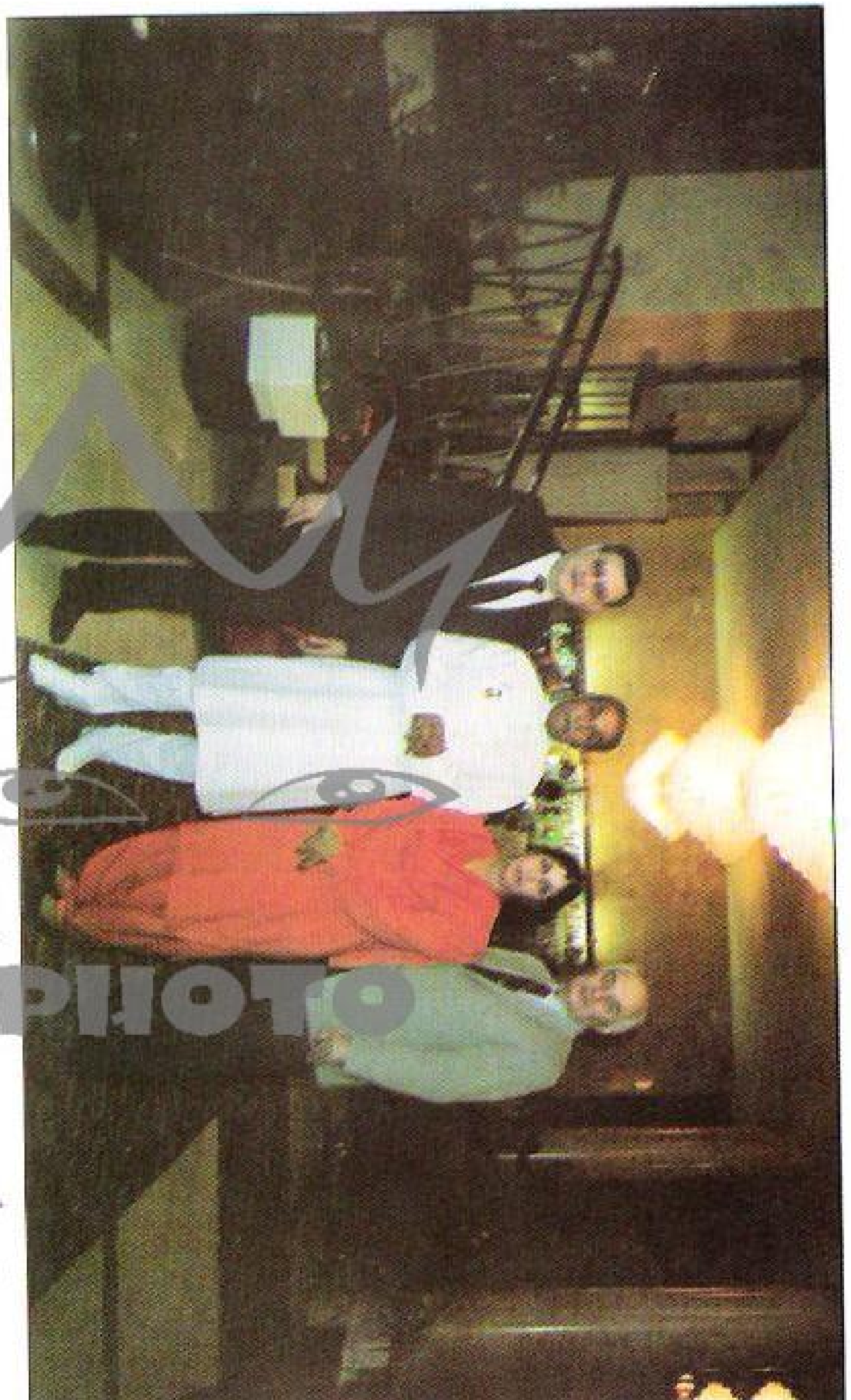


موسکو میں زیر زمین ریلوے کے ۱۹۹ اسٹیشن ہیں اور ہر اسٹیشن کسی علمی و ادبی روسی شخصیت سے معنون ہے۔ گویا ہر اسٹیشن ایک تاریخ ہے، میوزیم ہے۔ محترمہ سعدیہ ایک گاڑی میں بیٹھی ہیں۔





موسکو میں اپنے سفارت کدے پر عالی مرتبت سفیر کبیر پاکستان جناب محترم عبدالستار صاحب نے بہ اعزاز مصنف ایک عشائیہ مرتب فرمایا جس میں تعطیل کے دن حیرت انگیز طور پر روس کی وزارت خارجہ کے اہم افسران شریک ہوئے۔ موسکو میڈیکل ایسوسی ایشن کے جناب پروفیسر ڈاکٹر کزمیچوف تقریر کر رہے ہیں۔ نیچے ڈاکٹر کزمیچوف، جناب حکیم محمد سعید کے ساتھ۔



سربرآوردہ شخصیات روس - جناب پروفیسر گنگوا کی ، محترمہ سعدیہ ، مصنف ، جناب کیروف صدر روس پاکستان انجمن دوستی۔

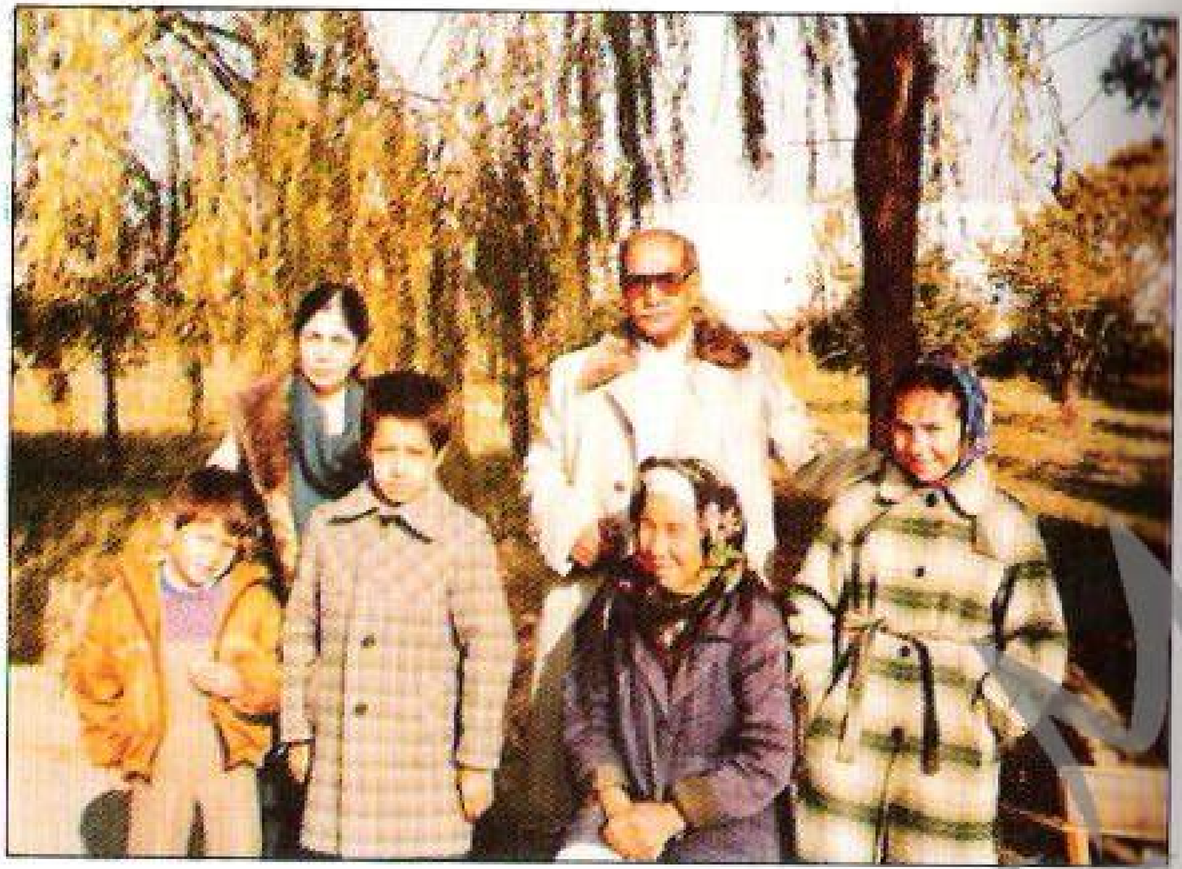


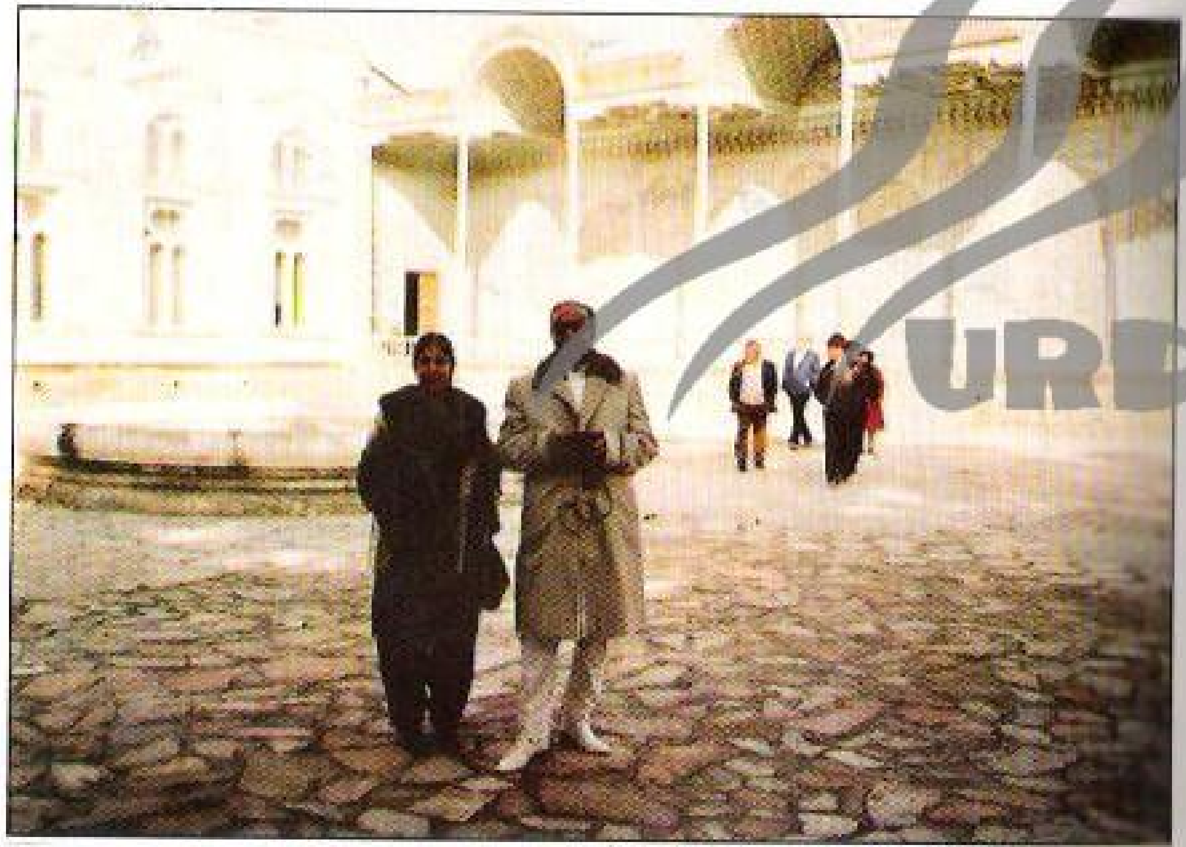


تاشقند میں ازبکستان کے وزیر صحت جناب محترم بہراموف سعید جلال محمودو وچ سے ایک روزہ طویل تبادل خیال - ہمدرد اور وزارت صحت ازبکستان کے مابین نباتات پر تحقیقات کے منصوبے کی تفصیلات اور معاہدات کے مناظر نیچے ، ظہرانے کی تصویر جس میں جناب وزیر صحت نے مصنف کے اعزاز میں ظہرانہ دیا۔

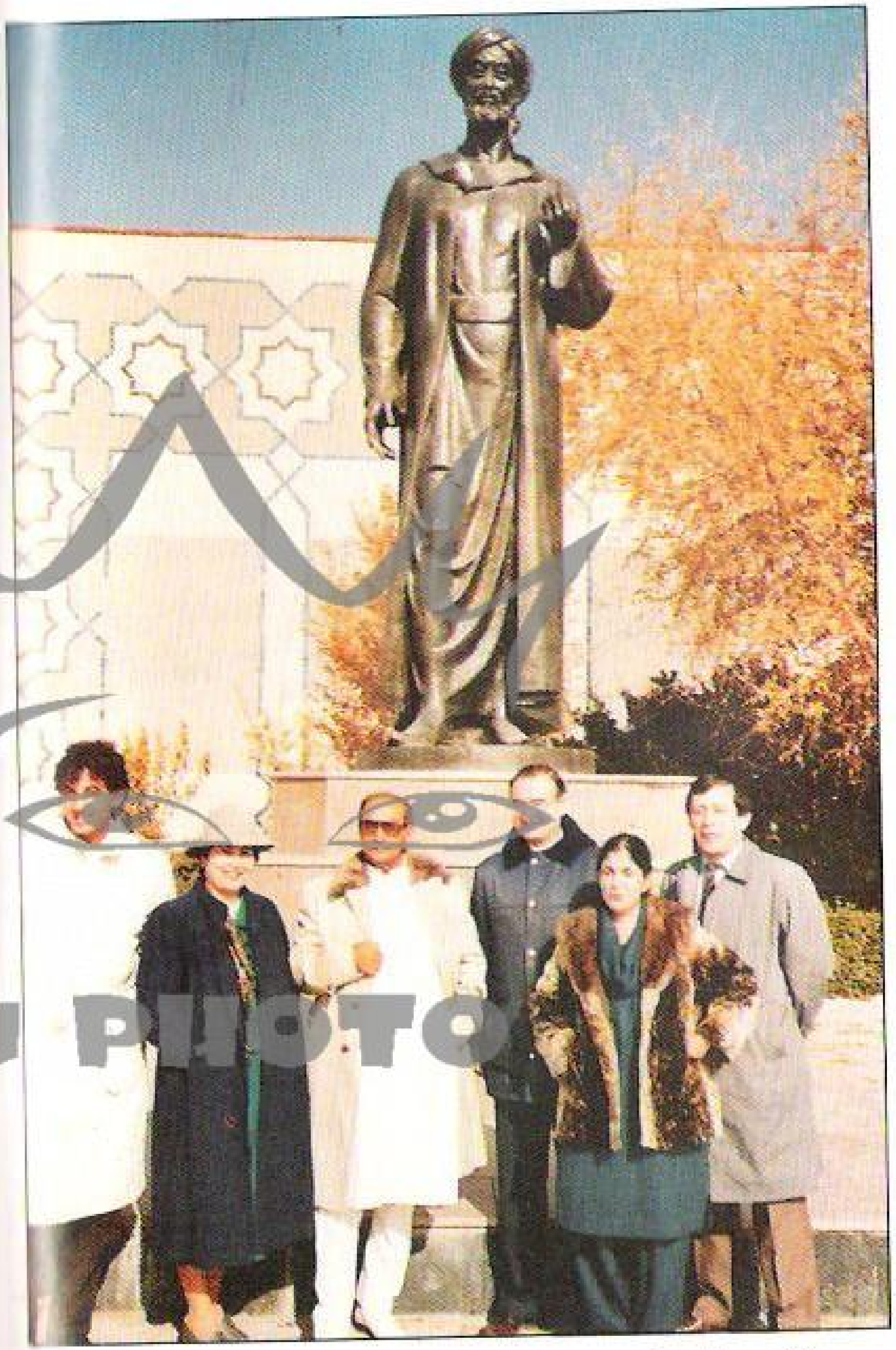


تاشقند یونی ورسٹی میں وائس ریکٹر جناب محترم ترسنوف لطیف ترسنوف سے تبادل خیال۔





اوپر، بخارا کے ایک دیہات میں۔ نیچے، بخارا میں امیر بخارا کے محل میں۔



مولد حکیم بوعلی ابن سینا 'افشانہ' بخارا میں ابن سینا میوزیم کا ایک منظر۔





ابن سینا میوزیم کے مناظر۔





محترمہ ڈاکٹر صباحت عظیم جانوفا صاحبہ، مغل شاہنشاہ بابر پر تحقیقات میں مصروف ہیں۔ تاشقند میں ان کے ساتھ ایک تبادلِ خیال۔

ہو وہ پرسترائیکا کو پکی پکائی چیز کے طور پر پیش نہیں کرسکتا۔ کھلی مارکیٹ میں سب کو مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی مارکیٹ کی مندی کو کبھی اشیا کی قلت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مخالفوں کے پروپاگنڈے کے مہلک اثرات سے بچنا ضروری ہے۔ ابلاغ کی دنیا ضرب تقسیم کے کھیل سے ایک اچھی سے اچھی اسکیم کو برا ثابت کردیتی ہے۔

یہ بات نظرانداز نہیں کرنی چاہیے کہ جناب گوربا چوف نے صرف ایک پروگرام نہیں، تین پروگرام دیے ہیں: کھلا پن، سیاسی و اقتصادی تعمیرِ نو اور جمہوریت۔ ان تینوں پر بیک وقت عمل کرنا ضروری ہے۔ تبدیلی فرد اور قوموں کی زندگی کا ایک لازمی عمل ہے۔ جس طرح گرم موسم کے بعد سرد موسم میں ہمارا لباس بدل جاتا ہے اس طرح سائنس اور ٹکنالوجی اور معیشت کے ساتھ طرزِ زندگی بھی بدلتا رہتا ہے۔

اب تک جس سوجھ بوجھ سے جناب گوربا چوف ان مسائل کو سلجھاتے رہے ہیں اور روس کے اربابِ دانش نے جس طرح ان تبدیلیوں کو خوش آمدید کہا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ روس ان مسائل کو بخیر و خوبی حل کرلے گا۔

۸ نومبر ۱۹۸۹ء --- موسکو سے تاشقند

آج ہماری روانگی موسکو سے تاشقند کے لیے ہے۔ صبح میں تو حسب معمول تیار ہوگیا مطالعہ کرتا رہا۔ مشکل درپیش یہ ہے کہ کوئی انگریزی اخبار نہیں مل رہا ہے۔ موسکو نیوز بھی نہیں ملا۔ اس قیام گاہ پر روسی زبان کے چار پانچ اخبار آتے ہیں۔ موسکو نیوز کے فرانسیسی اور عربی ایڈیشن بھی ہیں، مگر انگریزی نہیں ہے۔ درخواست کرنے پر بھی اہتمام نہ ہوسکا۔ اب ۱۸ نومبر کو موسکو سے کراچی روانہ ہوتے وقت سفارت پاکستان سے اخبارات جمع کروں گا۔ اگر میرا یہ روزنامچہ بہ حیثیت سفرنامہ چھپنا ہے تو مجھے تاثرات کے لیے روزانہ کے اخبارات کی خبروں کو دیکھنا ہوگا۔ آج میری بے چینی یہ ہے کہ کل جناب محترم میخائل گورباچوف صاحب نے جشن اکتوبر کے موقع پر کیا تقریر کی۔ پراودا وغیرہ اخبارات میں یہ تقریر چھپی ہے، مگر موسکو نیوز نہ کل ملا اور نہ آج۔ میں نے گنادی صاحب سے بھی بار بار کہا مگر وہ اس کو نہ جانے کیوں گول کرجاتے ہیں۔ موسکو نیوز کے علاوہ ہر چیز دینے پر قادر ہیں اور لمحہ لمحہ کا خیال کرتے ہیں۔ میں نے اردو کی مترجمہ محترمہ لدمیلا سے بھی موسکو نیوز کے لیے کہا ہے، مگر ان کی توجہ بھی اس طرف نہیں ہوسکی۔

لدمیلا صبح ۹ بجے ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے آگئی تھیں۔ آج سے ان کی ذمہ داریاں ختم ہوگئیں۔ اب وہ ۱۳ نومبر کو رات لینن گراڈ میں ہم سے ملیں گی۔ لینن گراڈ کا پورا پروگرام وہی مرتب کریں گی اور ہمارے ساتھ دو دن کے لیے موسکو آجائیں گی۔ تاشقند میں جناب محترم نش مرزا سمروف صاحب ہمارے مترجم ہوں گے۔

شہر سے ہوائی میدان پچاس منٹ میں پہنچ سکے۔ بہت ہی دور ہے! موسکو کا انٹرنیشنل ہوائی میدان دوسرا ہے۔ آج ہم اس ہوائی میدان آئے ہیں کہ جو اندرون ملک پروازوں کے لیے ہے۔ یہاں صفائی ستھرائی اور انتظامات پر وہ توجہ نہیں ہے کہ جو انٹرنیشنل ایرپورٹ پر ہے۔ اس باب میں حکومت روس کا مزاج نہایت سادہ ہے۔

یہاں ذات کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ ذاتی آرام اور آسائش کو یہاں زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ آج سے ۱۵ سال قبل جب میں نے اندرون ملک پروازوں میں سفر کیا تھا تو اس وقت تو ذات سے قطعی نفی کا ماحول تھا۔ ہوائی جہاز میں کمبل تک نہ تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ان دنوں موسکو سے دوشنبہ (دارالحکومت تاجیکستان) جاتے ہوئے راستے میں موسم سرد ملا۔ ایک بچہ سردی سے کانپ اٹھا۔ باپ نے اپنا کوٹ اتار کر بچے کو ڈھانپا تھا۔ ان دنوں لوگ خاموش تھے۔ بلکہ ایک دن موسکو میں میں نے مطالعہ کیا تھا اور میں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ اہل موسکو کی اکثریت کام سے کام رکھتی ہے۔ میں نے کسی ایک چہرے پر ان دنوں مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔ میں کوئی ہنستا ہوا چہرہ تلاش کرتا تھا۔ میں نے شاذ ہی ایسا دیکھا کہ میاں بیوی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے جا رہے ہوں۔ اگر ایسا تھا بھی تو دونوں میاں بیوی خاموش رہتے تھے۔ ان کے لباس نہایت سادہ ہوتے تھے۔ میں نے ان دنوں کسی خاتون کو بھڑکیلے کپڑے پہنے نہیں دیکھا تھا۔ اکثر کا لباس پرانا دھرانا پایا تھا۔ گھٹے ہوئے سانس نہ جانے کیسے رواں دواں تھے!

آج صورت حال یہ نہیں ہے۔ مرد عورت کے لباس تازہ ہوگئے ہیں۔ عورتوں کی پوشاکیں خوب صورت ہیں۔ بچے رنگ برنگ کپڑے پہنے ہیں۔ آج حالات گزشتہ پندرہ سولہ سال قبل کے حالات کے مقابلے میں یکسر بدل چکے ہیں۔

آج کے موسکو میں پہلے جیسی موت کی خاموشی نہیں ہے۔ آج موسکو ہنس رہا ہے۔ اسے اب مسکرانے اور ہنسنے کا حق حاصل ہے۔ سال ہائے ماسبق میں روس کے ہر فرد نے اپنی ذات کی نفی میں حکومت کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ موسکو کیا روس کا ہر انسان ایک انڈے کے لیے ترستا تھا اور ایک ڈبل روٹی کے لیے صبح سے دن تک قطاریں لگانی پڑتی تھیں۔ کھانے پر قدغن تھی۔ ایک سے زیادہ مکھن کی ٹکیا نہیں ملتی تھی۔ گوشت نہیں تھا حالانکہ سرد ملک میں جسم کو چربی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کپڑے بھی گرم نہ تھے۔ بس روٹی پر گزارا تھا۔ برس ہا برس تک روس کے ہر انسان نے اپنی ذات کی نفی کی ہے اور تعمیر روس میں بھرپور ساتھ دیا ہے۔ بالآخر ایثار

مسلسل نے تعمیر کا سامان کردیا ۔ روس دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا ۔ روسیوں نے سائکلوں پر چل کر اپنے کام نکالے ہیں ۔ انھوں نے نہ آرام وہ بسوں کا مطالبہ کیا اور نہ انھوں نے موٹر کاریں مانگیں ۔ رہنے کے لیے انھوں نے عالی شان مکان نہ کل مانگے تھے ' اور نہ آج ان کا کوئی ایسا مطالبہ ہے ۔

ایثار ذات کی سخت ترین اور اعلا ترین مثالوں کا خود میں نے بارہا روس میں مشاہدہ کیا ہے ۔ گھروں اور ہوٹلوں میں میں نے ماضی میں صابن کا توڑا دیکھا ہے ۔ قوم کے کسی بھی فرد نے اعلا صابن کا مطالبہ نہیں کیا ۔ آج بھی ہوٹلوں گھروں میں صابن کی کوئی اعلا قسم نہیں ہے ۔ جو صابن پندرہ سولہ سال پہلے تھا وہی آج بھی میسر ہے ۔ یہاں ہوٹلوں کے غسل خانوں میں درجنوں قسم کے تولیوں کا سامان نہیں ہے ۔ ایک لمبا پتلا تولیہ ملتا ہے جس سے کام نکالنا چاہیے ۔

اگر کسی درجے میں آج روسی خوش حال ہونا چاہتا ہے تو اسے آرام و آسائش کا حق حاصل ہے ۔ روس کے ہر فرد نے خواہ وہ موسکو میں ہو کہ لینن گراڈ میں ' تاشقند میں ہو یا سمرقند و بخارا میں ' اپنی ذات کو قربان کر دینے کی اعلا ترین مثالیں قائم کی ہیں۔ یہ ایثار اور قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ روس آج دنیا کی سب سے طاقت ور قوم ہے اور آج اندرون روس تعمیری سرگرمیاں بلندیوں پر ہیں ۔

ہوائی جہاز ساڑھے بارہ بجے موسکو انٹرنل ایرپورٹ سے اڑا اور اس کا رخ تاشقند کی طرف ہوگیا ۔ ہمارے لیے جہاز میں نشستیں مخصوص تھیں ۔ ہم ان پر بیٹھ گئے ۔ پرسوں ہی کی تو بات ہے کہ ہمارے پاکستان کے سفیر کبیر نے بتایا تھا کہ روس میں اندرون ملک پروازوں کے کرائے حیرت انگیز طور پر کم ہیں ۔ جس کرائے میں پاکستان میں ایک سفر ہوتا ہے اس کرائے میں اندرون روس چار سفر ہو جاتے ہیں ۔ ہم جس ہوائی جہاز میں بیٹھے ہیں وہ غالباً ڈی ۔ سی ٹن کے متوازی ہے ۔ شاید روس کا اپنا بنایا ہوا ہے ۔ اندرون جہاز ہر آسائش کے ساتھ سادگی ہے ۔

جہاز میں اعلانات شروع ہوئے اور میں مسرت آمیز حیرت میں رہ گیا کہ اعلان سے قبل اناؤنسر نے " السلام علیکم " کہا ۔ اس کے بعد پہلے روسی زبان میں اور پھر

فارسی اور فارسی سے بنائی ہوئی ازبکی زبان میں اعلانات کیے ۔ میں نے پہلے بھی اندرون روس سفر کیے ہیں ۔ دوشنبہ گیا ہوں اور سمرقند بھی ۔ جہازوں میں السلام علیکم پہلے کبھی نہیں سنا تھا ۔ یہ انقلاب فکر پرسترائیکا کے بعد آیا ہے جو روس میں انسان کو مذہبی آزادی بھی دیتا ہے ۔ یہ انداز فکر اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے ' اس پر گہرائیوں میں جاکر غور کرنا ضروری ہے ۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ روس میں ابھی وہ مرتبہ فکر قائم نہیں ہوا ہے کہ یہاں کا مسلمان ہر طرح آزاد ہوجائے ۔ روس کے اندرونی اور سیاسی حالات ہنوز اس آزادی کے حق میں نہیں ہیں ۔ " السلام علیکم " تسکین کے لیے ضرور ہے ' مگر یہ آزادی کا حق مانگنے کی اجازت شائد ابھی نہیں دیتے ۔

صبح میں نے ناشتہ نہیں کیا تھا ۔ مجھے انتظار تھا کہ جہاز میں کھانا ملے گا ۔ بالعموم اندرون ملک پروازوں میں روس میں تکلفات نہیں ہوتے ۔ پہلے تو یہ تھا کہ کم فاصلوں کے سفروں میں پانی تک نہیں دیا جاتا تھا ۔ ہمارا آج کا سفر نئے حالات میں ہے ۔ اس لیے دن کا کھانا دیا گیا ۔ مگر سعدیہ نے آج کے ہوائی جہاز کے کھانے کے لیے راتب کا لفظ استعمال کیا ۔ ہوا یہ کہ ہمارے سامنے رکھی گئی قابوں میں ایک ایک ٹکڑا بھنی مرغی کا ایک خاتون اول سے آخر تک رکھتی چلی گئیں ۔ پھر ڈبل روٹی بھی اسی انداز سے ملی ۔ یہ واقعی راتب کا انداز تھا ۔ میں تو اس سادگی پر واقعی مرگیا ۔ میں نے اس دنیا کی سوپر طاقت کے افراد کی عظمت فکر اور رفعت عمل کو سلام کیا ۔ داد دی کہ سادگی کا وتیرہ اختیار کر کے یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنتی چلی گئی ہے ۔

تاشقند کے ہوائی میدان پر

اعلان ہوا کہ تاشقند میں درجہ حرارت اس وقت چھے ڈگری سنٹی گریڈ ہے ۔ یعنی وہی موسم ہے کہ جو آج موسکو میں تھا ۔ سعدیہ نے کہا یہاں بھی سردی سے مقابلہ کرنا ہوگا ! خیال تھا کہ تاشقند میں سردی زیادہ نہیں ہوگی ۔ جناب گنادی صاحب ہمارے نگراں ہیں ۔ ہمارے ساتھ آئے ہیں اور باکو تک ہمارے ساتھ رہیں گے ۔ ان کے مشورے پر عمل کرنا پڑا اور مجھے اوورکوٹ پہننا پڑا ورنہ وہ جہاز سے اترنے کے

لیے گویا تیار نہ تھے۔ ہماری صحت اور عافیت بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ جہاز سے ہم اترے۔ سخت سرد ہواؤں کے تھپیڑوں نے ہمارا استقبال کیا۔ عمارت کے باہر دیکھا کہ ایک نہایت جانا بوجھا چہرہ ہے، مگر وہ مجھے پہچان نہیں رہا ہے!

میں جناب مرزا یوسف صاحب سے لپٹ گیا۔ بوس و کنار ہوا۔ انھوں نے اب مجھے پہچانا۔ انھیں تو سفید کپڑوں والا حکیم محمد سعید چاہیے تھا۔ کہنے لگے کہ نگاہیں سفید شیروانی کو جب تلاش نہ کر سکیں تو سفید پاجامے پر نظر گئی، مگر یقین نہ آیا تا آں کہ آپ بغل گیر ہو گئے!

واقعی میں نے سفید کپڑے اپنی پہچان قائم کر دی ہے۔ گزشتہ ۴۵ سال سے مسلسل سفید کپڑے پہن رہا ہوں، کوئی تبدیلی نہیں آنے دی ہے۔ اب تو یہ لباس دم واپسیں تک رہے گا۔ آخر کفن تو سفید ہو گا ہی!

موسکو میں ایک بار میں غیر ملکی ٹیلی گراف آفس گیا تھا۔ تار دے کر باہر آیا تو ایک امریکن نے مسکرا کر "ہائے" کہا۔ میں ٹھیر گیا۔ کہنے لگے کہ آپ کو میں نے واشنگٹن ڈی۔ سی میں دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں میں چیوی چیس ایریا میں کافی عرصہ رہا ہوں۔ انھوں نے اپنا تعارف کرایا۔ میں فیڈریشن اوف ورلڈ پرنز کا صدر ہوں۔ اپنا کارڈ بھی دیا۔ میں نے پوچھا "جناب، آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟" جواب تھا: "آپ کے سفید کپڑے!"

چین میں میں "وھائٹ مین" مشہور ہو۔ جاپان میں جاپان کے سب سے بڑے اخبار آشائی شمبوں میں ایک صفحے میں میرا انٹرویو شائع ہوا تو دوسرے دن لوگوں نے مجھے دیکھا اور پہچانا۔ جاپان کا یہ اخبار کوئی ستر پچھتر لاکھ روزانہ چھپتا ہے۔ انھوں نے مجھے انٹرویو کے لیے منتخب کیا۔ میں انٹرنیشنل کنگرس اوف ہسٹری اینڈ فلاسفی اوف سائنس میں شرکت کے لیے ٹوکیو گیا تھا۔ انھوں نے جب خطیر معاوضہ مجھے پیش کیا تو میں نے بند کا بند لفافہ شکریے کے ساتھ واپس کر دیا (جب کہ میرے دو ساتھیوں نے قبول کر لیا)۔ سوال تھا: کیا رقم کم ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے تو لفافہ کھولا تک نہیں ہے، مگر میں علم کی خدمت کا معاوضہ نہیں لیا کرتا!

ہمارے لیے انتظام ازبکستان ہوٹل میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کمرا اچھا ہو گا مگر جب میں اور سعدیہ اندر گئے تو کمرا واقعی بہت چھوٹا تھا۔ دو پلنگ پڑے تھے اور پھر جگہ ذرا باقی نہ تھی۔ اب میں تو کہہ چکا تھا کہ ہم ایک کمرے میں رہ لیں گے۔ ہم نے تین دن اسی کمرے میں گزار دیے۔ سعدیہ کو واقعی تکلیف ہوئی۔ مگر اس تکلیف کو بھول کر جب ہم نے اس پر غور کیا کہ کس طرح ہماری آؤ بھگت ہوئی ہے اور کس خلوص و انس کے ساتھ یہاں ہر شخص پیش آرہا ہے تو کمرے کی تکلیف غیر محسوس ہو گئی۔ یہ تکلیف خود ہم نے ہی قبول کی تھی، انھوں نے تو دو کمروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے میزبانوں کی کفایت کا خیال کیا تھا۔

اب یہاں تو رات تھی۔ موسکو اور تاشقند کے وقت میں تین گھنٹے کا فرق ہے۔ موسکو میں شام کے پانچ بجے تھے تاشقند میں رات کے آٹھ بجے تھے۔ ہم لوگ جلد ہی کھانے کے ہال میں آ گئے۔ جہاں نہایت شدید غل غپاڑہ تھا۔ ڈنر اور ڈانس ہو رہا تھا۔ ساز و آہنگ اور رقص و سرود اور پاپ میوزک نے کان کے پردے پھاڑ دیے۔ بس کھانا تو زہر مار ہی ہوا۔ ہم آپس میں بھی کوئی بات نہیں کر سکتے تھے۔ خیال تھا کہ تاشقند اس پاپ سے پاک ہو گا، مگر یہاں آکر اندازہ ہوا کہ یہ پاپ پاکستان کی طرح یہاں بھی گھس آیا ہے۔

میں نے کہا: اگر کھانے میں خالصتاً تاشقندی ڈشیں مل جائیں تو میں ضرور خوش ہوں گا۔ جناب محترم مرزا یوسف نے ایسا ہی انتظام کر دیا۔ گرم گرم نان ازبکستان آئے۔ عرصہ دراز سے یہ ایک رواج سا بن گیا ہے کہ قومی نانوں کے بغیر نہ تو دستر خوان سجتا اور نہ کوئی جشن یا تہوار منایا جاتا ہے۔ ازبک نانیں گول گول سی ہوتی ہیں جن کے سرے کچھ موٹے ہوتے ہیں اور درمیان میں پھول بنے ہوتے ہیں اور انھیں تلوں سے مزین کر کے آگ پر پکایا جاتا ہے۔ ان کا قطر ۲۰ سے ۵۰ سنٹی میٹر تک ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے مزدار اور خوب صورت نانیں وہ کلچے ہیں جنھیں تندور میں دہکتے ہوئے انگاروں پر پکایا جائے۔ لیکن کئی کئی منزلہ عمارتوں کے فلیٹوں میں رہنے والے شہری باشندے کہاں تندور لگائیں۔ تندور بالکونی میں لگنے سے تو رہا، اس

کے لیے صحن ہی چاہیے ۔ اسی لیے تمام شہروں اور دیہاتوں میں گیس سے کام کرنے والے ورکشاپ قائم کر دیے گئے ہیں جن میں مختلف ازبیک نانیں اور کلچے پکائے جاتے ہیں ۔

تاشقند کے ایک ایسے ورک شاپ کے سربراہ حکمت اکرام اوف نے بتایا : " ازبیکستان میں چالیس قسموں کے کلچے اور نانیں مشہور ہیں ۔ ہمارا ورکشاپ روزانہ چار قسموں یعنی شیریں نان ، مہمان نان ، سوتلی (دودھ والی) نان اور آبی نان کے تقریباً دو ہزار کلچے پکاتا ہے ۔ یہ قسمیں مزید یوں تقسیم ہوتی ہیں : سادہ میٹھی روغنی اور فطیری نانیں ۔ سادہ نان کی یہ قسمیں ہیں : آبی نان ، لاچرہ (چپاتی) ، آئی لا نان ، گیرڈہ نان ، کاشغری نان اور کلچہ نان جب کہ میٹھی روغنی نانوں کو یوں بانٹا جا سکتا ہے : مہمان نان ، شیریں نان ، شیرمائی نان (شیرمال) ، پختہ نان ، پیازلی نان (پیاز والی) ، خواجہ یا غلیک (روغنی) نان اور طوئی نان وغیرہ ۔"

نانیں تحفے کے طور پر بھی دی جا سکتی ہیں ۔ یہ خاص شکل کی اور بڑے سائز کی ہوتی ہیں ۔ زیادہ تر یہ فطیری روٹیاں ہیں ۔ ان کے اندر دنبے کی چربی ملائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کافی طویل عرصے تک محفوظ رہ سکتی ہیں ۔

ایک ازبیک ڈش " سومالاک " کھانے کو ملی ۔ سبحان اللہ خوب شے ہے ۔ ازبیک عوام کی تاریخ بہت سی حیرت انگیز روایات اور رسومات کے لیے بھی مشہور ہے ۔ ان میں قومی غذا " سومالاک " کو تیار کرنے کے طریقے بھی شامل ہیں جو نسل در نسل احتیاط کے ساتھ منتقل ہوتے آ رہے ہیں ۔ مجھے اسے پکاتے ہوئے دیکھنے کا موقع ملا بلکہ اسے تیار کرنے کے طریقے بھی تفصیل سے معلوم ہو گئے ۔ یہ کام آسان بھی ہے اور غیر معمولی بھی ۔ گیہوں کے دانوں کو اچھی طرح دھو لیا جاتا ہے اور پھر گیلے دانوں کو کینواس کے بورے میں ڈال کر قدرے گرم خانے میں رکھ دیا جاتا ہے ۔ لگاتار چار دن بورے کو پانی سے بھگویا جاتا اور پھولے ہوئے دانوں کو بورے سے نکال کر صاف ستھرے پلائی ووڈ پر پہلے سے ڈالی ہوئی مٹی پر پھیلا دیا جاتا ہے ۔ پھر روزانہ ۴ بار پانی چھڑکا جاتا ہے ۔ جوں ہی اکھوا ۴ یا ۵ سنٹی میٹر ہو جاتا ہے اسے کاٹ کر چوبی اوکھلی میں

خوب پیسا جاتا ہے ۔ حاصل ہونے والی چیز " میسہ " کو چھلنی کے ذریعے سے چھان لیا جاتا ہے ۔ اس کے رس کو الگ رکھ دیا جاتا اور باقی بچنے والے مواد کو پھر کئی بار پانی میں اچھی طرح دھویا جاتا اور دوبارہ چھلنی کے ذریعے سے چھانا جاتا ہے ۔ اس کے بعد گیہوں کے اس سارے رس کو دیگ میں انڈیلا جاتا اور اس کے اوپر آٹا اور گھی ڈالا جاتا ہے ۔ حاصل ہونے والے مادے " اتالا " (لیسی) کو خوب ابالا جاتا اور کھولتے ہوئے مادے کو مسلسل ہلاتے رہنا ضروری ہے ۔ دیگ کی تہ میں سے پتھروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے جو پکوان کو جلنے نہ دینے کے لیے خاص طور پر ڈالے جاتے ہیں ۔ زمانہ قدیم سے یہ رواج چلا آ رہا ہے کہ دیگ کے اطراف اکٹھا ہونے والی خواتین باری باری پکائے جانے والے سومالاک کو ہلاتی رہتی اور گانے گاتی ، باجے بجاتی اور ناچتی ہیں ۔

دیگ میں ابال آنے کے دس گھنٹے بعد صبح سویرے دیگ میں گیہوں کے اس رس کو جو " سانگ سووی " (آب سویرا) کہلاتا ہے ، انڈیلا جاتا ہے جو پہلی بار چھلنی کے ذریعے سے چھانا گیا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیگ میں بھورے رنگ کی دبیز لیسی جیسی شے حاصل ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد دیگ تلے سے آگ ہٹالی جاتی ہے ، اس کا ڈھکن کس کر بند کر دیا جاتا اور مزید ۳ تا ۴ گھنٹوں کے لیے رکھے رہنے دیا جاتا ہے لیجیے سومالاک تیار ہو گیا ہے جو ازبیکوں کا ایک مفید ترین اور حیاتین سے پر پکوان ہے ۔

ازبیکستان

ازبیکستان سوویٹ سوشلسٹ ریپبلک شمال میں دریائے سیر (سیحوں) اور جنوب میں دریائے آمو کے درمیان واقع ہے ۔ یہ روسی ترکستان کی باقی تمام ریپبلکوں سے بڑا ہے ۔ قرا کالپاک آٹونومس ریپبلک بھی اسی میں واقع ہے ۔ اس کا دارالحکومت تاشقند ہے اور سمرقند ، بخارا اور خیوہ اس کے دوسرے مشہور شہر ہیں ۔

اس کی آبادی ١٨٥ء١ ملین ہے (ایک کروڑ ٨٥ لاکھ) ۔ اس کے باشندوں میں ازبیک ، روسی ، تاتاری ، کازخی اور تاجیک شامل ہیں ۔ اس کے مغربی سرے پر بحیرہ

اراَل واقع ہے ۔ ازبکستان میں ایک بڑا ریگستان قزل قم ہے ۔ وادی فرغانہ جہاں ہندستان کے مغل شہنشاہ بابر پیدا ہوئے تھے ' ازبکستان میں ہے ۔

وادی فرغانہ اور دریائے زرافشاں کے کنارے کی زمین زرخیز ہے ۔ یہاں کی سب سے بڑی پیداوار روئی ہے ۔ اناج (جس میں چاول بھی شامل ہے) ' انگور ' خربوزے اور دیگر کئی پھل اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ خاص خاص نباتات میں اخبار کے سائز کے پتوں والی ریوند چینی ' ارغوانی پوست (خشخاش) ' زرد ایفیڈرا قابل ذکر ہیں ۔ یہاں کے جانوروں میں قابل ذکر ڈیڑھ میٹر لمبی چھپکلیاں ہیں ۔ بادام ' پستہ اور سیب کی کئی اقسام پیدا ہوتی ہیں ۔

یہاں چھٹی سے چوتھی صدی قبل مسیح میں دریاؤں کے کناروں پر خاصی آبادی تھی ۔ سکندر اعظم بھی اس علاقے کی شہرت سن کر وہاں پہنچا تھا ۔ چنگیز خاں کے عہد سے پہلے یہاں پر مقامی طور پر امرا کی ریاستیں قائم تھیں ۔ ۷ ویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام پہنچ چکا تھا ۔ ۱۰ ویں صدی عیسوی تک یہاں پر عرب اقتدار قائم رہا ۔ ۱۲۲۰ء میں اس تمام علاقے کو چنگیز خاں نے فتح کرکے اپنی سلطنت میں ملا لیا ۔ ۱۴ ویں صدی عیسوی میں اس پر تیموری خاندان کی حکومت قائم ہوئی ۔ بعد میں خیوہ ' بخارا اور کوکند میں الگ ریاستیں ابھریں ۔ تاشقند پر ۱۸۶۵ء میں اور سمرقند پر ۱۸۶۸ء میں روس کا قبضہ ہوا ۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس سے یہاں پورے طور پر روسی اقتدار قائم ہوا اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ازبکستان سوویٹ سوشلسٹ ریپبلک بن گیا ۔

روسی دور حکومت میں ازبکستان میں خاصی صنعتی ترقی ہوئی ہے ۔ یہاں مشینیں بنانے ' ایرکرافٹ تیار کرنے ' دھات کاری ' ٹریکٹر سازی ' کیمیکل بنانے ' گیس نکالنے ' تیل نکالنے ' بجلی کی موٹریں بنانے اور بجلی کا دیگر سامان بنانے کے کل ۱۳۰۰ کارخانے ہیں ۔

بخارا سے یورال تک ایک پائپ لائن بچھائی گئی ہے ۔ مبارک کے مقام سے گیس نکالی گئی ہے ۔ سیردریا پر ہائیڈرو الیکٹرک کمپلیکس بنائے گئے ہیں ۔ تاشقند ' سمرقند ' بخارا ' خیوہ کے علاوہ نئے صنعتی شہر زاں شول ' زرافشاں ' تخیا تاش اور

شہر بسائے گئے ہیں ۔ بعض پرانے شہروں مثلاً نوائی کو ترقی دی گئی ہے ۔

ازبکستان کے قدیم شہروں میں پانچ ہزار برس پرانی یادگاریں ہیں ۔ خود تاشقند شہر ۲۰۲۳ برس پرانا ہے ۔ بخارا کو کسی زمانے میں اسلام کا قلعہ سمجھا جاتا تھا ۔ سمرقند میں الغ بیگ کا مدرسہ اور شیردور اور طلاکاری نام کی عمارتیں واقع ہیں ۔ اس کمپلیکس کو ریگستان اسکوائر کا نام دیا گیا ہے ۔ ان کے علاوہ گورامیر (تیمور) اور مسجد بی بی خانم خاصی مشہور ہیں ۔ بخارا قدیم زمانے میں وسط ایشیا کی تجارت کا مرکز تھا ۔ یہاں کا کلیان مینار ' مدرسہ الغ بیگ اور مدرسہ عبدالعزیز خان مشہور ہیں ۔ خیوہ کی ۱۵۰۰ سالہ قدیم یادگار ایچان کالا مشہور ہے ۔ تاشقند میں سات استانیوں کا بازار قابل ذکر ہے ۔ یہاں ایک یونی ورسٹی قائم ہے جہاں ۱۹۰۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں ۔ یہ چشموں ' نہروں اور [illegible] جھیلوں کا شہر کہلاتا ہے ۔

سوویٹ یونین میں ازبکستان کو معیشی اقتبار سے خاصی اہمیت حاصل ہے ۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء میں یہاں سالانہ ۵۷۲۴ ہزار ٹن روئی پیدا ہوئی ہے ۔ ازبکستان میں ۸۶۰ اجتماعی فارم اور ۱۰۸۸ اسٹیٹ فارم ہیں ۔ ان کے علاوہ ۲۵۱ دیگر فارم ہیں ۔ ان فارموں میں بتایا گیا ہے کہ دو لاکھ ٹریکٹر کام کے لیے دستیاب ہیں ۔ ازبک اکیڈمی اوف سائنسز میں ہے ۔ ازبکستان کی زراعت اور معدنیات کے شعبوں میں تحقیق کام جاری ہے ۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہاں ایک مخطوطات کا انسٹی ٹیوٹ قائم ہے جس میں دس ہزار مخطوطے جمع ہیں ۔

۹ نومبر ۱۹۸۹ء --- جمعرات --- تاشقند

جناب محترم مرزا یوف صاحب ٹھیک پونے آٹھ بجے صبح آگئے ۔ میں ہوٹل لاؤنج میں ان کا منتظر تھا ۔ صبح دو گھنٹے تحریری جدوجہد کے بعد ہوٹل کے ماحول سے باہر نکلنا بڑا اچھا معلوم ہوا ۔ بڑی تازہ ہوا ہے ۔ موسم خوب سرد ہے ۔ باتیں کریں تو منھ سے بھانپیں نکلتی ہیں ۔ سانس لیں تو ناک سے دھواں نکل رہا ہے ۔ مگر مجھے یہ موسم پسند ہے ۔ آج مجھے آزادی ملی ہے ۔ میں نے اوورکوٹ اتار دیا ہے ۔ عادت نہیں ہے ۔ پہن کر عجیب سے لگتا ہے ۔ میں اپنے سفید کپڑوں میں ہوں ۔ مرزا یوف صاحب نے کہا: "ہاں ' اب حکیم محمد سعید صاحب سے ملاقات ہوئی ہے !"

جناب مرزا یوف صاحب کے ایک معمر دوست کا جواں سال بیٹا چار بچے چھوڑ کر داغ مفارقت دے گیا ۔ بظاہر حملہ قلب ہوا اور فرشتہ اجل نے روح قبض کرلی ۔ آج اس کا بیسواں ہے ۔ شب گزشتہ مرزا صاحب نے جب بتایا کہ وہ فاتحہ میں شرکت کرنے جائیں گے تو میں نے بھی شرکت کا فیصلہ کرلیا ۔ اب صبح آٹھ بجے ہم مرحوم کے گھر گئے ۔ ان کے معمر والد غم کی تصویر بنے کھڑے تھے اور فاتحہ کے لیے آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے ۔ لوگ ان سے گلے مل رہے تھے ۔ بوسے لے رہے تھے ۔ اظہار غم کر رہے تھے ۔ مگر اس سے غم کا پہاڑ جو ٹوٹا ہے اس کی کیسے تلافی ہوگی !

معلوم ہوا کہ بیسویں کی فاتحہ پر صرف مرد شریک ہوتے ہیں ۔ ہاں چالیسواں عورتوں کے لیے ہوتا ہے ۔ گھر کے ہر کمرے میں لوگ جمع تھے ' گھر کی انگنائی بھی لوگوں سے بھری ہوئی تھی ۔ انگنائی اور کمروں میں سب جگہ میزوں پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے ۔ لوگ میزوں کے آس پاس بیٹھ گئے ۔ ایک مولوی صاحب نے تلاوت قرآن حکیم کی ۔ پھر دعا کے لیے سب ہاتھ اٹھے ۔ اس کے بعد فوراً کھانا شروع ہوگیا ۔ کئی قسم کی روٹیاں ' پلاؤ ' کئی قسم کی ٹوفیاں ' بسکٹ وغیرہ تھے ۔ فواکہات

میں انگور ' سیب اور ناشپاتیاں تھیں ۔ گرم گرم چائے کی ایک ایک کیتلی ہر مہمان کے سامنے تھی ۔ پیالیاں تھیں ۔ گرم چائے موسم کے اعتبار سے موجب راحت تھی ۔ مجھے گرم چائے دیکھ کر گرمی کا احساس ہو رہا تھا ۔ میرے لیے تاشقند کا مشہور معدنی پانی تھا ۔ میں نے انگور کھائے اور پھر جناب مرزا یوف صاحب کے مشورے کے مطابق دل داری میزبان کے لیے گرم نرم پلاؤ کا ایک چمچہ بھی کھالیا ۔ پلاؤ بھی یہاں پیالیوں میں دیا جاتا ہے ۔ ہر شخص کے لیے ایک پیالی ۔

اور اب کھانے کے بعد تلاوت قرآن حکیم ہوئی ۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھے ۔ ایک بار تلاوت میں نے بھی کی اور مغفرت کے لیے دعا مانگی ۔ اسی انداز سے سلسلہ دعا جاری رہا ۔ برابر کے کمروں سے بھی تلاوت و دعا کی آوازیں آرہی تھیں ۔ لوگ آتے جارہے تھے ' جاتے جارہے تھے ۔ صبح سات بجے بعد نماز فجر سے یہ سلسلہ جاری تھا ' ۹ بجے تک یہ جاری تھا ۔ ہم تو آگئے ۔ شاید بعد میں یہ سلسلہ جاری رہا ہوگا ۔

جناب گنادی صاحب

یہ انجمن دوستی کے سرگرم رکن ہیں ۔ موسکو میں بھی ساتھ رہے اور اب تاشقند میں ہمارے ساتھ آئے ہیں اور ہماری میزبانی میں رات دن مصروف ہیں ۔ ہمہ دم ساتھ رہتے ہیں ۔ میں فاتحہ خوانی سے واپس آیا تو بے چینی سے ان کو منتظر پایا ۔ میں نے اپنا "وھیر اباؤٹ" بتایا کہ میں جناب مرزا یوف صاحب کے ساتھ گیا تھا ۔ ان کو اطمینان ہوگیا ۔ میں نے کہا کہ آپ اور سعدیہ ناشتا کریں ۔ میں تیار ہوکر آتا ہوں ۔ میں نے کپڑے تبدیل کرلیے اور چھانٹ کر سفید براق کپڑے زیب تن کیے ۔ جس لفٹ سے نیچے اترا اس میں تین ہندستانی بھی میرے ساتھ اترے ۔ میں نے فوری کہا : آپ حضرات نہرو کانفرنس کے لیے آئے ہیں ؟ صبح چار بجے اترے ہیں ؟ انھوں نے سمجھا کہ میں شاید کانفرنس کا منتظم ہوں ۔ میں نے وضاحت کردی کہ میں حکیم عبدالحمید صاحب ہمدرد انڈیا کا بھائی ہوں ! جواب تھا : اچھا ہمارے حکیم جی کے آپ بھائی ہیں ! وہ تو ہمارے ہندستان کے مشہور انسان ہیں !

جناب گنادی صاحب کا نام آج میں نے جنیدی کردیا ہے ۔ جنیدی کہنا میرے لیے آسان ہے ۔ مغربی روایت کے مطابق انھوں نے پوچھا: رات نیند کیسی آئی ۔ میں نے کہا کہ میں تو آرام سے ہوں ' مگر سعدیہ شاید سکڑ گئی ہیں ۔ کمرے میں ہیٹنگ سسٹم کام نہیں کر رہا ہے ۔ ٹمپریچر شاید مائنس تھا ۔ پھر گرم پانی نہیں ہے ۔ میں تو عادی ہوں ۔ ۵ بجے صبح ٹھنڈے پانی سے اطمینان سے غسل کرلیا ۔ سورج سات بجے طلوع ہوا ۔ مگر سعدیہ کے لیے گرم پانی نہ تھا ۔ ابھی ناشتہ یہ لوگ کر ہی رہے تھے کہ ۱۰ بج گئے ۔ موٹر کار آگئی اور ہم روانہ ہوگئے ۔

انجمن دوستی عالم ۔ ازبک برانچ

ہماری میزبانی انجمن دوستی عالم کے سپرد ہے ۔ ازبک شاخ کے دفتر ہم پہنچ گئے ۔ یہاں جناب محترم مرزا یوف صاحب موجود تھے ۔ انھوں نے استقبال کیا ۔ وزارت صحت کے جناب محترم ڈاکٹر اکرم نیلوف اور ان کی بیٹی وزیرہ بھی موجود تھی ۔ انجمن دوستی کی ازبک شاخ کے وہ کارکنان بھی تھے کہ جو شب گزشتہ ہوائی میدان ہمیں لینے آئے تھے ۔ دوران گفت گو جناب مرزا یوف صاحب نے بتایا کہ انجمن دوستی کی ازبیکستان شاخ کی نئی ڈائریکٹر کوئی نئی خاتون تین دن ہوئے کہ آئی ہیں اور ذمہ داری سنبھالی ہے ۔ شاید ہم اس وقت ان ہی سے ملنے آئے تھے ۔ مگر ہماری ملاقات پہلے محترمہ صباحت عظیم جانوفا صاحبہ سے ہوگئی ۔ جناب مرزا یوف صاحب نے ان سے ملایا ۔ معمر خاتون ہیں اور بابر پر تحقیقی کام کر رہی ہیں ۔ انھوں نے بڑے حوالہ جات جمع کیے ہیں ۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو تاشقند آئے تھے تو محترمہ صباحت صاحبہ کو انھوں نے بتایا تھا کہ بابر نامہ کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے ۔ محترمہ صباحت صاحبہ اسے دیکھنے لندن بھی گئیں ۔ مگر وہ نسخہ نامکمل نکلا ۔ بارے انھوں نے اپنی ریسرچ مکمل کرلی ہے اور کتاب چھپ گئی ۔ محترمہ نے بتایا کہ ان کی بابر پر اس کتاب کا فرانسیسی ترجمہ بھی ہوا ہے مگر وہ اب تک یونیسکو سے طبع نہیں ہوسکا ہے ۔ میں نے ان کو بتایا کہ یونیسکو کے مالی مسائل خاصے پیچیدہ ہیں ' اس لیے اس قسم کے

کام رکے ہوئے ہیں ۔ میں نے ان سے حوالہ مانگا ہے کہ شاید میں یونیسکو میں اس کے بارے میں معلوم کرسکوں ۔

یہ علمی گفت گو کوئی گھنٹہ بھر جاری رہی ۔ میں نے البیرونی اور ابن الہیثم پر اپنے کام کے بارے میں ان کو بتایا جس سے انھوں نے گہری دلچسپی لی ہے ۔ یہ آج ہی انکشاف ہوا ہے کہ ازبک اکیڈمی اوف سائنسز نے ایک " البیرونی پرائز " بھی قائم کیا ہے اور محترمہ صباحت عظیم جانوف البیرونی انعام یافتہ ہیں ۔ محترمہ صباحت عظیم جانوف انسٹی ٹیوٹ اوف اورینٹل اسٹڈیز ' ازبیکستان شاخ کی ڈائریکٹر رہی ہیں ۔ اب ریٹائر ہوکر تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں ۔ ہمایوں پر تحقیقی کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں ۔

گفت گو بڑی دل چسپ رہی ۔ مگر اسے ختم کرنا ہوا ۔ ہمیں اب ایک گھنٹہ تاشقند کی سیر کرنی تھی ۔ انجمن دوستی کی ازبک شاخ کی نئی ڈائریکٹر صاحبہ سے ملاقات نہ ہوئی ۔ میں نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا ۔ نہ مرزا یوف صاحب نے نہ میں نے کچھ کہا ۔ خاموش ہوگیا ۔ خود مجھے معلوم نہ تھا کہ ان سے وقت طے تھا یا نہیں ' اس لیے میں کوئی اظہار رائے نہیں کرنا چاہتا ۔ ہاں مجھے اس قدر ضرور معلوم ہے کہ جواں سال محترمہ موجود تھیں ۔

تاشقند

تاشقند ایک شہر قدیم ہے ۔ یہاں قدامت شہر کی باقیات موجود ہیں ۔ مگر اب یہ شہر بڑی تیزی کے ساتھ جدت کا لباس پہن رہا ہے ۔ فلک بوس عمارتیں یہاں وجود حاصل کر رہی ہیں ' ہوٹل ازبیکستان کی سولہ منزلیں ہیں ۔ ایک چوڑی سڑک کے بالکل بیچ میں ہوٹل ازبیکستان سے بلند تر " موسکو ہوٹل " کھڑا ہے ۔ نہایت تیزی کے ساتھ قدیم آبادیاں ختم ہو رہی ہیں اور بہ کثرت فلیٹ تعمیر ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔ پانچ منزلوں سے کم کوئی نہیں ' بلند تر موجود ہیں ' مگر نہایت دانش مندانہ منصوبہ بندی یہ ہے کہ فلیٹوں کے لیے علاقے متعین کر دیے گئے ہیں ۔ وہیں یہ تعمیرات

جاری ہیں اور لوگ پرانے مکانات چھوڑ کر نئی سہولتوں میں آ رہے ہیں۔ ان فلیٹوں میں روسی اور ازبیکی دونوں آباد ہو رہے ہیں۔ یہ امتزاج شاید سیاسی نوعیت رکھتا ہے۔ یہ دو تہذیبوں کے تال میل کی ایک کوشش ہے جس کا موثر ہونا یقینی ہے۔

بہ ایں ہمہ شہر قدیم بھی آباد ہے اور بہ کثرت ازبیکی شہر قدیم میں رہنا بھی پسند کرتے ہیں، اور وہیں اپنے حالات درست کر رہے ہیں۔ میں جناب مرزا یوسف صاحب کے ساتھ متعدد محلوں میں گیا۔ تنگ گلیاں ہیں جن کے مابین موریاں ہیں۔ محلوں میں بازار بھی ہیں اور دکانیں بھی۔ ان قدیم آبادیوں میں جدید سہولتیں موجود ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں کے لوگوں کو سہولتوں سے محروم کر کے ان کو جدید فلیٹوں میں جانے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہو۔ میں نے ایک آبادی میں دیکھا ہے کہ کسی قدیم نواب کا بڑا مکان اہل محلّہ کو سرکار نے دے دیا ہے اور اہل محلّہ نے اس نواب حویلی کو جامع مسجد بنا لیا ہے۔ تعمیر جاری ہے۔

میں نے قدیم محلوں میں مساجد بکثرت پائی ہیں۔ پنج وقتہ نمازیں باجماعت ہوتی ہیں مگر جدید آبادیوں میں میں نے اب تک کوئی مسجد نہیں دیکھی ہے۔ یہ چیز قابل غور ہے۔ ایک مجسمہ میری توجہ کا مرکز بنا۔ یہ اس خاتون کا بت بلند مجسمہ ہے جس نے تاشقند میں پردے کے خلاف بغاوت کی تھی اور اپنا برقع اتار کر پھینک دیا تھا۔ اس خاتون کا مجسمہ بنا دیا گیا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ اس مجسمہ سازی کا اثر ان لوگوں نے کیا لیا ہے جو ہنوز پردے کے قائل ہیں اور اپنی خواتین کو حدود میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ مجسمہ ایک بغاوت مسلسل کا آئینہ دار ہے۔ اس کی تعمیر اہل ازبیکستان کی پسند نہیں ہو سکتی!

داستان گو بخشیوں کی یادگار

ازبیکستان کو متمول تمدن ماضی ورثے میں ملا ہے۔ اس کا ثبوت قدیم حجری عہد کی ثقافت ہے جو جمہوریہ ازبیکستان کے جنوب میں واقع بائے سون جھیل کے علاقے میں رائج تھی۔ عظیم تمدنی مراکز بخارا اور سمرقند ۹ ویں تا ۱۵ ویں صدی میں ساماتی، قارا

خانی اور تیموری سلطنتوں کے پائے تخت بھی رہ چکے ہیں۔

ازبیک عوام نے اپنی صدیوں پرانی تاریخ میں بیرونی حملہ آوروں سے غیر مصالحانہ جد و جہد اور ساتھ ہی ساتھ فن تعمیر کے شاہکاروں کو قائم کرتے ہوئے فروغ و زوال دونوں باتیں بھی برداشت کیں۔ انھوں نے پل اور شاہراہیں تعمیر کیں، غیر مزروعہ اراضیوں کو قابل کاشت بنا کر کپاس اگائی اور زبانی ادب کے نمونے یعنی داستانیں جن میں مادر وطن کے حمایتی سورماؤں کے شاندار کارناموں کے گن گائے گئے، جادوئی طاقت رکھنے والے افسانے، ہجو و ظرافت کی کہانیاں نیز شوخ اور غمگین تقریباتی نغمات تخلیق کیے۔

رزمیہ شاعری ہمیشہ سے عوام کی آن بان اور ذہانت کا آئینہ رہی۔ اس نے ان کی اخلاقی نشو و نما میں مدد دی، ان کی تاریخی یاد داشت ثابت ہوئی اور زندگی کو گہری معنویت بخشی۔

ماہ نامہ "سوویت ازبیکستان" ازبیکوں کی رزمیہ شاعری کی متنوع اصناف کے متعلق مضامین کی اشاعت شروع کر رہا ہے۔ پہلا مضمون داستانوں سے منسوب ہے۔

ازبیک رزمیہ شاعری ان گنت داستانوں (طویل نظموں) پر مشتمل ہے اور ان میں بہادرانہ داستانیں (الپامیش)، رومانی داستانیں (گور اوغلی، کون توغ میش، شیریں و آرزو گل، طاہر و زہرہ)، تاریخی داستانیں (شیبانی خان، کون باتیر)، جنگ نامے (یوسف و احمد، علی بیگ و بلی بیگ) اور بالآخر لوک داستانیں (فرہاد و شیریں، شہزادے صنوبر کی سرگزشت) وغیرہ شامل ہیں۔

قوی برجستہ گو شاعروں اور بخشیوں جن کو بسا اوقات "داستانچی" بھی کہا جاتا تھا، کے پورے کے پورے اسکول وجود میں آئے ہیں۔ ان میں بولون غور، نور آتا، جمعہ، خوارزم اور دیگر خصوصی اسکول شامل ہیں جو اپنی اپنی روایات کے لیے مشہور ہیں۔

الپامیش نامی داستان ازبیکوں میں سب سے زیادہ مقبول عام اور محبوب ہے۔ اس کے مرکزی کردار بے اولاد دو بھائیوں بائے بوری اور بائے سری نے عہد کیا کہ اگر ان

کے لڑکا اور لڑکی پیدا ہوں گے تو وہ ان کی شادی کریں گے ۔ جب بائے بوری کے ہاں بیٹا حکیم (پہلے بہادرانہ کارنامے کے بعد اس کا نام الپامیش رکھ دیا جاتا ہے) پیدا ہوا اور بائے سری کے ہاں بیٹی بارچین ' تو دونوں بھائیوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور چھوٹا بھائی بائے سری خفا ہو کر اپنے افراد خانہ کے ساتھ قالمیق سلطنت میں منتقل ہو جاتا ہے ۔

داستان " الپامیش " میں بیان کیے جانے والے واقعات قونغرات قبیلے سے منسلک ہیں جو بعد میں قالمیق قبائل (موجودہ روسی فیڈریشن کے جنوب میں) سے منسلک ہو جاتے ہیں جہاں بائے سری کی ساری نسل بھی منتقل ہو جاتی ہے ۔

الپامیش جب نوجوان ہو جاتا ہے تو اپنی محبوبہ کی تلاش میں اجنبی ممالک کے لیے روانہ ہوتا ہے ۔ راستے میں وہ قالمیق سورما قاراجان سے مقابلہ کرکے اسے جیت لیتا ہے ۔

داستان کے دوسرے حصے میں بد طینت بڑی بی سرخیل جادو ٹونا کرکے الپامیش کو قالمیقوں کے خان کا قیدی بنوا دیتی ہے جو اسے زنداں میں ڈال دیتا ہے ۔

اس اثنا میں الپامیش کا سوتیلا بھائی اولتان بارچین کو اپنے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن عین شادی کے دن الپامیش اپنے گھر واپس لوٹتا ہے اور اولتان کا قصہ ختم کرکے قونغراتیوں کا حکمراں بن جاتا ہے ۔ انصاف بدی پر غالب آجاتا ہے ۔

رزمیہ شاعری کی ایک دوسری یادگار "گور اوغلی" (فرزند گورستان) ہے جو خود بھی ۴۰ داستانوں پر مشتمل ہے ۔ ان داستانوں میں گور میراوغلی ' اس کے رضاعی بیٹوں اور بالخصوص سورما آواز نیز گور اوغلی کے پوتوں میں میر علی ' نور علی ' روشن وغیرہ کی چتا بیان کی جاتی ہے ۔

بہت سی داستانوں میں فنطاسیہ نما قصے بھی شامل ہیں جن کے باعث یہ داستانیں بہادری و رومانیت کی رزمیہ حکایات میں تبدیل ہو جاتی ہیں ۔

"گور اوغلی" سلسلے کی داستانیں غزلیات ' رباعیات اور شاعری کے دیگر اسالیب پر مبنی ہیں ۔ باوجود اس کے کہ عربی رسم الخط اور اس پر مبنی تحریری ادب نے ازبکوں

میں عہد وسطیٰ ہی میں نشو و نما پائی تھی تاہم قومی روایتی داستانوں اور حکایات نے براہ راست تحریری ادب پر گہرا اثر چھوڑا ہے ۔ برجستہ گو شاعر اور بخشی عام طور پر قومی سازوں قوبیز اور دوتار کی سنگت میں زبانی داستانیں سناتے تھے اور اب بھی سناتے ہیں ۔ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۵۵ء میں الپامیش کی ۱۱ اقسام تحریر کی گئیں ۔ ان میں سے ایک نثری ہے اور باقی دس داستانیں منظوم ۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر اور ۲۰ ویں صدی کے اوائل میں جمان حال مراد اوغلی اور پولداش مدا اوغلی بخشیوں کے نام سب سے زیادہ مشہور تھے جنھیں عوامی شاعر کا خطاب عطا کیا گیا ۔

پانچویں اور چھٹے دہوں میں ان کے مقلدین ایرگاش جمان بلبل اوغلی ' فاضل یولداش اوغلی 'پولکان شاعر ' اسلام شاعر نظر اوغلی جیسے عوامی شعرا نے زندگی بسر کی جو شادی بیاہ کی تقریبات اور عوامی تہواروں میں اپنی داستانیں ترنم سے سناتے تھے ۔

بخشی آج بھی عوامی تخلیقات کی شاہ کار داستانیں سناتے نہیں تھکتے ۔ ۹۰ سالہ بخشی قربان نظر عبداللہ ایف کا نام تو سارے ضلع خوارزم میں شہرہ آفاق ہے ۔ وہ ۱۵ شان دار داستانیں سناتے ہیں ۔

تاشقند میں بکثرت سنی العقیدہ ہیں ۔ یہاں شیعہ بھی ہیں ۔ مگر یہاں شیعہ سنی سوال موجود نہیں ہے ۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تاشقند میں کوئی تفریق ممنوع ہے ۔ یہ دونوں عقیدے نہایت صحت فکر اور سلامتی عقل کے ساتھ ایک ساتھ رہتے ہیں ۔ ان کی عبادتیں مشترک ہیں ۔ نہ اذان میں اختلاف ہے اور نہ عبادت گاہوں میں کوئی افتراق و امتیاز ہے ۔

میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ قدیم شہر میں جو لوگ رہ رہے ہیں وہ دین سے بالکل باہر نہیں ہوئے ہیں ۔ مگر جو جدت کی زد میں آچکے ہیں ان کا دینی اعتبار باقی نہیں رہا ہے ۔ یہ مسئلہ تاشقند کا نہیں ہے ' یہ عالمی مسئلہ ہے ۔ خود پاکستان میں نئی نسل نے دین کو خدا حافظ کہہ دیا ہے ۔

تاثرات!

میری خواہش یہ تھی کہ میں جہاں جاؤں مرکز صحت ضرور دیکھوں اور اس نظام کو سمجھوں کہ جو صحت مندی روس کا ضامن ہے۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ "یورپی روس" اور "مشرقی روس" کے نظام صحت میں اگر کوئی فرق ہے تو کیا ہے۔ اگر فرق نہیں ہے تو کیا واقعی دونوں روسوں کے لوگ یکساں صحت مند ہیں یا صحت مندی میں کوئی فرق ہے۔ علاقائی حالات کیفیت صحت پر کس حد تک اور کیسے اثر انداز ہیں۔ یہ مطالعہ یقیناً دل چسپ ہوتا مگر اس کے لیے جو وقت درکار ہے وہ مجھے میسر نہیں ہے اور پھر اس کے لیے دونوں روسوں کے زیادہ علاقوں کا زیادہ سفر کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مثلاً اگر مشرقی روس کے ازبکستان کا معیار صحت بہت زیادہ بلند نہیں ہے اور مثلاً لینن گراڈ کا معیار صحت بلند ہے تو ان دونوں مشرقی و مغربی روس کے دو شہروں میں یہ فرق کیوں ہے؟

☆ کیا حاکمیت اور محکومیت کے جذبات میں ایسا فرق ہے کہ جو صحتوں پر اثر انداز ہوتا ہے؟ یعنی حاکم قوم کے افراد کے جذبات حاکمیت کا صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اور ایک محکوم کے جذبات اسے کس طرح صحت مند یا کمزور صحت رکھتے ہیں؟

☆ ازبکستان اور لینن گراڈ دونوں روس میں ہیں۔ مگر ان دونوں کے طرز زندگی میں لازماً فرق ہے۔ اس طرز زندگی کا صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ طرز زندگی میں طریق بود و باش، آب و ہوا، غذا، سونے جاگنے کے انداز سب شامل ہیں۔

☆ علاقائی ماحول صحت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

☆ ازبکستان اور لینن گراڈ دونوں کے لیے تعلیم صحت کے انتظامات میں کیا یکسانیت ہے؟

☆ کیا ان دونوں مثالی علاقوں میں فراہمی حالات صحت یکساں ہیں؟

میں نے محسوس کیا کہ میں صحت و مرض کے میدانوں میں اس قسم کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے حالات کی فراہمی، وقت کا میسر آنا، مطالعے کے لیے بھرپور آزادی وغیرہ کی حاجت ہے۔ چوں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اس لیے میں نے اپنے

مقاصد سفر سے اس عنوان کو حذف کر دیا ہے اور اپنی زیادہ توجہ کو ایک عام مطالعے کے لیے مرتکز کر دیا ہے۔ ازبکستان میں آج کا تمام دن نہایت مصروف گزرا ہے۔ اس مصروفیت میں صحت کسی نہ کسی انداز سے موضوع رہی ہے۔ مگر میرا ذہن ازبکستانی اور روسی انسانوں کے مابین فرق کو محسوس کرنے سے لحہ بھر بھی خالی نہیں رہا ہے۔

اس حقیقت میں تو بہرحال کوئی شک ہے نہ شبہ کہ "مشرقی روس" کے شہروں میں "خالص آبادیاں" باقی نہیں رہی ہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ تاشقند میں ازبکستانی ہی رہتے ہوں اور ان پر حاکمیت موسکو میں بیٹھ کر کی جاتی ہو، نہ غالباً ایسا ہے کہ ازبکستان کے شہر تاشقند میں اعلا مراتب پر روسی فائز ہوں اور نیچے کے مراتب اور عہدے ازبکستانیوں کے پاس ہوں۔ یہ انداز حکومت انگریز کا تھا جس کا مشاہدہ خود ہم ہندستان میں ہو چکا ہے کہ اعلا اختیار بہرحال انگریز کے پاس رہتا تھا۔ گو آخر میں صوبوں میں وزارتیں اہل ہند کے پاس رہیں اور نظم و نسق اہل ہند کے ہاتھ میں رہا، لیکن اہم صوبوں میں حاکم اعلا (گورنر) انگریز ہی رہے یا پھر انگریز کے زبردست حامی برسر اقتدار رہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ مثلاً دہلی میں انگلستان نے انگریز درآمد کر کے ان کو دہلی والوں کے ساتھ آباد کر دیا گیا ہو۔ روس میں حالات مختلف ہیں۔ یہاں آبادیاں مدغم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مثلاً تاشقند میں ازبکی تو خیر ہیں مگر ان کے ساتھ روسی بھی رہ رہے ہیں۔ یہ روسی ازبکستان میں درآمد ہوئے مگر اب ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور آبادیاں ملی جلی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ جہاں یہ عمل جاری رہا ہے وہاں زبان میں تدریج کے ساتھ تبدیلیاں لائی گئی ہیں، حتیٰ کہ اب بولنے کے لیے ازبکی زبان ہے مگر ازبکی اب روسی رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔ اس کا رسم الخط اب عربی نہیں رہا ہے۔ اس عمل کی ابتدا درس گاہوں سے ہوئی اور لکھنے کی زبان نصاب میں روسی رسم الخط میں کر دی گئی۔ اس کے بعد ازبکی زبان میں روسی زبان کے الفاظ محسوس اور غیر محسوس طور پر داخل ہوئے اور ایک مرحلہ ایسا آیا کہ زبان "ازبکی روسی" بن گئی ہے اور آج صورت حال یقیناً یہ ہے کہ ہر ازبکی روسی

زبان جانتا ہے اور روسی بھی ازبکی زبان سے ناواقف نہیں رہا ہے۔

حکومت روس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی ہے کہ ازبکی زبان کی تحقیر کی ہو۔ اس نے ازبکی زبان اور ازبکی شعر و ادب کے ساتھ روا داری کی بہترین مثالیں قائم کی ہیں اور اس کو کالعدم کر دینے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کی ایک مثال "القانون فی الطب" کی صورت میں موجود ہے۔ القانون فی الطب کا پہلے روسی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ مگر اب القانون فی الطب کا ازبکی زبان میں بھی مکمل ترجمہ ہوگیا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا کام نہیں ہے۔ چھے ضخیم جلدوں میں یہ ترجمہ سمایا ہے۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ روسی ترجمہ موجود ہے تو ازبکی زبان میں ترجمہ میں کوئی رکاوٹ ڈالی گئی ہو۔ یہ ایک بیّن مثال ہے۔ اس قسم کی بے اندازہ مثالیں موجود ہیں۔ علم و ادب میں اس قسم کی آزادیاں معنی خیز ہیں۔

آج میں نے تمام دن تاشقند میں لوگوں کے پہناوے غور سے دیکھے ہیں۔ ان کے لباس پر گہرائی کے ساتھ غور کیا ہے۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ ازبکی مرد و عورت نے اب وہ لباس اختیار کر لیا ہے جس پر مغرب کی چھاپ ہے۔ اب محض لباس ازبکی اور روسی کا فرق نہیں بتاتا ہے۔ ازبکی بے تکان روسی بولتے ہیں اس لیے زبان بھی اب وجہ امتیاز نہیں رہی ہے۔ ازبکستان میں عبادت گاہیں اب خالی ہو چکی ہیں اس لیے یہ امتیاز بھی اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ہوٹل ازبکستان، جہاں میرا قیام ہے، اس کے سب ہالوں میں جو دھما چوکڑی ہوتی ہے اور رقص و سرود کی جو آزادیاں ہیں ان پر مغرب کی چھاپ پوری قطعیت کے ساتھ ہے۔ میں نے ایک مسلمان کا جنازہ ایسا دیکھا کہ جسم مردہ پر مردے کا فوٹو رکھا ہوا تھا اور اب اپنے اس ہوٹل میں شادی کا ایک منظر دیکھا ہے جس کا انداز ہر طرح مغربی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ روسی شادی ہو۔ مگر میں نے ازبکی شادی کوئی نہیں دیکھی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ازبکستان نے روسیت اختیار کر لی ہے اور حاکم اور محکوم ایک رنگ میں رچ بس گئے ہیں۔ امتیازات سارے ہی مٹ گئے ہیں۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ ازبکستان اور لینن گراڈ میں اب کوئی مذہبی اور تہذیبی امتیاز

باقی نہیں رہا ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ اگر زیادہ صاف بات کروں تو میں یہ کہوں گا کہ ازبکستان کے مسلمان نے اب قرآن و سنت کو ترک کر دیا ہے اور وہ اس سے بے پروا ہوگیا ہے۔ اگر ایسا ہے، اور صحیح ہے کہ ایسا ہے، تو مجھے اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ وہ علاقے کہ جہاں مسلمان ہنوز مسلمان ہیں وہاں کے مسلمان کس حد تک قرآن و سنت کے حامل ہیں؟ میں فی الحال پاکستان سے باہر نہیں جانا چاہتا، اپنے وطن کی بات کرتا ہوں۔ آج میرے وطن میں یہ ہو رہا ہے کہ اندرون صوبہ سندھ قرآن جلائے جا رہے ہیں اور ایسے مقامات بھی ہیں کہ جہاں تلاوت قرآن ممنوع ہوئی ہے۔ پاکستان میں بعض لوگ رات دن تعلیمات قرآن اور تعلیمات رسولؐ کا استہزا کر رہے ہیں۔ ان تعلیمات پر عمل سے غافل ہیں، غافل ہی نہیں اس غفلت پر شاداں ہیں۔ یہاں تو حکومت کا مزاج اسلامی رہا ہے۔ عالی مرتبت صدر ضیاء الحق شہید گیارہ سال تک اسلام کی تبلیغ و تنفیذ میں کوشاں اور سرگرداں رہے، لیکن ان کی ہر کوشش کی نفی حد یہ ہے کہ بعض علمائے کرام کی طرف سے ہوئی جن کے ہزار فرقے، ہزار تعصبات اور ہزار اختلافات کے ساتھ پاکستان میں کام کر رہے ہیں۔

تاشقند قدیم میں اذانوں کی آوازیں آج بھی آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ ان اذانوں میں وہ جذبات فروزاں اور فراواں نہیں ہیں جو ان کا مزاج ہے۔ مگر میرے نزدیک اذان کی ان آوازوں میں ہنوز صداقت موجود ہے اور یہ نرم اور جذبات سے عاری اذان کی آوازیں پاکستان کی اذان کی آوازوں سے زیادہ صادق ہیں۔

میں پاکستان سے باہر ممالک اسلامیہ میں اسلام کی درگت کی اس سے زیادہ بھیانک تصویریں پیش کر سکتا ہوں مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر جب میں عالم اسلام کے جرائد و رسائل میں روس میں مسلمانوں کی حالت زار پر مضامین پڑھتا ہوں تو مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور میرا دل بھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ہم کس منہ سے یہ باتیں کر سکتے ہیں؟

وزیر صحت از بیکستان ۔ تبادل خیال

پاکستان اور از بیکستان میں یقیناً مناسبت ہے اس لیے از بیکستان کے وزیر صحت سے میری ملاقات کو شریک پروگرام کیا گیا ہے ۔ میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں مراکز صحت میں سے کوئی ایک دیکھنا چاہتا ہوں اور نظام صحت پر غور کرنا چاہتا ہوں ۔ جناب محترم الیگزنڈر سیدوف صاحب (قونصل جنرل روس ، متعینہ کراچی) نے یہ رائے دی تھی کہ شاید اس کا امکان ہو کہ فارماسیوٹیکل انڈسٹری سے ہمدرد لیبوریٹری کے روابط قائم ہوجائیں ۔ بارے اسی عنوان سے آج جناب وزیر صحت از بیکستان سے بہت طویل ملاقات رہی ۔

۱۲ بجے ٹھیک وہ ہمارے منتظر تھے ۔ انھوں نے اپنے دفتر کے باہر استقبال کا اہتمام کیا تھا ، نیز وہ خود دروازے پر کھڑے منتظر تھے ۔ ان کے کیمرا مین بھی مستعد تھے جو بات بات پر فوٹو کھینچ رہے تھے ۔

وزیر صحت کے دفتر میں میٹنگ کا آغاز ہوا ۔ وزیر صحت اور میں آمنے سامنے بیٹھے ۔ میرے ساتھ جناب محترم مرزا یوف صاحب بیٹھے کہ وہ مترجم کی حیثیت سے بہترین تعاون فرما رہے تھے ۔ وزیر صحت کے قریب ان کے سکرٹری ہیلتھ اور سعدیہ بیٹھے تاکہ گفت گو کے نوٹ لیتی رہیں ۔ یہ میٹنگ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی ۔ میں یہاں تبادل خیال کے نکات درج کرتا ہوں :

☆ از بیکستان زری پبلک نباتات سے مالا مال ہے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان نباتات کو برائے علاج اور شفائے امراض استعمال کریں ۔ اس سلسلے میں آپ کے تعاون کی ہمیں ضرورت ہے تاکہ ہم کیمیائی مضر ادویہ سے نجات پاکر دائرہ فطرت میں آجائیں ۔

میں نے اس موقع پر ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کو بتایا کہ میں طب ابن سینا کا حامی و حامل ہوں جس کو از بیکستان نے بدرجہ کمال اہمیت دی ہے ۔ میں طب ابن سینا کے مطابق مطب کر رہا ہوں اور نباتات سے دوائیں بنانے کے برصغیر پاک ہند میں سب سے بڑے کارخانے سے متعلق ہوں ۔ میں گزشتہ چالیس سال سے اس پر زور دے رہا ہوں کہ علاج معالجے کو دائرہ فطرت میں لانا چاہیے اور انسان کی

موجودہ ابتلائی کیفیت کو ختم کرنے کی تدبیر کرنی چاہیے ۔

میں نے ان حضرات کو جو میٹنگ میں شریک تھے بتایا کہ نظریہ و فلسفہ طب ابن سینا قابل فکر ہے اور لائق غور ہے ۔ اس وقت طب کے تین میجرڈ سپلنس ہیں : طب چینی ، طب ہندی ، طب عربی ۔ ان تینوں طبوں کی تاریخ ہزاروں سال کو محیط ہے اور بنیادی طور پر یہ سب علاج کے باب میں نباتات کو مقام اولین دیتے ہیں ۔ طب عربی کے حاملین نے نباتات پر اس قدر کثیر مشاہدات اور تجربات کیے ہیں اور ان کو ہزار ہا کتب نباتات میں محفوظ کیا ہے کہ اس کی کوئی مثال تاریخ طب میں موجود نہیں ہے ۔ نہ جانے نباتات کی کتنی کتابیں دست برد زمانہ کی وجہ سے تباہ و نایاب ہوگئی ہیں ، مگر جو باقی ہیں وہ بھی مغرب کے ہر نباتاتی کام پر حاوی ہیں ۔ ہمیں اس پر حیرت کرنی چاہیے کہ قدما نے جن نباتات کے جو افعال و خواص تحریر کر دیے ہیں آج تک ان کی تائید ہی ہوئی ہے ، تکذیب کی کوئی ایک مثال موجود نہیں ہے ۔ خود ابن سینا کو لیجیے ۔ وہ اپنے مشہور زمانہ رسالہ ادویہ قلبیہ میں لکھتے ہیں کہ گاؤ زبان عضلات قلب کے لیے مقوی و محرک ہے ۔ رائل انفرمری ایڈنبرا میں گاؤ زبان پر تحقیقی کام ہوا ہے اور اسے مقوی عضلات قلب پایا گیا ہے ۔ ان حالات میں آپ نے جو فیصلہ کیا ہے کہ از بیکستان میں پیدا ہونے والی نباتات سے استفادہ کیا جائے وہ نہایت صحیح فکر ہے ۔ میں آپ کے ساتھ اس میدان میں تعاون کروں گا ۔

☆ اس سلسلے میں اقدامات کی صورت کیا ہو سکتی ہے ؟ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے اور کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے ۔

میں نے جناب وزیر صحت اور ان کے رفقا کو یہ مشورہ دیا کہ سب سے پہلے نباتات کہ جو پہچانی جا چکی ہیں ان کی فہرست تیار کرنی چاہیے ۔۔ ان کے بوٹانیکل نام تلاش کرکے لکھنے چاہییں ۔ اس کے بعد سروے کے لیے ایک یا کئی ٹیمیں بنانی چاہییں کہ جو پورے از بیکستان میں بڑی بوڑھیوں سے رابطہ قائم کریں اور نباتات کی پہچان میں ان کا تعاون حاصل کریں ۔ سروے کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے ۔ ایسی نباتات کہ جن پر تحقیقی اور کیمیائی کام ہو چکے ہیں ان کی درجہ بندی کرنی چاہیے ، اور ایسی نباتات

جن پر کوئی تحقیق اور کیمیائی کام نہیں ہوا ہے اس کے لیے ایک کیمسٹری لیبوریٹری کو وجود دینا چاہیے ۔ پھر آخری مرحلہ فارماکولوجی لیبوریٹری کا ہے جہاں ماہرین دواؤں کے طریق عمل کا تعین کریں ۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تمام کام طویل ہیں اور ان کا کرنا آسان نہیں ہے اس لیے ہمیں عالمی ادارہ صحت کے اصول پر عمل کرنا چاہیے کہ معلوم دواؤں ر نباتات کو ان کے اصل صورت میں استعمال کرنا شروع کر دینا چاہیے ۔ نامعلوم دواؤں کی سمیت کا تعین کرکے ان پر تجربات کرنے چاہییں ۔

شیخ الرئیس ابن سینا ازبکستان کے ہیں ۔ انھوں نے اپنے مختلف رسالوں میں اور خود " القانون فی الطب " میں جن مفردات ر نباتات کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً ازبکستان میں موجود ہوں گی ، گو ایران کی نباتات بھی شیخ کے دائرہ فکر سے باہر نہیں ہوں گی ۔ ہمیں ان معلومات کو رہنما بنانا چاہیے ۔

☆ ہمدرد اس میدان میں کس انداز سے کام کر رہا ہے اور ہمدرد اور وزارت صحت ازبکستان ، باہم کس انداز سے کام کر سکیں گے ؟

میں نے ان کو ہمدرد کے بارے میں بتایا کہ انڈیا اور پاکستان دونوں جگہ نباتات پر تحقیق کام بڑی کثرت سے ہوئے ہیں اور یہ طبع شدہ موجود ہیں ۔ ہمدرد میں ان سے استفادہ کیا جاتا ہے اور ان نباتات سے شربت ، عرق ، قرص ، معاجین اور خمیرے بنائے جاتے ہیں ۔ اتفاق سے ہمارے اور مرزا یوف کے پاس سعالین ، جوشینا موجود تھے ۔ ہم نے یہ نمونے اس میٹنگ میں پیش کر دیے ۔

☆ کیا ہمدرد کی مصنوعات نباتاتی کی کوئی فہرست موجود ہے ؟ اور کیا ہمدرد اپنی تیار شدہ دواؤں کی تاشقند میں نمائش پر غور کر سکتا ہے ؟

میں نے بتایا کہ ہاں ان دواؤں کی انگریزی میں نیز عربی فہرست موجود ہے جو ہمدرد شرق اوسط ، امریکا ، برطانیہ وغیرہ ایکسپورٹ کرتا ہے ۔ یہ فہرست فراہم کر دی جائے گی ۔ مگر ہمدرد نے فارماکوپیا اوف ایسٹرن میڈیسن بھی شائع کی ہے جو ہمدرد کے ۷۵ سالہ تجربات کا نچوڑ ہے ۔ ہم یہ فارماکوپیا فراہم کر دیں گے ۔ اس سے تاشقند میں مدد مل سکے گی ۔ ہمدرد ضرور اس کے لیے تیار ہوگا کہ تاشقند میں وزارت صحت

ازبکستان کے زیر نظام ادویہ ہمدرد کی نمائش کا انتظام کر سکے ۔ اس نمائش میں پوسٹر ایگزیبیشن پر بھی غور کیا جا سکے گا ۔

☆ ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ کیا وزارت صحت ازبکستان اور ہمدرد مل کر ایک فنی کانفرنس پر غور کر سکتے ہیں ؟

میں نے کہا کہ ایسا ضرور ہو سکتا ہے اور ایسا ہونا مناسب بھی ہوگا ۔ اس کے لیے وزارت صحت ازبکستان غور کر لے ۔ پاکستان سے چند سائنس داں آپ کی باضابطہ دعوت پر تاشقند آسکیں گے اور رہنمائی دے سکیں گے ۔

☆ انٹرنیشنل عناصر کنگرسوں کا ذکر اس تبادل خیال میں ہوا ۔

☆ نیشنل انسٹی ٹیوٹ اوف ہیلتھ ، بتھسڈا ، امریکا کے شعبہ نباتات کا حوالہ بھی میں نے دیا ۔

☆ نیشنل لائبریری اوف میڈیسن ، واشنگٹن ، امریکا میں طب عربی کی کتابوں کے تراجم کا ذکر کر دیا گیا ۔

ظہرانۂ وزیر صحت

بارہ بجے جو میٹنگ شروع ہوئی تھی وہ کوئی دو بجے ختم ہوئی ۔ جناب وزیر صحت نے فرمایا کہ اچھا ہے کہ اب ہم دن کا کھانا بھی ساتھ ہی کھا لیں ۔ ہم ہاتھ منھ دھو کر ان کے ساتھ روانہ ہوئے ۔ میں وزیر صحت کے ساتھ ان کی موٹر کار میں بیٹھا ۔ انھوں نے اپنے گھر پر ظہرانے کا انتظام کیا تھا ۔ نہایت پرسکون ماحول تھا ۔ اندر ٹیبل لگی ہوئی تھی ۔ اس پر کھانے انواع و اقسام کے اس طرح چنے ہوئے تھے کہ کوئی جگہ خالی نہ تھی ۔ کھانے میں پندرہ سولہ آدمی ہو گئے تھے ۔ قسم قسم کے کھانے تھے جو میں جناب وزیر صحت کے اصرار پر نوش جاں کرتا رہا یہاں تک کہ کھانا معدے سے حلق تک بھر گیا !

کھانے پر بڑی دل چسپ باتیں بھی ہوئیں ۔ میں لطائف کے موڈ میں آگیا ۔ میں نے اکل و شرب سے متعلق کئی دل چسپ واقعات سنا کر اس مجلس طعام کو دل چسپ

بنائے رکھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا" کے سادھو سے علاج کا ذکر سنایا کہ سادھو میں کمال دانش اس لیے پیدا ہوئی کہ اس نے تمام زندگی جس چیز کی دل نے خواہش کی وہ کبھی نہیں کھائی۔

میں نے لالہ جی اور خاں صاحب کے مکالمے بھی سنائے کہ وہ کھانا کیسے کھاتے ہیں۔ مجلس اس واقعے پر مجلس قہقہہ بن گئی۔ غرض میں لطائف سناتا رہا اور ایک سے ایک نفیس ڈش آتی رہی۔ یہاں تک کہ پونے چار بج گئے۔ ہم سب وزارت صحت میں واپس آگئے۔

سائنس دانوں سے خطاب

وزارت صحت کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ اوف میڈیکل ریسرچ ہے جہاں نباتات پر غور و فکر ہورہا ہے۔ علاوہ ازیں اس میدان کے ڈاکٹر اور سائنس داں بھی۔ سب وزارت صحت کے آڈیٹوریم میں جمع ہوئے۔ ایک نہائت دل چسپ مغالطہ یہ رہا کہ صبح سے جناب مرزا یوف صاحب کہتے رہے تھے کہ آج شام آپ علما سے ملیں گے۔ ان سے آپ خطاب کریں گے۔ وہ سوالات بھی کریں گے۔ آپ جوابات کے لیے تیار رہیے۔ میرے ذہن میں لفظ "علما" سے یہی آسکتا تھا کہ یہ صاحبان دینی مزاج کے حامل ہوں گے۔ یعنی روس کے مولوی صاحبان ہوں گے۔ میں صبح سے شام تک خود کو مولوی صاحبان سے گفت گو کے لیے تیار کرتا رہا تھا۔ پھر جب وزارت صحت میں واپس آئے تو بھی جناب مرزا یوف نے فرمایا: "علما جمع ہو رہے ہیں اب آپ کو آڈیٹوریم میں چلنا ہے"۔ اب تک بھی میرے تصور میں مولوی صاحبان ہی تھے۔ مگر جب آڈیٹوریم میں داخل ہوا تو وہاں موجود کسی کے سر پر بھی پگڑی تھی اور نہ عمامہ تھا اور نہ جبہ قبہ۔ اب میں سمجھ گیا کہ علما سے مراد اہل سائنس تھے۔ میں نے ان سے باتیں کرنے کے لیے فوراً خود کو تیار کرلیا!

چار بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک میں یہاں رہا۔ میں نے علاج نباتات پر ایک ابتدائی تقریر کی جس کے نکات درج ذیل ہیں:

☆ کوئی انسان اس صفحہ ارض پر ایسا نہیں ہے کہ جو یہ دعوا کرسکے کہ وہ جسم انسانی کی فہم کامل رکھتا ہے۔ اس لیے جو بھی دوا وہ جسم انسانی میں دیتا ہے وہ قیاس پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں جسم انسانی کو کیمیائی مرکبات سے مسموم نہیں کرنا چاہیے۔

☆ جسم انسانی مادی اور روحانی دونوں وجود رکھتا ہے، اس لیے اس سے انسانی معاملہ کرنا چاہیے۔ اسے محض گوشت ہڈی کا مجموعہ سمجھ کر اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

☆ اگر جسم انسانی کے روحانی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا تو طب نفسیاتی سے انکار ہوگا۔ نفسیات کا تعلق انسانی جسم کی روحانیت ہی سے ہو سکتا ہے۔ ماڈرن میڈیسن نے جسم انسانی کے روحانی وجود سے صرف نظر کرکے علاج معالجے میں مشکلات اور انسان کے لیے شدید مسائل پیدا کردیے ہیں۔

☆ طب ابن سینا اپنا نظریہ اور فلسفہ رکھتی ہے۔ ہم اس کو بدرجہ کمال اہمیت دیتے ہیں۔ ہم نے نظریہ عناصر اربعہ (فور ایلے منٹس) پر عالمی سطح پر تحقیقی کام کیا ہے اور ۵ عالمی کانگرسوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ عناصر اربعہ میں توازن کا صحت و مرض سے گہرا تعلق ہے۔ پہلی کانفرنس ہمدرد انڈیا اور دوسری ہمدرد پاکستان میں ہوئی۔ تیسری سوئیڈن میں ہوئی۔ چوتھی یونیسکو پیرس میں ہوئی اور پانچویں اوانا یونی ورسٹی ترکی میں بہ تعاون ہمدرد ہوئی۔ ایک عالمی کنگرس اسی سال اگست میں ٹوکیو (جاپان) میں ہوئی۔ ان کانفرنسوں میں دنیا بھر سے بلند مرتبہ ماہرین نے شرکت کی اور نظریہ طب ابن سینا۔ عناصر اربعہ کی تائید در تائید کردی۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ اوف ہیلتھ واشنگٹن میں ۳۶ ہزار نباتات جمع ہوئی ہیں۔ ۱۸ سو پر سرطان کے لیے تحقیقی کام ہورہا ہے۔

☆ کویت کے المرکز الطب الاسلامی کی تفصیلات بتائی گئیں۔ مجلس متعدد سوالات و جوابات پر ختم ہوئی۔ اکثر سوالات ہمدرد کے تجربات سے متعلق تھے۔

ہربل بار۔ نبات مشروبات خانہ

ازبکستان میں نباتات سے گہرا شغف پیدا ہوگیا ہے۔ ہمدرد میں میرا پروگرام تھا

اور ہے کہ میں نسخہ جات کی تیاری کا اہتمام کروں گا اور مطب ہی میں جوشاندے تیار کرکے مریضوں کو پلادیے جایا کریں گے۔ میں تو عمل نہ کرسکا مگر یہاں تاشقند میں جناب وزیر صحت کی معیت میں ایک نباتی مشروبات خانہ دیکھا اور یہاں تیار مشروبات بھی نوش جان کیے۔ مفرد نبات اور متعدد نباتات کے مشروبات تیار تھے۔ (ریڈی ٹو ڈرنک) ایک مشروب ہاضم تھا۔ اس میں یقیناً افسنتین تھی۔ میں نے کیمسٹ کو بتا دیا کہ اس میں افسنتین ہے۔ اس نے تائید کی۔ ایک مشروب میں تلسی کا ذائقہ تھا۔ میں نے اسے بھی پہچان لیا۔ معلوم ہوا کہ تاشقند میں تلسی بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے جناب وزیر صحت کو بتایا کہ تلسی (تاشقند میں نام: ریحان) امراض صدر کے لیے ایک بہترین دوا تسلیم کی گئی ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ سعالین (جو میں ان کو چسوا چکا تھا) میں ایک اہم جزو خلاصہ تلسی بھی ہے۔ نباتات کے پیک ڈبے خوب صورت الماریوں میں سجے ہوئے تھے۔ نہایت خوب صورت سیلز ڈپو ہے اور بہ کثرت مریض آرہے ہیں اور دوائیں خرید رہے ہیں۔ بہت سوں کے پاس نسخے بھی ہیں۔ میں نے سوال کیا کہ نسخے کون لکھ رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہاں بھی "حکیم" ہیں۔ افسوس کسی حکیم سے ملاقات کا وقت نہ مل سکا ورنہ ان سے تبادل خیال کرتا۔

ہربل بار کے مالک نے میرا شکریہ ادا کیا کہ آپ کی وجہ سے وزیر صحت میرے ادارے میں آئے۔ آخر میں ایک کمرے میں آگئے۔ وہاں بڑی میز پر بہ کثرت اکل و شرب چنے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا! اب کیسے میزبان کی دل داری کروں! دن کو وزیر صحت نے گھر پر اس قدر کھلا دیا تھا کہ سانس نہیں آرہا تھا۔ بارے ہم سب میز پر بیٹھ گئے۔ وزیر صحت نے مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔ میں نے ان کے کان میں کہا کہ "سانس نہیں آرہا ہے" 'انھوں نے سہ پہر کا میرا فقرہ مجھے لوٹا دیا "سانس کی ایسی تیسی' آئے نہ آئے' آپ تھوڑا بہت تو کھا ہی لیجیے۔ میں نے انگوروں پر توجہ کی سبحان اللہ تاشقند کے انگور لاجواب ہیں۔ اگر ایک کلو سامنے رکھ دیں تو میں شاید سب ہی نوش جان کرلوں۔ پروا نہیں کہ خون میں شکر کہاں سے کہاں

پہنچ جائے۔ وزیر صحت نے مزاحاً فرمایا "انگور تو پانی ہے معدے میں راستہ خود ہی بنا لے گا!"

معدے کے تین حصے

اب ذکر آرہا ہے تو پھر لطیفہ یہاں لکھ دینا چاہیے کہ جو میں نے دن کو کھانے پر سنایا تھا:

ریل کا سفر تھا۔ ایک سیٹ پر جناب لالہ جی پدھارے ہوئے تھے۔ اور بالمقابل سیٹ پر ایک خان صاحب تشریف فرما تھے۔ آپس میں باتیں شروع ہوئیں۔ موسم سے بات شروع ہوئی اور اکل و شرب تک جا پہنچی۔ دونوں نے اس موضوع سے گہری دل چسپی لی۔ پھر تقلیل غذا پر باتیں ہوئیں۔ تنقید بھی ہوئی کہ لوگ زیادہ کھا جاتے ہیں۔ متھرا کے چوبوں کا ذکر بھی ہوا جو کھانے کے مقابلے پر جب آجاتے ہیں تو دس پندرہ سیر لڈو پیڑے کھا جاتے ہیں۔ گفت گو بڑی دل چسپ تھی جو بے تکلفی تک پہنچ گئی۔ جناب خاں صاحب نے لالہ جی سے سوال کیا'

خاں صاحب: "لالہ جی آپ کھانا کس طرح کھاتے ہیں؟"

لالہ جی: "خاں صاحب! ہم اپنے معدے کے تین حصے کرتے ہیں اور پھر کھاتے ہیں۔"

خاں صاحب: "یہ تین حصے کیا ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں؟ کیا پارٹیشن بنوا لیتے ہیں!"

لالہ جی: "ہاں کچھ ایسا ہی ہے!"

خاں صاحب: "تو پھر کھانا کیسے کھاتے ہیں؟"

لالہ جی: "ہم ایک حصے میں کھانا ڈالتے ہیں۔"

خاں صاحب: "دوسرے حصے میں کیا ڈالتے ہیں؟"

لالہ جی: "اس کو ہم پانی کے لیے خالی رکھتے ہیں۔"

خاں صاحب: "اچھا تو بھئی تیسرے حصے کا کیا ہوتا ہے؟"

لالہ جی: "وہ سانس کے لیے خالی رہتا ہے!"

خاں صاحب: "اچھا تو یہ بات ہے۔ لالہ جی آپ نے خوب حساب کتاب رکھا ہے۔ جبھی تو آپ کی توند باہر نکلے چلی جا رہی ہے۔" لالہ جی نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور اپنی موٹی موٹی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

لالہ جی: "تو پھر خان صاحب آپ بتایئے کہ آپ کیسے کھانا کھاتے ہیں"۔ خاں صاحب تو لالہ جی کے مونچھوں پر تاؤ دینے سے خاصے ڈسٹرب تھے۔ انھوں نے جل کر فرمایا،

خاں صاحب: "اجی لالہ صاحب! ہم بھی اپنے معدے کے تین حصوں کا حساب رکھتے ہیں۔"

لالہ جی: "اچھا یہ تو خوب ہے۔ تو ذرا فرمایئے کہ ان تین حصوں کا آپ کیا کرتے ہیں؟"

خاں صاحب: "ایک میں ہم کھانا بھرتا ہے۔"

لالہ جی: "دوسرے میں کیا کرتا ہے؟"

خاں صاحب: "کرتا کیا ہے، اس میں بھی کھانا ڈالتا ہے۔"

لالہ جی: "اچھا تو پھر پانی کی جگہ کہاں سے آتی ہے؟"

خاں صاحب: "ارے بھائی، پانی تو اپنا راستہ خود ہی بنا لیتا ہے۔ اس کی کیا پروا!"

لالہ جی: "خیر اب یہ بتایئے کہ تیسرے خانے میں کیا ہوتا ہے؟"

خاں صاحب: "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! بائی اس میں بھی ہم کھانے کو ڈال لیتے ہیں۔"

لالہ جی تو اب خاصے پریشان ہوئے۔ گھبرا کر سوال کیا،

لالہ جی: "خاں صاحب! تو پھر سانس کا کیا ہوتا ہے؟"

خاں صاحب: "سانس کی ایسی تیسی، آئے نہ آئے۔ ہم اس کی پروا نہیں کرتا۔"

میں یہ دل چسپ لطیفہ دن کے کھانے پر سنا چکا تھا اور اس لیے سنا چکا تھا کہ میں لالہ جی رہنا چاہتا ہوں۔ خاں صاحب بننے کے لیے تو مجھے تنازع للبقا کرنی ہوگی، ورزش کرنی ہوگی، پہاڑوں پر چڑھنا ہوگا، جہاد کرنا ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے آج کے

دن کے کھانے پر اپنے معدے کے تینوں حصوں کو کھانے ہی سے بھرنا پڑا تھا۔ وزیر صحت اب اسی لطیفے کے حوالے سے پھلجھڑیاں چھوڑ رہے تھے!

ٹونک کے ایک صاحبزادے

ریاست ٹونک کے ایک صاحبزادے صاحب کا حال بھی خاصا دل چسپ ہے۔ ہوا یوں کہ صاحبزادہ صاحب علیل ہوگئے۔ ان کے علاج کے لیے ایک حکیم صاحب طلب کیے گئے۔ شکایت یہ تھی کہ صاحبزادہ صاحب کو بھوک نہیں لگ رہی ہے۔ بے چارے سخت پریشان ہیں۔ جناب حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ ایک روز و شب رہ کر آپ کے معمولات کا جائزہ لے لوں تاکہ تجویز دوا میں کوئی غلطی نہ ہو۔ اس کی حکیم صاحب کو اجازت مل گئی۔

اب میں وہ حالات بیان کرتا ہوں کہ جو جناب حکیم صاحب نے خود مجھے بتائے۔

"میں نے دیکھا کہ صاحبزادہ صاحب صبح اٹھے۔ فارغ ہوئے۔ وضو کیا اور نہایت اطمینان سے نماز فجر ادا کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ شاید تہجد پڑھ چکے تھے۔ مگر میں اٹھ نہیں سکا تھا۔ نماز فجر سے فراغت پا کر صاحبزادہ صاحب نے دو گلاس آب سنگترہ نوش جان فرمایا جو ایک ڈیڑھ درجن سنگتروں کا تھا۔ پھر وہ چہل قدمی کے لیے اپنے کھیتوں میں تشریف لے گئے۔ اس اثنا میں میں نے دیکھا کہ کھانے کا دسترخوان بچھ رہا ہے۔ اور اس پر اس قدر کھانے چنے گئے کہ میں سمجھا کہ درجن بھر مہمان آرہے ہوں گے۔ جناب صاحبزادہ صاحب چہل قدمی کرکے واپس تشریف لائے۔ ہانپ رہے تھے۔ شاید ۱۰-۱۲ منٹ کی چہل قدمی تھی۔ انھوں نے غسل فرمایا۔ نوکروں نے صابون ملا۔ پانی بہایا۔ تیار ہو کر صاحبزادہ صاحب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ اب جو انھوں نے سلسلہ اکل و شرب شروع کیا تو میں غور سے دیکھتا رہا۔ کباب، پراٹھے، اڑد کی بگھری دال، نمکین اور میٹھے چاول، دہی، دودھ غرض ہر چیز جناب صاحبزادہ صاحب کے شکم میں اتری چلی جا رہی تھی۔ ناشتے پر بس صاحبزادہ صاحب تھے اور میں حقیر فقیر سراپا حکیم! میں نے ایک پراٹھا بھی بہ مشکل کھایا اور ایک ٹکڑا کباب کا۔ وہاں دستر

خوان صاف ہو چکا تھا۔ مہمانوں کا انتظار کون کرتا!

"— ناشتے کے بعد صاحبزادہ صاحب نے دو گھنٹے نرم گرم بستر پر آرام کیا۔ اٹھے اور پھر اپنا زمیں داری کا کام کیا۔ لوگوں سے نرم گرم پیش آتے رہے۔ کام کرتے کرتے تھک گئے۔ دن کے کھانے کا وقت آگیا اور میں نے دیکھا کہ ایک بار پھر دستر خوان بچھ رہا ہے اور اس پر کھانا چنا جا رہا ہے! میں سخت حیران ہوا' الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! تھکے تھکائے صاحبزادہ صاحب تشریف لائے۔ ہاتھ دھو کر دستر خوان پر جم گئے۔ مجھے بھی شریک طعام کیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ ان کے ہاتھ ہر قسم کے کھانے پر پڑ رہے ہیں۔ دال اڑد اور پراٹھوں سے رغبت کا اظہار زیادہ ہو رہا تھا۔ مگر بھنا گوشت بھی صاحبزادہ صاحب کو کم مرغوب نہ تھا!

"— دن کا کھانا نوش جاں فرما کر صاحبزادہ صاحب نے اٹھ بیٹھ کر نماز ظہر پورے خضوع و خشوع سے ادا کی۔ پھر بستر لگ گیا۔ صاحبزادہ صاحب ایسے سوئے کہ عصر کی خبر لائے۔ عصر کی اذان ہوئی۔ باغ کی اپنی مسجد میں نماز عصر ادا کرنے تشریف لے گئے تاکہ چند منٹ چہل قدمی بھی ہو جائے۔ واپس آئے تو زمیں داروں اور دوستوں کی آمد ہوئی۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری ہوا۔ شطرنج اور چوسر بھی سامنے تھے۔ خوب محفل جمی تھی۔ حتیٰ کہ بعد از مغرب وقت آگیا۔

"— ادھر صاحبزادہ صاحب نماز عشا کی تیاری کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک گھنٹہ بعد جب تشریف آوری ہوئی تو رات کا کھانا دستر خوان پر چنا جا چکا تھا۔ احباب میں سے چند کھانے کے لیے ٹھیرے۔ میں نے رات کے کھانے کے وقت ایک عجیب بات دیکھی! تین گاؤ تکیے لگائے گئے۔ صاحبزادہ صاحب تشریف لائے تو گاؤ تکیوں کے سہارے تشریف فرما ہوئے۔

"— میری اپنی بھوک بھی جوان ہے اور میں نے تو کمال یہ کیا کہ پورا ایک پراٹھا نوش جان کر لیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ گرم گرم پراٹھے آ رہے ہیں اور نذر شکم ہو رہے ہیں۔

"— اتنے میں صاحبزادہ صاحب کا ارشاد ہوا' ایک تکیہ نکال دو! ملازم تیار کھڑا تھا۔

اس نے ایک گاؤ تکیہ پیچھے سے نکال دیا۔ معدے میں گنجائش بڑھ گئی! اب بیٹھے کا دور تھا۔ شاہی ٹکڑے' متنجن' ربڑی سب ہی کچھ موجود تھا۔

پھر ارشاد ہوا' ایک تکیہ اور نکال دو۔

ملازم نے جلدی سے بڑھ کر ایک تکیہ اور نکال دیا۔

ذرا دیر بعد مصاحبین سے گفت گو ہوئی۔ نقل اور چائے کا دور چلا۔ تیسرا تکیہ بھی نکال دیا گیا۔ صاحب زادہ صاحب کو بہ مشکل زمین سے اٹھایا گیا اور ان کو ان کے بستر پر ڈال دیا گیا۔ میں ان کی نہایت خوب صورت خواب گاہ میں گیا۔ وہاں میں نے بڑا عجیب منظر دیکھا۔ پلنگ کے دونوں جانب بڑی بڑی قابیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف فواکہات رطبہ ان میں بھرے ہوئے اور دوسری جانب کی قاب فواکہات یابسہ بادام' کشمش وغیرہ سے اٹی ہوئی تھی۔

"— مجھے بتایا گیا کہ جناب صاحبزادہ صاحب اپنے ملازمین کے آرام کا بڑا خیال فرماتے ہیں۔ رات کو کسی ملازم کو تکلیف نہیں دیتے۔ جب رات کو بھوک لگتی ہے تو جدھر کروٹ ہوتی ہے خود ہی فواکہات رطبہ و یابسہ نوش فرما لیتے ہیں۔

"— میں یہ سارا ماجرا دیکھ کر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ صبح ہوئی' کھڑے ہوئے۔ میں نے اٹھ کر صاحبزادہ صاحب کا استقبال کیا۔ خواب گاہ میں جھانکا تو فواکہات رطبہ و یابسہ سب صاف تھے!

"— میں نے نماز فجر صاحبزادہ صاحب کے باغ کی مسجد میں ادا کی اور پھر میں ادب و احترام کے ساتھ ان کے منیجر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

جناب صاحب صاحب زادہ صاحب کو قلت اشتہا (بھوک کی کمی) کا مرض لاحق ہے۔ میں نے ان کے معمولات گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں دیکھ لیے ہیں۔ کیا اب وہ مجھے نوش جان فرمائیں گے!

"— یہ جملہ کہہ کر میں وہاں سے ایسا بھاگا کہ آج تک نہ میں نے صاحبزادہ صاحب کو دیکھا اور نہ انھوں نے میری گستاخی پر مجھے کوئی سرزنش کی!"

ہم شراب خانہ نباتات سے باہر آئے۔ جناب وزیر صحت نے نہایت احترام و اکرام

سے مجھے اور سعدیہ کو رخصت کیا۔ حتیٰ کہ میری موٹر کار کا دروازہ بھی انھوں ہی نے بند کیا۔ میں نے ان کی سادگی اور ان کی عظمت کو سلام کیا اور ان کی رفعتوں کے لیے دعائیں دیتا ہوا ہوٹل ازبکستان آگیا۔ گو آج ایک " تھیٹر جواناں " کا پروگرام تھا۔ مگر فیصلہ یہ ہوا کہ بس اب آرام کرنا چاہیے۔ نماز عشا قصر ادا کی اور میں ۸ بجے ہی بستر میں دراز ہوگیا تاکہ کل کے لیے خود کو تیار کرلوں۔

شاعر کا دل

ان دنوں یہاں نامور ازبیک شاعر، روشن خیالی کے مبلغ، ڈرامہ نویس، نغمہ نگار، معلم اور صحافی حمزہ حکیم زادہ نیازی (قلمی نام ۔ نہاں) (۱۸۸۹ تا ۱۹۸۹ء) کی صد سالہ سال گرہ منائی جا رہی ہے۔ معاصرین کی نگاہ میں حمزہ جبر و ظلم، جھوٹ اور عدم مساوات سے پاک زندگی اور سچائی کے اعلا و ارفع مقاصد کی ترجمانی کرنے اور آزادی کے گن گانے والے شاعر تھے۔

حمزہ نے روشن خیالی کے تصورات کو مرکز توجہ بنایا اور ان کی تعمیل میں خود بھی انتہائی سرگرمی سے حصہ لیا۔ انھوں نے آبائی شہر قوقند میں غریبوں کے لیے پہلا مفت اسکول کھولا۔ حمزہ کی روشن خیالی کی سرگرمیاں ان کے دیگر معاصرین کی ایسی ہی سرگرمیوں سے مختلف اور جمہوری نوعیت کی تھیں۔

حمزہ ساری قوم کی روشن خیالی کے حامی تھے۔ انھوں نے اسے جس کی اکثریت ناخواندہ تھی، روشن خیالی کی نعمتوں سے فیض یاب کرنے کے لیے تھیٹر سے کام لیا، اور شوقیہ تھیٹریکل گروپ منظم کر کے اہم موضوعات پر ناٹک بھی قلم بند کیے۔ صرف اتنا ہی نہیں حمزہ نے عوامی گیتوں کا ایک منفرد مجموعہ ترتیب دیا، خود انھوں نے بھی ان گنت گیت تخلیق کیے اور ان کے لیے دھنیں بھی بنائیں۔

انقلابی موضوعات اور آزاد محنت کے احساس نے حمزہ کی شاعری کو منفرد معانی بخشے۔ انھوں نے دل و جان سے محسوس کیا کہ عوام کو حقیقی آزادی ملی ہے اور انھیں عام تعلیم دینے کا وقت بھی آگیا... لیکن صد افسوس کہ مقدر نے اپنا کام کر دکھایا۔ چالیس

سالہ حمزہ جاہل طاقتوں کی سازشوں کا شکار ہو گئے۔

مندرجہ ذیل حمزہ کی کچھ تخلیقات ملاحظہ ہوں جن کا اردو میں ترجمہ لکھنؤ کے ممتاز شاعر اور مترجم سلیم نے کیا ہے:

ہمیشہ خاروں سے عاشق کی زندگی بسمل
ہمیشہ غیروں سے آباد یار کی محفل
ثواب عشق کا معشوق کو میسر ہے
تو کس کے سر پہ پھر اس کا عذاب ہو نازل ؟

☆ ☆ ☆

چرخ کے نیچے لگا ہے کچھ عجب بازار سا
ساتھ ہے سرمایہ غم کے ہر اک تیار سا
محنت ارزاں اور گراں نیکی مگر انجام ایک
موت ہے مکار، سب اس کے لیے بیکار سا
بیگ ہے اپنا تواضع پیشہ پر کافر ہے وہ
ہر امیر اس کو نظر آتا ہے اک دلدار سا
سرنگوں ہر عاشق حق کا ہے اور آنکھیں ہیں خوں
کہنہ پوش اور زیر پا مانند خس ہے خوار سا
میرا جام صدق حوض حق میں ہو شاید ہی غرق
جام و حوض، ان میں ہے کوئی ایک پر سرار سا
کرتا ہے پتھر کو بھی گوہر محبت کا کمال
ہے وہ طالب کی نگاہوں میں در شہوار سا
کر نہ ورد راز کو تو اپنے اوپر بھی عیاں
اپنے اندر بھی ہے اک دشمن عجب خونخوار سا
اہل دانش کا ہر اک لفظ اک معما ہے، سمجھ
پند اہل علم کو رد کرتا ہے بیکار سا

لوگ طعنہ دیں نہاں تو اب نہ مانو تم برا
ہوتا ہے سب کے لیے ہر طعنہ پر اشعار سا

☆ ☆ ☆

مری مانند کوئی بھی نہ اپنے یار سے بچھڑے
نہ اپنے مونس غم خوار سے، دلدار سے بچھڑے
خزاں آئے نہ ہستی میں تمنا گر نہ ہو پوری
نہ کچھ دن بعد بلبل کی طرح گلزار سے بچھڑے
نہ ہرگز مہرباں سے اپنے ہو محروم کوئی بھی
نہ طاؤس چمن اپنی حسین رفتار سے بچھڑے
مری مانند اتنا بے سر و ساماں نہ ہو کوئی
کہ سینہ چاک ہو، مثل صدف وہ ہار سے بچھڑے
نہ ہو پیکان صیاد اجل پیوست سینے میں
نہ آہو جس سے ہے مشک ختن، تاتار سے بچھڑے
نہ ہو محروم کوئی خواب چشم اور راحت تن سے
نہ اپنے دلبر رعنا سے، خوش گفتار سے بچھڑے
اٹھا کر آسماں کی سمت سر فریاد کرتا ہوں:
نہ دشمن تک کبھی بھی اپنے گل رخسار سے بچھڑے
کوئی مرد خدا ہے گاڑ دے سینے میں جو خنجر
نہاں تاکہ نہ اپنی دولت اسرار سے بچھڑے

☆ ☆ ☆

چمن میں گل نہ کھلتے موسم گرما نہ آتا گر
نہ پروانے جھلتے، شمع کا ہوتا نہ سودا گر
ہوا رسوا مگر لیلی کو آخر پا گیا مجنوں
نہ پاتا، چھانتا پھرتا نہ یوں وہ خاک صحرا گر

پہاڑوں پہ نہ پتھر کاٹتا فرہاد روز و شب
نہ گاہے گاہے شیریں پوچھتی حال آ کے اس کا گر
کیا کرتا پڑا دہلیز پر آہ و بکا وامق
اٹھاتا سر نہ وہ اس کو نظر آتی نہ عذرا گر
کسی کی بھی نہ سنتا کوئی طاہر بے خود
نہ پڑتی اس کے کانوں میں کبھی آواز زہرا گر
کبھی بھی ہاتھ آ سکتا نہیں تھا یوسف رعنا
نہ پیچھے دوڑتی جی جان سے اس کے زلیخا گر
نہ اٹھتی موج اہل عشق کے دریائے الفت میں
نہ گاہے گاہے معشوق اس طرح احسان کرتا گر
نہاں کے صبر کا پیمانہ ہے لبریز ہونے کو
زباں کو تیری جو شہد و شکر ہے اب نہ چوسا گر

☆ ☆ ☆

ظلمت دل کے لیے چاہو جو شمع بے مثال
صحبت دانا سے تم کرتے رہو کسب کمال
مت کرو بیہودہ نعرے زور بازو سے بلند
مرد ہو تو حرص کو کردو نہتے پائے مال
سب کو خوش رکھو یہی طاعت ہے، ہو کر متقی
مت کرو لوگوں کو حیراں اور پراگندہ خیال
نیک بننا ہے تو اخلاق و ادب سے کام لو
ہوگے تم فضل و سکوں سے دو جہاں میں مالا مال
کس کو دنیا میں نہیں ملتے ہیں آزار و الم
کیا کہے گا حشر میں تو اے نہاں وقت سوال

☆ ☆ ☆

جہاں کو دیکھ ، آنکھیں کھول ، یہ سب ماجرا کیا ہے
بشر ، غیر البشر ہر اک کا مقصد اپنا اپنا ہے
ہر اک لمحے کی قیمت ہے ، نہ اپنا وقت ضائع کر
بہار اور موسم گرما پھر ان کے بعد سرما ہے
نہ اوروں کے لیے خود کو نمونہ تو بنا زاہد
جدا سب کے طریقے ہیں ، معاون سب کا ہوتا ہے
تصور کر نہ تنہا خود کو پیکر خوبیوں کا تو
ہے رکھتا مدعا دل میں جو اس دنیا میں آیا ہے
نہ کر یوں طنز تو اطوار پر اوروں کے اے ناکس
کہ ہر تن محفل قدرت میں خود ہی شاہ اپنا ہے
غم جاناں کے آگے کچھ نہیں یہ سب غم دوراں
بجز الفت جہاں میں ہر مرض کا کچھ مداوا ہے
نہاں عاشق ہوں سب کامراں تو نام پر ان کے
جلاؤں دائمی خورشید یہ محکم ارادہ ہے

☆ ☆ ☆

جو دانش ور ہے اس کے واسطے دنیا یہ زنداں ہے
ہزار اندوہ و غم ہیں ہر نفس میں جن سے نالاں ہے ۔
گرفتار قفس اک صوت بلبل نے کیا اس کو
مگر زاغ و زغن کے شور پر دل کس کا قرباں ہے
نہ ہر اک کو بتاؤ بھید مونس جان کر ، اس کا
تمہیں مشکل میں تنہا چھوڑ کر چل دینا آساں ہے
نہ ناکس کو کرو ہم راز ، وہ کیا اس کی الفت کیا
کہ نابینا سمجھتا قیمت گوہر کو ارزاں ہے

۱۰ نومبر ۱۹۸۹ --- جمعۃ المبارک

تاشقند

ان دنوں پورے روس میں جشن جواہر لال نہرو منایا جا رہا ہے ۔ ہر بڑے شہر میں کوئی نہ کوئی پروگرام بہ یاد و احترام نہرو ہو رہا ہے ۔ تاشقند میں انجمن دوستی کے آڈیٹوریم میں آج ایک روس ۔ ہند نہرو کانفرنس ہے جس کا عنوان " اسلحہ سے پاک دنیا " ہے ۔ ہندستان سے دو خواتین ، تین چار ہندو اور ایک سکھ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں ۔ روس کے بھی چند اسکالرز ہیں ۔ ان میں ایک محترمہ صباحت صاحبہ بھی ہیں جن سے کل تبادل خیال کا موقع ملا تھا ۔

میں نے موسکو ہی میں کہہ دیا تھا کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کروں گا ۔ صبح دس بجے میں انجمن دوستی ازبیکستان شاخ کے دفتر میں آگیا ۔ کانفرنس کی صدارت انجمن دوستی کی محترمہ صدر نے کی ۔ ہندستان سے آئے ہوئے مندوب نے تقریر پہلے کی اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تقریر تمام و کمال خارج از موضوع تھی ۔ ہندستان کی ایک خاتون کی تقریر یقیناً خوب تھی اور ایک محترمہ نے بھی بہت اچھے نکات پیش کیے ۔ کہا گیا تھا کہ میں بھی چند کلمات کہہ دوں ، مگر میں نے اس لیے دخل در معقولات نہیں کیا کہ میں اس کانفرنس کا مندوب نہ تھا ، گو میرا دل چاہتا تھا کہ میں پنڈت نہرو کے بارے میں اپنے دلی تاثرات بیان کردوں ۔ اگر ہندستان کے وفد کے قائد مجھ سے کہتے تو میں یقیناً تیار ہو جاتا ۔ اس لیے کہ صدر کانفرنس محترمہ صدر انجمن دوستی نے اپنی صدارتی تقریر میں میرا نام احترام و اکرام سے لیا کہ اس کانفرنس میں پاکستان کے جناب حکیم محمد سعید صاحب بھی شریک ہوئے ہیں ۔ تقاضائے احترام یہ تھا کہ میں بھی چند کلمات عرض کرتا ، مگر پروٹوکول اس کی حمایت میں نہ تھا ۔ میں بین الاقوامی سطح پر ان چیزوں کا خیال رکھنا مناسب سمجھتا ہوں ۔

صدر فرینڈشپ سوسائٹی ازبک شاخ

جناب محترم مرزا یوف صاحب نے صبح ہی بتا دیا تھا کہ صدر انجمن دوستی آج آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں ۔ نہو کانفرنس سے وہ پونے بارہ بجے فارغ ہوئیں اور پھر میں نے ان کے دفتر میں ان سے باتیں کیں ۔ اس گفت گو میں سعدیہ بھی شریک رہیں ‘ کیوں کہ وہی تمام گفت گوئیں اور تبادل خیالات کے نوٹ لے رہی ہیں ۔ میری توجہ اب غور و فکر پر ہے ۔ جناب محترم مرزا یوف صاحب بہ حیثیت مترجم نیز انجمن دوستی کے سرگرم رکن کی حیثیت سے شریک گفت گو رہے ۔ نیز ماسکو سے میرے ساتھ آئے ہوئے جناب ڈاکٹر گناوی بہر حال ہر جگہ ساتھ رہتے ہیں ۔ جناب گناوی صاحب انجمن دوستی کی مجلس صدارتی کے نائبین میں شامل ہیں اور نہایت شفیق و عمیق انسان ہیں ۔

☆ ہم نے ایک دوسرے کا شکریہ ادا کیا کہ سفر روس ممکن ہوا ۔ ان کی طرف سے شکریہ یہ کہ میں نے روس کے سفر کے لیے وقت نکالا اور آپ آج تاشقند بھی آئے اور ہمارے دفتر میں قدم رنجہ فرمایا ۔ میں نے اپنی طرف سے اور سعدیہ کی طرف سے شکریہ مہمان نوازی ادا کیا ۔ میں نے اظہار کیا کہ ہر جگہ دوست حد درجہ احترام دے رہے ہیں اور مہمان نوازی کا مرتبہ بلندیوں پر ہے ۔

☆ پاکستان اور روس کے مابین تعلقات کے موضوع پر تبادلِ خیال میں میں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ ان کو انسان دوستی اور احترام انسانیت کی بنیادوں پر استوار کرنے کی جد و جہد کرنی چاہیے ۔ انسان سب برابر ہیں ۔ انسان کو انسان سمجھنے کا عالمی شعور بیدار کرنے کی سعی پیہم کرنی چاہیے اس لیے کہ عالمی سطح پر اس فکر و نظر میں ان گنت دراڑیں پڑ چکی ہیں ۔ اس نقصان عظیم کا ادراک کرنا چاہیے اور تدارک کی سبیل کرنی چاہیے ۔

☆ روس کی موجودہ قیادت کو اس انداز فکر سے آج سرشاری حاصل ہے ۔ مجھے یہ توقع ہے کہ جناب محترم صدر روس ‘ گوربا چوف صاحب اس میدان میں مثبت اقدامات کر سکیں گے ۔ اور ان کی راہ میں جو مشکلات ہیں ان کو عبور کرلیں گے ۔۔

ظاہر ہے کہ ان کے لیے داخلی مشکلات بھی ہیں اور خارجی مسائل بھی ۔

☆ باہم اس موضوع پر بھی گفت گو ہوئی کہ شعری و ادبی تعلقات کی استواری پر توجہ کرنی چاہیے ۔ میں پاکستان ۔ روس مشاعرے کا حامی ہوں ۔ اس پر اتفاق رائے ہوا ہے ۔

روس ہندستان تعلقات ۔ ا

آج نہو کانفرس میں جو مقالات پیش ہوئے ان میں پنڈت جواہر لال نہو کی عالمی دوستی کی باتیں ہوئی ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندستان کے اپنے تحفظات کے ساتھ نہو صاحب عالمی برادری کے جذبات رکھتے تھے ۔ پنڈت نہو کے ساتھ مجھے نئی دہلی میں تبادل خیال کا موقع ملا ہے ۔ میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ ہندو مذہب کی تکمیل کے لیے گہرے جذبات رکھتے تھے ۔ ان کا انداز فکر یہ رہا ہے کہ ہندو مت کو عالم گیریت بدون تکمیلیت حاصل نہیں ہوگی ۔ ان کی مجبوریاں یہ رہی ہیں کہ وہ ہندو مت میں جو کمیاں ہیں ان کا مسلسل اور علی الاعلان اظہار نہیں کر سکتے تھے ۔ ہندو مہاسبھا ان کی مطلقاً دوست نہ تھی ۔ جو آر ۔ ایس ۔ ایس ہندستان کی عظیم شخصیت مہاتما گاندھی کو قتل کر سکتی ہے وہ ہندستان کے ہر لیڈر کو نقصان پہنچا سکتی ہے ۔ اس کے باوجود پنڈت جواہر لال نہو علی الاعلان سوشلزم کے حامی رہے ہیں ۔ آزادی سے قبل بھی ‘ اور آزادی کے بعد اقتدار کے حال میں بھی ۔ جب میں اس پر غور کرتا ہوں کہ اسلام میں سوشلسٹ نظریات سے بھی زیادہ شدید جذبات برائے عظمت انسان موجود ہیں ‘ اور اسلام سب سے زیادہ انسان کی عظمت کا حامی ہے تو میں یہ غور کرتا ہوں کہ پنڈت جواہر لال نہو مسلمانوں کے مابین رہ کر اور مولانا ابوالکلام آزاد ‘ ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ مسلم رہنماؤں سے صحبت پاکر کیوں نظریات اسلام کو قبول نہ کر سکے اور ان کو روس کے سوشلزم میں پناہ کیوں ملی ؟ گہرائی میں جاتا ہوں تو اس کی ایک نہایت واضح وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہندستان میں اسلام اور ہندو مت کے مابین کبھی مفاہمت نہ ہو سکی اور مسلمان اور ہندو تمام زندگی بر سر پیکار رہے ہیں ۔ پنڈت

جواہر لال نہرو اس اختلاف کی بنا پر اسلام کے حق میں کوئی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے گو وہ اسلام کے نظریات پر عبور رکھتے تھے، مگر ہندو ہونے کی حیثیت سے اور ہندستان پر حکومت کرنے کے لیے ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اسلام کے بارے میں اپنے اچھے خیالات کا اظہار نہ کریں۔ ان کی یہ انسانی مجبوری تھی جس پر ان کو قابو تھا اور نہ عبور حاصل ہو سکتا تھا۔

انڈین نیشنل کانگرس یقینی طور پر اس انداز فکر کے ساتھ معرض وجود میں لائی گئی تھی کہ کانگرس ہندو اور مسلمان کے مابین استواری تعلقات کا پل بنے گی اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس انداز فکر نے مدد کی، مگر پورے تسلسل کے ساتھ حالات یہ رہے ہیں کہ انڈین نیشنل کانگرس پر ہندو اکثریت غالب رہی اور مسلمان اس میں موثر کردار ادا نہ کر سکے۔ اس میں ہندو رہنماؤں کی کمزوریاں اور غلطیاں بھی ہیں جو انڈین نیشنل کانگرس کے مزاج کو لادینی نہ رکھ سکے اور مسلمانوں کی شمولیت بھی اسے غیر مذہبی نہ بنا سکی۔ بہ ایں ہمہ آزادی کے لیے جنگ انڈین نیشنل کانگرس نے لڑی۔ اس میدان میں ہندو مہاسبھا کو عالمی مرتبہ و وقار حاصل نہ ہو سکا جب کہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہندو مہاسبھا نے انڈین نیشنل کانگرس کو ہندو مزاج سے باہر نہیں جانے دیا۔ اس کے بعد جب انڈین نیشنل کانگرس کی کمزوریوں کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ میدان عمل میں آگئی تو انڈین نیشنل کانگرس کو اپنی خودی کو برقرار رکھنا ناممکن ہوگیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ آل انڈیا مسلم لیگ ہندو مہاسبھا اور اس جیسی دوسری تنظیموں کے مد مقابل ہونے کے جذبات کے ساتھ برسر عمل ہوئی تھی۔ اگر اسے کانگرس کے مزاج کو ہندو رکھنے میں کام یابی حاصل ہوئی۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ جنگ آزادی کے لیے انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی جداگانہ جدوجہد ناکام ہوئی ہے۔ آزادی کی جنگ کو جیت لینے میں دونوں جماعتوں کی جدوجہد کو کامرانی کا شرف حاصل ہے، مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اس میں انگریز نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں حتما یہ رائے رکھتا ہوں کہ تحریک آزادی کے بعد انگریز کے لیے ہندستان میں حاکم اور باوقار رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

تقسیم ہند کے ذمہ دار نہ انڈین نیشنل کانگرس ہے اور نہ آل انڈیا مسلم لیگ اسے کام یابی کا عنوان دیکر اپنے نامہ اعمال میں لکھ سکتی ہے۔ اگر انگریز نہ چاہتا تو ہندستان تقسیم نہیں ہو سکتا تھا۔ انگریز کو اس سے ایک بدیہی فائدہ تو یہ حاصل ہو کر رہا کہ تقسیم ہو کر ہندستان کمزور ہوگیا۔ ایک اور بین فائدہ یہ ہوا کہ ہندستان کا نہایت مضبوط مسلمان اپنی طاقت و قوت تقسیم کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ انگریز مسلمان دوست نہیں تھا۔ اس نے ہندستان پر اپنے زمانہ حکم رانی میں مسلمان کو کم زور رکھنے میں بھرپور کام یابی حاصل کی۔ وہ آزادی ایسے حالات میں منظور نہیں کر سکتا تھا کہ کل ہندستان پر ایک بار پھر مسلم حکمرانی ہو جائے۔ اس نے بیک آن نہ صرف ہندستان کو کم زور کردیا بلکہ اس نے اسی ایک حربے سے ہندستان کی بے پناہ مسلم طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ ہندستان میں رہ گئے مسلمان کو قیادت سے قطعاً محروم کر دیا، حتیٰ کہ آج ۴۲ سال بعد بھی ہندستان میں کوئی مسلم رہنما میسر نہ آسکا۔ اور کم از کم پندرہ سولہ کروڑ ہندستان کے مسلمان قطعی طور پر ہندو کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان میں انگریز نے ایسے حالات پیدا کردیے کہ پاکستان اپنے پیروں پر کبھی کھڑا نہ ہو سکے۔ کہنا چاہیے کہ ایسے حالات بالاخر پیدا ہو کر ہی رہے۔

اس وقت مجھے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی باتیں یاد آرہی ہیں۔ ان کا مشورہ میرے لیے یہ تھا کہ میں پاکستان نہ جاؤں بلکہ مجھے اپنے بھائی جناب محترم حکیم عبدالحمید صاحب کے ساتھ ہندستان میں رہنا چاہیے۔ مگر میں اپنی مزاجی کیفیت کی بنا پر ہندو استعمار کا خیر خواہ نہیں رہ سکتا تھا اس لیے تقاضائے اخلاق یہی تھا کہ میں ہندستان چھوڑ دوں اور پاکستان کی تعمیر میں حصہ لوں جسے قیام کے بعد ہی ہمہ دم اور ہزار خطرات لاحق ہو چکے تھے۔

میں بات پنڈت جواہر لال نہرو کی کر رہا تھا کہ ان کے معتدل مزاج نے یکسر سوشلسٹ اسلام کو کیوں قبول نہیں کیا اور وہ کیوں روس کے سوشلزم کی طرف مائل ہوئے؟ ایک وجہ میں نے تفصیل سے بیان کر دی ہے۔ دوسری وجہ یقیناً یہ تھی کہ مسلمان خواہ وہ ہندستان میں تھا یا دنیا میں کہیں اور خود اسلام پر عمل پیرا نہ تھا۔ جواہر

لال نہرو جیسا زیرک انسان نظریہ و فلسفۂ اسلام کے احاطے سے عاری ہرگز نہ تھا۔ مگر وہ اندرون ہند ہندو خطرات کا مقابلہ اسی وقت کر سکتا تھا کہ جب خود اہلِ اسلام عمل پیرائے اسلام ہوتے۔ ایک طرف مسلمان پورے تسلسل کے ساتھ ہندو سے برسر پیکار رہا دوسری طرف اس کا اپنا حال یہ تھا کہ شیعہ سنی فسادات معمولات زندگی تھے۔ دیو بندی' بریلوی مناقشات عنوان زندگی تھے۔ قیادت مسلم اس درجہ بے اثر رہی کہ مسلمان کا مرتبہ اخلاق پورے ہندستان میں پست ہوگیا۔ قیادت زر پرست ایسی ہوئی کہ کردارِ مسلم داغ دار ہوگیا۔

ہندستان کو مضبوط بنانے کے لیے اور ہندستان کے غالب مذہب کی کم زوریاں دور کرنے کے لیے جواہر لال نہرو کے لیے سوشلزم کو مزاجِ ہند میں داخل کرنا ضروری ہوگیا۔ اور چوں کہ سوشلزم روس میں کامرانیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا اور کام یابیاں اس کا عنوان تھیں اس لیے نہرو صاحب کو یہاں حالات استوار ملے۔ یہ بات خارج از ذہن نہ رہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو ذہنی اور بنیادی طور پر چین سے قریب تر تھے۔ وہ چین دوستی کو فوقیت دیتے تھے۔ بنڈونگ کانفرنس میں ان کا انداز فکر اس حقیقت کا غماز رہا ہے کہ وہ "ہندی چینی بھائی بھائی" کو اولیت اور فوقیت دیتے تھے۔ مگر چین سے ہند کے تعلقات جن حالات میں خراب ہوئے میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا' مگر اس میں روس کی قیادت اور سیاست کو ضرور دخل ہے۔ روس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ چین و ہند کی طاقت کو اپنے لیے خطرہ بننے دے۔ روس کے عین مفاد میں یہ تھا کہ ہند اور روس دوست بن کر چین کو ایشیا میں بے اثر رکھے رہیں۔ چناں چہ ایسے حالات پیدا ہوکر رہے اور روس کو چین کے خطرۂ دوام سے نجات مل گئی۔ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بھی حکمتِ عملی کا دخل ہے کہ انھوں نے روس میں اپنے لیے خیر سگالی کے لازوال جذبات چھوڑے ہیں۔ اس کے ساتھ روس میں نہرو احترام سیاست روس سے بھی عبارت ہے۔ روس کو ہندستان کی دوستی درکار ہے۔ روس اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہے کہ ایک وقت ضرور آکر رہے گا کہ چین و ہند باہم دوست ہوں گے۔ اس لیے روس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ روس ہند

دوستی کو جس قدر زیادہ عرصہ ممکن ہو برقرار رکھے۔ وہ ہر طرح ایشیا کی بڑی طاقت ہندستان کو اپنا حلیف رکھنا چاہتا ہے۔ چین کی طاقت کے پھیلاؤ کو قابو میں رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

روس کی موجودہ قیادت نہایت احتیاط کے ساتھ اب چین سے دوستی کے خیالات اور جذبات کو پروان چڑھا رہی ہے۔ میں مستقبل میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندستان' چین اور روس دوستی میں پڑ جائیں گے۔ روس کے یہ اعلا تر مفادات میں ہے کہ وہ اس اتحاد ثلاثہ کو جلد از جلد وجود دے دے۔ جس دن ایسا ہوگا اس کے بعد پاکستان' افغانستان' ایران' خلیج کی ریاستیں اور امارتیں اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکیں گی۔ اور چوں کہ امریکا ان علاقوں میں اپنا وقار مجروح کرچکا ہے اس لیے یہ سارے کا سارا علاقہ اتحاد ثلاثہ سے اپنے تعلقات استوار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔' اس اثنا میں اگر مسلم قیادت نہ ابھری تو روس' ہندستان' چین کے مسلمان بھی کم زور رہیں گے اور پاکستان' ایران' افغانستان اور ریاست و امارت ہائے خلیج بے اثر رہیں گی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر مسلم قیادت قائم ہوگئی تو اس سارے علاقے میں مسلمان ایک ارب سے زیادہ ہیں۔ اتحاد ثلاثہ چین و ہند و روس سے بنگلا دیش' انڈونیشیا' ملایشیا وغیرہ کا متاثر ہو جانا لازمی ہوگا' اور شاید یہ اتحاد ثلاثہ کے زیر اثر رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

روس - ہندستان تعلقات - ۲

ہندستان میں مختصر عرصے کے لیے عشرہ ۱۹۶۰ء میں جناب لال بہادر شاستری کی حکومت بنی پھر عشرہ ۱۹۷۰ء میں جناب مرار جی ڈیسائی برسر اقتدار آئے۔ ان مختصر مدتوں کو چھوڑ کر ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد کے تمام عرصے میں نہرو خاندان ہندستان پر حکمراں رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سوشلسٹ نقطۂ نظر کے مدعی تھے۔ ان کی بیٹی اور پھر راجیو نے بھی اس پالیسی کو اپنائے رکھا۔ اسی وجہ سے روس کے ان سے تعلقات ہمیشہ بہتر رہے ہیں۔

ہندستان کی آبادی ۷۴ کروڑ ہے۔ چین کے بعد سب سے زیادہ آبادی والا یہ دوسرا ملک ہے۔ یورپ اور امریکا اور روس سب ہندستان سے تعلقات کے متمنی رہتے ہیں' کیوں کہ ان کے لیے ایک بہت بڑی مارکیٹ بھی ہے۔ چناں چہ جب بھی ایسا ہوا کہ ہندستان میں نہرو خاندان سے الگ کسی پارٹی کی حکومت بنی روسی سفارت کاروں نے خاصے اضطراب کا مظاہرہ کیا۔ انھیں یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں مقناطیسی سوئی دوسری طرف نہ گھوم جائے۔

جب مرار جی ڈیسائی آئے تھے تو اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جناب **وورونتسوف** نے دہلی کا دورہ کیا۔ اب بھی یہی ہوا۔ جناب **وورونتسوف** دہلی آئے۔ ارباب اختیار سے ملے۔ جناب **وورونتسوف** نائب وزیر خارجہ ہیں۔ جنوبی ایشیا کے امور کے ماہر خصوصی ہیں۔ ان کی رائے ان کے عہدے سے زیادہ وزنی سمجھی جاتی ہے۔

ہندستان کے روس کے ساتھ کئی مفادات وابستہ ہیں۔ ایک مدت سے ہندستان روس سے معاشی اور فوجی امداد لے رہا ہے۔ ہندستان یورپ اور امریکا کے سوفسٹی کیٹڈ اور قیمتی سامان کے بجائے روس کے مال کو اپنے ملک کے لیے مناسب سمجھتا ہے' اس لیے روس اور ہندستان کے درمیان گہرے تجارتی تعلقات قائم ہیں۔ بعض بین الاقوامی امور مثلاً افغانستان اور مسئلہ کشمیر میں بھی ہندستان روس کا اور روس ہندستان کا ہم نوا ہے۔

ایک اور وجہ جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یہ ہے کہ ہندستان کے چند صوبوں میں کمیونسٹوں کی خاصی تعداد ہے اور وہ ہندستان کے انتظامی سربراہ یعنی وزیراعظم کے انتخاب میں خاصا اثر رکھتے ہیں۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ چناں چہ ان تمام امور کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب **وورونتسوف** کم از کم اس بات کی حد تک کام یاب ضرور ہوئے ہوں گے کہ ہندستان روس سے اپنے دیرینہ تعلقات کو اسی سطح پر قائم رکھے جس سطح پر کہ وہ تھے۔

روس میں اتنی تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں کہ وہ خود اب کوئی طویل المیعاد وعدہ

کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے البتہ اس موقع پر کہ جب اس کو ایک اور انقلاب کا سامنا ہے وہ یہ چاہے گا کہ زیادہ سے زیادہ ملک اس کے ہم نوا رہیں۔

ہندستانی تجزیہ نگاروں نے جناب **وورونتسوف** کی بات چیت پر اطمینان کا اظہار کیا ہے اور انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سوویٹ یونین اور ہندستان میں اور پوری دنیا میں حالات اس بات کے حق میں ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات کو زیادہ بہتر بنایا جائے۔

اب جب روس و ہند کے تعلقات پر میں غور کر رہا ہوں تو مجھے اس موقع پر روس کے دوسرے ممالک سے تعلقات پر بھی ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے تاکہ روس کا انداز فکر اور روس کے بارے میں دوسروں کا انداز فکر واضح ہوجائے۔ اس صورت حال کا جائزہ لینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ روس اور امریکا کی باہم گفت و شنید حد درجہ حامل اہمیت ہوتی جا رہی ہے' بالخصوص عالم اسلام کے تناظر میں اس کی زبردست اہمیت ہے۔ میری رائے کے مطابق روس اور امریکا پوری قطعیت کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں اور اس پر متفق ہیں کہ عالم اسلام کو دبائے رکھا جائے اور کم از کم آنے والے پچاس سال تک ان کو مفلوج رکھا جائے۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ عالم اسلام نے اس نہایت خطرناک انداز فکر کا کما حقہ ادراک نہیں کیا ہے اور وہ اپنے دفاع کی طرف سے غافل ہے۔ عالم اسلام میں جو باہم اختلافات ہیں اور جو کویت میں عالم اسلام کی سربراہ کانفرنس میں واضح ہوکر سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں یہ خدشہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ روس اور امریکا کی پالیسی مسلمان عالم کو باہم مل بیٹھنے سے محروم کردینے کی سیاست اختیار کرے گی اور ان میں اختلافات کو ہوا دے گی۔ اس پالیسی کا مظاہرہ ایران عراق جنگ میں ہو چکا ہے۔ اس قسم کے متعدد مظاہروں سے صرف نظر کوتاہی فکر ہوگا۔

امریکا روس تعلقات

آج کی دنیا میں تبدیلی کا عمل اتنا تیز رفتار اور ڈرامائی ہے کہ ان کی تفصیلات کا

ہمیں بہ مشکل ہی علم ہوتا ہے ' ان کی وسعتوں اور امکانات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں جو جدید ترقی ہو رہی ہے وہ غالباً ماضی کے انکشافات کو مقابلتاً غیر اہم بنا کر رکھ دے گی ۔ جدید ترین کمپیوٹر ' نئے آلات و سامان اور حیاتیاتی ٹکنالوجی کے جدید طریقہ ہائے کار ہماری زندگی ' موت اور افزائشِ نسل کے ہر ہر مرحلے پر اثر انداز ہو کر ان میں تغیر و تبدل کا سبب بن رہے ہیں ۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا یہ ارتقا آج کی مادی زندگی اور آج کے سماجی و سیاسی روابط میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کر رہا ہے ۔ جمہوریت کی طرف عالمی رجحان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو آزادی اور انسانی حقوق حاصل کرنے کی طرف پیش قدمی کی دعوت دیتی ہے ۔ آج ایسے عوام اور اقوام کی تعداد انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ ہے جو اپنی حکومتوں کا آزادانہ انتخاب کرتے ہیں یا اس سمت میں پوری قوت سے آگے بڑھ رہے ہیں ۔ حالات سازگار ہوں یا نہ ہوں عوام بہرحال آزادی و خود مختاری کو پسند کرتے ہیں ۔

اس رجحان کو آگے بڑھانے میں صرف عدل و انصاف کی خواہش کا ہی دخل نہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ بڑھتا ہوا احساس ہے کہ جمہوریت بہترین سیاسی عمل ہے ۔ حکومتوں اور معاشروں کو یہ تجربہ ہو رہا ہے کہ تبدیلیوں سے ہم آہنگ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ان پر معلومات ' نئے نظریات اور آزادی کے دروازے کھلے ہوں جن سے صلاحیتوں کو آگے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا موقع ملتا ہے ۔

آزاد عوام اور آزاد منڈی ایک ساتھ مل کر ہی آگے بڑھتے ہیں ۔ ریاستی کنٹرول میں مرکزی منصوبہ بندی تبدیلیوں کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی ۔ ایک ایسی سوسائٹی جو سخت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہو اس دنیا میں اپنی مسابقت جاری نہیں رکھ سکتی جہاں ہر وقت معلومات کے دھماکے ہو رہے ہوں اور یہ معلومات کسی قومی سرحد کی پابند نہ ہوں ۔

انسان آج ایک ایسے عہد میں سانس لے رہا ہے کہ جہاں کوئی سوسائٹی یا اس کے عوام نئے نظریات اور نئی نئی معلومات سے خود کو الگ تھلگ رکھ ہی نہیں سکتے ۔ قومی

سرحدوں کے اندر ویکسین (ٹیکے) کو تو آنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن جراثیم ' نظریات و خیالات اور نشریات کو ملک میں داخل ہونے سے یہ سرحدیں نہیں روک سکتیں ۔ اس نئی حقیقت کا ایک لازمی جغرافیائی و سیاسی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کسی ایک ملک کا حقیقی تحفظ اور سلامتی ممکن ہی نہیں ہے جب تک یہ تحفظ سب کے لیے نہ ہو ۔ کوئی ملک دنیا سے الگ تھلگ ہوجائے یا کوئی ملک اپنی قوم کو ناقابل تسخیر بنانے کی کوشش کرے بہرحال یک طرفہ تحفظ ہرگز نہیں مل سکتا ۔ اس کے بجائے دنیا کے ملکوں میں سے ہر ایک کو دوسرے تمام ممالک کے عوام کی ذمہ داری بھی باہمی طور پر قبول کرنی چاہیے ۔

امریکا روس مذاکرات (جنیوا ۔ دسمبر ۱۹۸۹ء) میں امریکی مندوب میکس ایم ۔ کیمبل نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہیں :

" آج کی دنیا میں ایک دوسرے پر انحصار بڑھتا جا رہا ہے ۔ امریکا اور روس کو باہمی تحفظاتی روابط کا سبق یاد رکھنا ہوگا جو موجودہ دور میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں ۔ روس اور امریکا ایک دوسرے سے بچ کر نہیں رہ سکتے ۔ انھیں اس مفاہمت کی پابندی کرنی ہوگی کہ ہر ایک کی سلامتی و تحفظ کا انحصار دوسرے پر ہے ۔ انھیں باہم مل کر زندہ رہنا ہوگا ۔ ان دونوں ملکوں کو انسانی دماغ کے دو حصوں کی طرح محسوس کرنا چاہیے کہ ان کا انفرادی کردار ایک پورے جسم کے تقاضوں کے مطابق ہو تاکہ ایک مشترک اور فعال کُل وجود میں آسکے اور اس طرح شمال و جنوب ' مشرق و مغرب دائیں بائیں پر مشتمل نصف کرہ ارض کی یہ وسیع مملکتیں اپنے کردار کو سب کے لیے سازگار بنانا سیکھیں کہ یہی آزادی اور دیرپا امن کے لیے صحت مند و تعمیری کردار ہے ۔"

روسی لیڈروں نے امریکا سے کہا ہے کہ سائنسی ترقی کے تقاضوں کے عین مطابق مکمل داخلی انقلاب کا جو عمل شروع ہوا ہے اس نے روسی نظام کو یہ سوچنے سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے کہ آج کے دور میں جبر زدہ معاشرے داخلی استحکام اور حقیقی تحفظ حاصل نہیں کر سکتے اور یہ ان کے بہترین مفاد میں ہے کہ وہ انسانیت سے ہم آہنگ

طریقہ کار اختیار کریں ۔ جوہری توانائی کے عہد میں تشدد کے ذریعہ سے قومی یا نظریاتی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش یقیناً شرم ناک اور قابل نفرت ہے ۔ روس کی سلامتی اور امریکا اور روس تحفظ کا بھی اس پر انحصار ہے کہ عوام پر ذمہ دارانہ بین الاقوامی رویے کے ضابطوں کے تحت حکومت کی جائے اور وہ اس پر راضی ہوں ۔

امریکا نے روسیوں سے یہ امید افزا الفاظ بھی سنے کہ مبالغہ آمیز تقریر کے بعد یقیناً عمل اور حقیقت سامنے آئے گی ۔ روس میں اہم ڈرامائی تبدیلیاں عمل میں آ رہی ہیں جو دور رس نتائج کی حامل ہیں ۔ مگر جیسا کہ ہم نے اخبارات میں پڑھا گورباچوف جس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں وہ بے حد خطرناک اور مشکل ہے ۔ ۱۹۸۵ء کے اوائل سے جب انھوں نے موجودہ منصب سنبھالا روس کے مسائل گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں ۔ معاشی ترقی کی رفتار سست ہے اور اشیائے صرف کی قلت کا مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا ہے ۔ بہر حال تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا ہے ۔ ہمیں اس تبدیلی پر کشادہ دلی کے ساتھ کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے اس کے اثرات کا جائزہ لینا ہوگا ۔ گلاسنوسٹ اور پیرسترائیکا کے الفاظ روس میں اس کثرت سے استعمال کیے جا رہے ہیں کہ وہ ایسے مفہوم اور ایسی قوت کے حامل ہو جائیں گے کہ پھر ان سے پیچھے ہٹنا مشکل ہوگا ۔

جہاں تک اسلحہ پر کنٹرول کی اہمیت کا تعلق ہے امریکا اس پر زور دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر تخفیف اسلحہ کو بامعنی اور قابل عمل بنانا ہے تو اس کے ساتھ ان سنگین مسائل پر بھی توجہ کرنی ہوگی جو اقوام میں اسلحہ بندی کا سبب بنتے ہیں ۔ ہتھیار ایک مرض کی صرف علامت ہیں ۔ ہر مرض کا علاج کرنا ضروری ہے ۔ علاقائی جارحیت ، تصادم ، دو طرفہ مسابقت کی کشیدگی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی روک تھام کرنی چاہیے اور یہ کام بہ ظاہر ہو رہا ہے ۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے اقوام کے درمیان اعتماد مجروح ہوتا ہے اور روسی نظام سے امریکا کی تاریخی مخاصمت کی بنیادی وجہ یہی ہے ۔

ایک جگہ مسٹر کیمبل کہتے ہیں :

" اسلحے کے بارے میں ہمارے مذاکرات اس سیاق و سباق میں ہوتے ہیں کہ روس کے ساتھ ہمارے تعلقات بحیثیت مجموعی معمول پر آئیں اور مستحکم ہوں ۔ ۱۹۸۷ء میں ہم نے INF کے تاریخی معاہدے پر دستخط کیے اور اس پر عمل در آمد بھی شروع کر دیا ۔ یہ پہلا معاہدہ تھا جس کے تحت تین سے تین ہزار میل تک مار کرنے والے تمام جوہری ہتھیاروں کا مکمل خاتمہ کیا جانا تھا ۔ ہم START معاہدے کو مکمل کرنے کے قریب ہیں ۔ البتہ کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے مسئلے پر کچھ مشکلات ہیں جن پر قابو ابھی نہیں پایا جا سکا ہے ۔ حالانکہ دنیا بھر کے عوام کو ذہنی سکون فراہم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے ۔ "

" تبدیلی اور تعمیری تحریک کی اس فضا میں ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت اور دوسرے اقتصادی روابط میں اضافے کے امکانات بہ ظاہر روشن ہیں ۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ میری حکومت کبھی کبھی متضاد ہونے کے باوجود محتاط اور سنجیدہ نقطہ نظر رکھتی ہے ۔ اقتصادی روابط کو ہمارے دو طرفہ مجموعی تعلقات سے خارج نہیں کیا جا سکتا ۔ روس کی فوجی طاقت چوں کہ ہمارے ملک کے لیے اب بھی زبردست فوجی خطرہ ہے اور چوں کہ روس کے فوجی بجٹ میں تخفیف کی شہادت بھی کافی نہیں اس لیے ہم اس کے حق میں ہیں کہ روس سے باہمی فائدے کی غیر فوجی تجارت میں اضافہ کیا جائے مگر اس پر اصرار کرتے ہیں کہ فوجی نوعیت کے حساس آئٹم پر قومی سلامتی کے نقطہ نظر سے کنٹرول برقرار رہنا چاہیے ۔ "

اقتصادیات کے شعبے میں بھی ایک بڑی مشکل درپیش ہے ۔ امریکا کا دعوا ہے کہ اس کا مقصد روس کو بین الاقوامی برادری کا ذمہ دار رکن بنانے میں اس کی مدد کرنا ہے ۔ روسی لیڈروں نے کسی ندامت کے بغیر اعتراف کرلیا ہے کہ ان کا نظام روسی عوام کی اقتصادی اور سماجی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے ۔ امریکا توقع رکھتا ہے کہ روسی نظام وسیع فوجی اخراجات کے بجائے اپنے وسائل اہم خانگی ضرورتوں پر صرف کرے گا ۔ اس کا مطلب ایک مشکل انتخاب ہے ، لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگر مغرب کے دولت مند ممالک آسان شرائط پر قرضے اور قیمتوں میں

رعایت دیتے رہے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا ۔ روس کے غیر ملکی قرضوں میں پہلے ہی اضافہ ہو رہا ہے ۔ اطلاعات کے مطابق گورباچوف کے دور میں بیرونی قرضے دوگنے ہوگئے ہیں ۔ ان حالات نے یوم احتساب کو ملتوی کر دیا ہے اور روسی نظام کو اپنی مرضی کے انتخاب کے لیے مزید مہلت دے دی ہے ۔

ممتاز دانشور آندرے سخاروف نے ۱۹۷۵ء میں نوبیل پرائز دیئے جانے کی تقریب پر اپنی تقریر میں جو انھیں بذات خود جاکر پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی کہا تھا :

" مجھے یقین ہے کہ بین الاقوامی اعتماد ' باہمی مفاہمت ' ہتھیاروں پر پابندی اور بین الاقوامی تحفظ و سلامتی ایسے کھلے معاشرے کے بغیر ممکن نہیں جس کے شہریوں کو باخبر رہنے کی آزادی ' ضمیر کی آزادی ' تحریر و اشاعت کی آزادی اور اپنی پسند کے ملک میں رہنے کی آزادی حاصل نہ ہو ۔ "

امریکا اس پس منظر میں روس کے ساتھ باہمی اثر پذیری پر عمل پیرا ہے ۔ مذاکرات کے ذریعہ سے کوششیں جاری رکھتے ہوئے روس اور امریکا کو اپنے اصولوں کی افادیت پر یقین ہوتا ہے ۔ مقصد مفاہمت ' استحکام اور باعزت امن کے لیے کوئی بنیاد تلاش کرنا ہوتی ہے ۔ مذاکرات بیحد مشکل اور خطرناک ہوتے ہیں ۔ سابق امریکی نائب صدر ہیوبرٹ ھمفرے کے الفاظ میں " یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی دریا کو عبور کرنے کے دوران پھسلواں چٹان پر چلا جائے ۔ اس میں دونوں طرف تباہی ہوتی ہے ۔ لیکن بہرحال کبھی کبھی پار اترنے کے لیے یہی واحد طریقہ کار رہ جاتا ہے ۔ "

امریکا اور روس نے تاریخی عمل کا آغاز کیا ہے ۔ پیچیدہ مسائل ' داخلی سیاسی دباؤ اور تخفیف اسلحہ کے معاہدوں اور اس کی مزید کوششوں کے پیش نظر روس اور امریکا کسی عمل کی تکمیل کے نہیں اب بھی صرف اس کے آغاز کے قریب ہیں ۔

اصلاحات یا انقلاب

جنیوا مذاکرات میں امریکی مندوب جناب میکس ۔ ایم کیمبل نے (نومبر ۱۹۸۹ء) جس امریکی انداز فکر کا اظہار کیا ہے اس سے روس کے اندرونی حالات پر روشنی پڑتی ہے ۔

اچھا ہے کہ میں اس کا مزید جائزہ یہاں سے لوں اور روس کے اندرونی حالات کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کروں :

روس میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ذکر اصلاحات کے طور پر نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ " گورباچوف کی اصلاحات " کے زیر عنوان کہا جا رہا ہے ۔ یہ ایک انقلاب ہے ۔ انقلاب سے میرا مطلب موجودہ سیاسی ' اقتصادی اور سماجی نظام کا خاتمہ ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ انقلاب زیادہ پرامن نہیں ' لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انقلاب حقیقی نہیں ۔

مشرقی جرمنی کے باشندوں کو دیوار برلن کے اوپر دیکھ لینے کے بعد بھی اسے محسوس نہ کرنا مشکل ہے ۔ مغرب کو حق ہے کہ وہ خود کو مبارک باد دے ۔ امریکی عوام آزادی کے محافظ کی حیثیت سے اس پر فخر محسوس کر سکتے' ہیں مگر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا ۔ بہترین انقلابات کے نتیجے میں بھی عدم استحکام اور انتشار تو پیدا ہوتا ہی ہے ۔ کسی جاری نظام کو ختم کرنا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا نظام نافذ کرنا ایک ہی بات نہیں ۔ ابھی جدوجہد اور بے یقینی کا دور ہے اور یہ صورت حال اب پورے روس میں ہے بلکہ پورے روسی بلاک میں ہے ۔

مقابلۃً اصلاحات کا عمل ایک شریفانہ اور پرامن طریقہ کار ہے جس کے تحت نئے حقائق اور تقاضوں کو کسی رائج سیاسی و معاشی نظام میں سمو لیا جاتا ہے ۔ روسی بلاک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کا مظہر نہیں ۔ بات صرف اتنی نہیں کہ یہ معاشرے یک جماعتی نظام سے جمہوریت کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں یا پابند حکومت اقتصادی نظام سے منڈی کے نظام کی طرف منتقل ہو رہے ہیں یا وہ مغرب سے اپنی چالیس سالہ جغرافیائی و ثقافتی لاتعلقی کا نہایت تیزی سے خاتمہ کر رہے ہیں بلکہ روسی یہ تمام اقدامات انقلابی بیک وقت کررہے ہیں ۔

پرانا سیاسی و معاشی نظام بڑی تیزی کے ساتھ اپنا اقتدار اور قانونی تحفظ کھوتا جا رہا ہے ' لیکن یہ بھی ہے کہ کوئی نیا نظام اقتدار و اختیار اس کی جگہ نہیں لے رہا ہے ۔ میخائل گورباچوف نے ارادتاً کمیونسٹ پارٹی کو بدنام اور کم زور کیا ہے ۔ اسٹالن عہد

کی خارجہ پالیسی اور اقتصادی کارکردگی پر سخت نکتہ چینی کی جا رہی ہے ۔ لیکن گورباچوف کا ایک ایسے نظام کے لیے وعدہ ہنوز تشنہ تکمیل ہے جس نے خوف کی وجہ سے نہیں اپنی کام یابیوں کی بنیاد پر عوام کی حمایت حاصل کی ہے ۔

معیشت ہنوز بیمار ہے ' روبل بے قیمت ہو کر رہ گیا ہے ' واشنگٹن کی ایک مشاورتی فرم کے ماہر اقتصادیات جان وینوس کے تخمینے کے مطابق روسی بجٹ کو اس سال ملک کی مجموعی اقتصادی پیداوار کے ۱۳ فیصد کا خسارہ درپیش ہے ۔ اجرتوں میں اضافہ پیداوار کے اضافے سے آگے نکل گیا ہے ۔ اشیا کی قلت سنگین صورت اختیار کر چکی ہے ۔ مسٹر وینوس کے حساب سے روسی صارفین کے پاس نقد اور سیونگ اکاؤنٹس کی صورت میں ۴۶۰ بلیون روبل جمع ہو گئے ہیں جو اشیائے صرف پر ہونے والے ایک سال کے اخراجات کے برابر ہیں --- کیوں ؟ --- اس لیے کہ بازار میں ضروری اشیائے صرف موجود ہی نہیں ہیں ۔

موسم بہار تک جناب گورباچوف کو وسیع پیمانے پر ہڑتالوں اور کمیونسٹ مخالف گروپوں کی بڑھتی ہوئی دیدہ دلیریوں کا سامنا ہے ۔ مسٹر وینوس کا خیال ہے کہ حکومت ہڑتالوں کے جواب میں اجرتوں میں مزید اضافہ کر سکتی ہے ۔ اس طرح روبل کی قیمت مزید گرے گی اور سنگین افراط زر کا خطرہ لاحق ہوگا ۔

ہر شخص تو اتنا پر امید نہیں مگر بروکنگ انسٹی ٹیوشن کے ماہر اقتصادیات مسٹر ہیوٹ کے خیال میں روس کی جمہوریتیں بحران سے نکل سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اضافی روبل کو کھپانے کا کام تیزی سے کر سکیں اور عوام کا اعتماد بحال کر سکیں ۔ اس صورت حال کے تدارک اور اصلاح کی تدابیر پر موسکو میں غور کیا جا رہا ہے ۔ مگر یہ سب بے اثر اور مسخ ہو جائیں گی ' اس لیے کہ جمہوریتیں ٹیکسوں میں اضافہ کر سکتی ہیں یا ناکارہ صنعتوں اور اشیائے صرف کے زر تلافی میں کمی کی جا سکتی ہے جس کے نتیجے میں مہنگائی اور بیروزگاری میں اضافہ ہوگا ۔ وہ ہاؤسنگ ' زمین یا فیکٹریوں کو فروخت کر سکتی ہیں یا لیز پر دے سکتی ہیں مگر یہ ریاستی ملکیت کے اصول کی بنیادی خلاف ورزی ہوگی ۔

وہ درآمدی اشیائے صرف ' ٹیلی وژن اور وی سی آر کی خریداری کے لیے محفوظ غیر

ملکی زرمبادلہ استعمال کر سکتی ہیں اور پھر ان اشیا کو بھاری منافع پر فروخت کر کے روبل کو کھپا سکتی ہیں ' مگر یہ سب دفع الوقتی کے لیے اچھی ' مگر بہت مہنگی ترکیبیں ہیں ۔

اس قسم کے عملی مسائل یورپ میں مشرقی بلاک کے ان تمام ملکوں کے سامنے ہیں جو تبدیلی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں ۔ ان مسائل کو گنوانے کا یہ مطلب نہیں کہ میں گورباچوف یا پولینڈ ' ہنگری اور مشرقی جرمنی کی نئی حکومتوں کی ناکامی کی پیش گوئی کر رہا ہوں --- ناکامی کا تصور بھی واضح نہیں ۔ کیا اس کا مطلب سرکاری نظم و نسق کا خاتمہ ہے ؟ یا اس کا مطلب جمہوریت اور کھلی منڈی کی قدامت/ رجعت پسندانہ پالیسیوں کی واپسی ہے ؟ (روس کے ایک حالیہ پول میں ۴۰ فیصد افراد نے آہنی پابندیوں کی طرف واپسی کو ترجیح دی ہے اور صرف ۲۵ فیصد نے کھلی منڈیوں کے حق میں رائے ظاہر کی ہے) یا اس سے ' صرف سیاسی و معاشی جمود سے نمٹنے میں نا اہلی کا اظہار ہوتا ہے ؟

ان باتوں سے قطع نظر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ وہ مقصد جس کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے بہت اہم ہے ۔ یہ معاشرے اپنے جانے پہچانے سیاسی و اقتصادی اداروں کو اس یقین کے بغیر ختم کر رہے ہیں کہ وہ ان اداروں کا متبادل وجود میں لا سکتے ہیں ۔ بس کام کو آگے بڑھانے کے لیے آسان طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں ۔

مسٹر ہیوٹ کا کہنا ہے کہ مغرب کے اقتصادی ماہرین اچھی طرح جانتے ہیں کہ منڈی کی معیشت کس طرح کام کرتی ہے ' لیکن اس کے بارے میں ان کی معلومات بھی زیادہ نہیں کہ یہ اقتصادیات تشکیل کس طرح پاتی ہے ۔ ہر چیز باہم مربوط ہے ۔ اقتصادی و معاشی ناکامی سیاسی ناکامی کو جنم دے سکتی ہے اور یا اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔

تفصیلات و جزئیات کی اپنی جگہ ایک اہمیت ہوتی ہے ۔ معقول استحکام زر کے بغیر غیر حقیقت پسندانہ سرکاری قیمتوں میں اصلاحات ممکن ہی نہیں ۔ ایسی کسی کوشش سے غیر حقیقت پسندانہ سرکاری قیمتیں چور بازار میں مزید دوسری اشیا تک وسیع ہو سکتی ہیں۔ ان مسائل کی پیچیدگیوں اور تبدیلی کی پریشان کن رفتار کا لازمی نتیجہ جذباتی اشتعال کی صورت میں نکلتا ہے ۔ قوتیں سرکش ہو چکی ہیں اور دنیا کو نامعلوم رخ پر

ے جا رہی ہیں ۔ تبدیلی کے سلسلے میں عوام کی توقعات اب اتنی زیادہ ہیں کہ مشرقی بلاک کی کوئی حکومت عوام کو مطمئن نہیں کر سکتی ۔

یہ اکھاڑ پچھاڑ اور یہ جدوجہد ایک نئی اور روشن دنیا کی پیش گوئیوں اور خوش فہمیوں کو جنم دینے کا سبب بنی ہے ' لیکن کس حد تک اپنے مستقبل کی صورت گری کی جا سکتی ہے اس کے بارے میں کسی دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے ۔ ماضی کے انقلابات کی نہج نے پیش گوئیوں کی قوت اور کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرنے کے بارے میں باہر کے لوگوں کی صلاحیت کو غلط ثابت کیا ہے ۔ واقعات ہی حیران کر دینے والے مزید رجحانات سامنے لے آئیں گے ۔۔۔ انقلاب ان ہی کا نام ہے ۔

گوربا چوف کے لیے راہوں کی نشان دہی

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آہنی پردے کا اٹھنا اور روس کا بے نقاب ہونا جنگ عظیم کے بعد یورپ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ ہے ' لیکن اگر مغربی دنیا مشرقی یورپ کی تبدیلیوں کے اسباب و وجوہ اور بوڈاپسٹ ' برلن نیز پراگ کے واقعات کے نتائج پر غور کیے بغیر اظہار مسرت کرتی ہے تو وہ خطرے کی زد میں ہے ۔

مالٹا سربراہ کانفرنس سے صرف ایک ہفتے قبل امریکی وزیر دفاع رچرڈ چینی نے گوربا چوف اصلاحات کی ناکامی کے ردعمل میں ان کے محروم اقتدار ہو جانے کا امکان ظاہر کیا تھا ' لیکن اس کانفرنس میں گوربا چوف کی اصلاحات کے مقابلے میں امریکا اور اس کے اتحادیوں نے جرمنی ' ہنگری اور پولینڈ کے مستقبل سے زیادہ دل چسپی ظاہر کی ۔

یہ تاریخی ستم ظریفی ہوگی اگر جرمنی کے اتحاد اور مشرقی یورپ میں عدم استحکام کی خاطر گوربا چوف کی کوششوں کی طرف سے توجہ ہٹالی جائے جو وہ روس کے تعمیر نو اور اسے آزاد خیال یورپ سے قریب لانے کے لیے کر رہے ہیں ۔ گوربا چوف اور پیرسترائیکا کی ناکامی سے روس میں جو ہنگامہ ہوگا وہ عالمی امن و خوش حالی کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ۔ اس صورت حال کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ آہنی پردہ اٹھنے کے بعد روس کے واقعات اور اس کے اثرات سے امریکا اور مغربی یورپ محفوظ نہیں

رہیں گے ۔

قحط اور افراط زر کی صورت میں عوام گوربا چوف اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف پلٹ سکتے ہیں ' لیکن ہنگری یا چیکو سلواکیہ کی طرح ضروری نہیں کہ روس میں بھی عوامی اکھاڑ پچھاڑ کے نتائج مغرب کی توقع کے مطابق بر آمد ہوں ۔ یعنی کوئی ایسا لیڈر آجائے جو اصلاحات کے معاملے میں گوربا چوف سے زیادہ تیز رفتار ہو ۔ اس کے برعکس کوئی ایسا لیڈر بھی برسر اقتدار آسکتا ہے جو قومیت پرستی کا بدترین دشمن اور مطلق العنان علم بردار ہو ۔

میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ روسی عوام کو جمہوریت اور آزاد معیشت کا کوئی تجربہ نہیں ۔ ان کا سابقہ زار اور کمیونزم دونوں کے تحت ذاتی دولت پر حکومت کے کنٹرول سے رہا ہے ۔ ان کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے اور آج بھی یہی طریقہ کار جاری ہے ' اس لیے حیرت نہیں ہونی چاہیے اگر گوربا چوف کی جانشین حکومت مغرب کی توقع پر پوری نہ اترے ۔

ذرا یورپ کے نقشے پر نظر ڈالیے ۔ جنگی حکمت عملی کے فرسودہ اصولوں کی بنیاد پر بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ مشرقی یورپ سے روس کے انخلا کے بعد دنیا زیادہ محفوظ ہو جائے گی ' لیکن جوہری توانائی کی حقیقت پر کوئی غور نہیں کر رہا ہے ۔ یورپ کی تشکیل نو کے بعد اگر روس تنہا رہ گیا تو اپنی بفر (buffer) ریاستوں سے محرومی کے بعد عدم تحفظ کی وجہ سے وہ زیادہ خطرناک ہو جائے گا ۔ مغرب اور مشرق کی محاذ آرائی براہ راست روس کی اپنی سرحد پر آگئی تو یہ صورت حال مغربی یورپ ہی نہیں امریکا کے لیے خطرے کی گھنٹی ہوگی ۔

مغربی لیڈر اگر روس کے واقعات کو اپنے ڈھب پر نہ ڈھال سکے تو ہو سکتا ہے کہ وہ جرمنی اور پولینڈ کو ہی سب سے اہم عالمی مفاد سمجھ لیں ۔ مگر حقائق تبدیل نہیں ہوتے ۔ گوربا چوف نے لبرل ازم کا جو تجربہ کیا ہے وہ ناکام نہیں ہو گا ۔ میرا مطالعہ یہ ہے کہ روس خود کو تباہ کن تنہائی سے محفوظ رکھ سکتا ہے ۔ یہ اس کی تاریخ سے ثابت ہے ۔

روسی عوام کو گرم کپڑے اور گرمی کی فراہمی کا انتظام کر دیا گیا تو گورباچوف کو ایک سال کی مہلت مل جائے گی ۔ مزید کاریں ' وڈیو ریکارڈ ' صابن اور بلیو جینز فراہم کر دی گئیں تو اصلاحات کے لیے مزید وقت حاصل ہو جائے گا ۔ اور اگر گورباچوف نے معیشت اور افراط زر پر قابو پالیا تو ان کی کام یابی میں کوئی شبہ نہیں ۔ ہنگرین امریکن سرمایہ کار جارج سوروس نے جنھوں نے مشرقی یورپ کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا ہے ' تجویز پیش کی ہے کہ استحکام معیشت اور افراط زر پر قابو پانے کے لیے روس کو آئندہ دو سالوں میں مغرب سے پچیس بلیون ڈالر کی امداد درکار ہوگی جو مثبت نتائج کے ساتھ فوری طور پر کم ہوتی جائے گی ۔

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ رقم تو امریکا کی غیر ملکی امداد کے پورے بجٹ کے مساوی اور عالمی بینک کے سالانہ امدادی قرضوں کی رقم سے دوگنی ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روس میں پیرسترائیکا کی اہمیت دنیا کے دوسرے ملکوں کے ترقیاتی منصوبوں سے کہیں زیادہ ہے ۔ بھارت ' برازیل بلکہ چین تک میں سیاسی و اقتصادی شکست و ریخت ایک الم ناک بات تو ہوگی مگر بہرحال ان سے دنیا کی ایٹمی تباہی کا کوئی خطرہ نہ ہوگا ۔ اسی بات کو ایک دوسری طرح سمجھیے ۔ روس کی امدادی رقم کو روس کے خلاف عالمی دفاع پر خرچ ہونے والی رقم کے مقابل رکھیے ۔ امریکا کے دفاعی بجٹ کی رقم تین سو بلیون ڈالر کے سامنے پچیس بلیون ڈالر کی رقم کچھ بھی نہیں ۔

مالیاتی نقطۂ نظر سے بھی روس سے اس امدادی رقم کی واپسی کے امکانات سب سے زیادہ ہیں ۔ امریکی حکومت کے ادارے ایس اینڈ ایل (S and L) ری فاتننسگ کارپوریشن میں لگائی جانے والی رقوم کے ریفکو بانڈ (Refco Bond) جاپانی انشورنس کمپنیاں خریدتی ہیں تو انھیں شبہ ہی رہتا ہے کہ ان کی رقم قیمت میں کمی اور افراط زر سے متاثرہ کرنسی کی صورت میں ملے گی جو جاپانی سکہ ین کے لیے سود مند نہیں ہوگی ۔ امریکی شرح سود میں تیز رفتار اضافے ' چھوٹ اور عالمی تجارتی مسابقت کے پیش نظر یہ رقوم امریکا کے مالیاتی نظام کے استحکام اور ٹیکساس پراپرٹی مارکیٹ میں بھی نہیں لگائی جا سکتیں ۔

گورباچوف کو چاہیے کہ وہ ۳۰ سالہ مدت کے روسی ریفکو بانڈ کی پیشکش کرکے جاپانی اداروں کو نہایت خطرناک عالمی تصادم کو ٹالنے کی یقین دہانی کرائیں ۔ انھیں امریکی سرمایہ کاروں سے بھی امدادی رقوم حاصل کرنی چاہییں جن کی ادائی کے لیے آئندہ عشرے کے دوسرے نصف تک پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں البتہ اگر اس کے بعد بھی ادائی ممکن نہ ہو تو قرضے کی ادائی کے سلسلے میں گورباچوف از سر نو مذاکرات کر سکتے ہیں ۔

لینن نے ایک بار کہا تھا کہ سرمایہ دار اس رسی کو خریدنے کے لیے کمیونسٹوں کو ضرور قرضہ دیں گے جس سے سرمایہ داری معلق ہے ۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ مارکس ازم اور لینن ازم کو تختہ دار پر لٹکانے کے لیے ایک ذرا سی اقتصادی امداد کی رسی روس کو فراہم کر دی جائے ؟

نماز جمعہ

جناب مرزا یوف صاحب سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر پروگرام زیادہ ٹائٹ ہو گیا ہے تو میں نماز ظہر ادا کر لوں گا ۔ اس کی مجھے اجازت ہے کہ سفر میں نماز جمعہ ادا نہ کر سکوں تو گنہ گار نہ ہوں گا ۔ بہ ایں ہمہ ان کا دل نہ مانا اور وہ مجھے جامع مسجد لے گئے جہاں بتایا گیا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دستخطی قرآن حکیم موجود ہے ۔ ہمارے پاس جس قدر وقت تھا اس میں یا تو زیارت قرآن حکیم ہو سکتی تھی یا نماز جمعہ ادا کی جا سکتی تھی ۔ میں نے نماز جمعہ کی ادائی کو اولیت دی ۔ اتفاق ہے کہ جناب محترم شمس الدین بابا خانوف صاحب ' مفتی اعظم سے بھی وہاں ملاقات ہوگئی ۔ یہ مرحوم حضرت مفتی بابا خانوف کے صاحبزادے ہیں اور اب ان کے جانشین ہیں ۔ ان کے نائب یہاں جامع مسجد میں امام ہیں ۔ یہ دونوں حضرات مجھے اندر صف اول میں لے گئے اور پھر حاضرین سے انھوں نے میرا تعارف بھی کرا دیا اور پاکستان اور میرے لیے جامع مسجد میں دعائیں بھی فرمائیں ۔ جامع مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ۔ بوڑھے جواں سبھی تھے ۔ مسجد سے باہر بھی لوگ نماز کے لیے جمع تھے ۔ بعد نماز

جمعہ اور بعد از دعا نمازیوں نے بہ کثرت مجھ سے ہاتھ ملائے۔ میں نے بہت سوں کو پیار سے گلے لگایا۔ بڑا ہی دل آویز سماں بندھ گیا تھا۔ ان سب نے مجھے خدا حافظ کہا۔ اس دوران سعدیہ بیگم بھی زنانہ اجتماع سے نماز ادا کر کے آگئی تھیں۔ وہ محترمی جناب مرزا یوف صاحب کے ساتھ گئی تھیں۔ جامع مسجد میں خواتین کا اجتماع الگ ہوتا ہے ہوتا ہے۔

جناب محترم مفتی شمس الدین بابا خانوف صاحب کو شکایت تھی کہ ان کو ہمارے پروگرام کی اطلاع نہیں ہوئی۔ میں نے معذرت چاہی اور بتایا کہ تفصیلی پروگرام خود ہم کو روس آکر ہی معلوم ہوا ہے۔۔ حضرت مفتی بابا خانوف مرحوم کو روح افزا بہت پسند تھا۔ وہ جوشینا اور سعالین کے بھی دل دادہ تھے۔ میں ان کی خدمت میں کسی نہ کسی طرح یہ سامان بھجواتا رہتا تھا۔ سال گزشتہ یا شاید اسی سال کے شروع میں جناب مفتی شمس الدین بابا خانوف صاحب کراچی تشریف لائے تھے۔ ہمدرد منزل میں ان کے احترام میں میں نے کھانا بھی کیا تھا اور ان کو جوشینا اور سعالین بہت ساری دے دی تھیں۔ آج نماز جمعہ میں جیسا اجتماع دیکھا اس سے اطمینانِ قلب حاصل ہوا۔

تاشقند لینن یونی ورسٹی

تاشقند یونی ورسٹی کافی پرانی ہے۔ عظیم انقلاب اکتوبر کے بعد ۱۹۲۰ء میں جناب لینن کے ایک حکم نامے کے تحت اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آج میری ملاقات جناب محترم چانسلر صاحب جامعہ تاشقند سے طے تھی۔ یونی ورسٹی آئے تو پتہ چلا کہ چانسلر صاحب روسی پارلیمان کے رکن ہیں اور ان کو وہاں کسی اہم میٹنگ میں ماسکو بلا لیا گیا ہے۔ وائس ریکٹر جناب پروفیسر تورسو نوو چ موجود تھے۔ ان سے تبادل خیال ہوا۔ مگر مجھے قلبی بے اطمینانی رہی، گو میں نے اپنا نقطہ نظر جناب وائس چانسلر صاحب کو بتا دیا ہے۔ یہاں روس میں یہ بڑا ہی دل چسپ طریقہ ہے کہ چانسلر یا صدر سے ملاقات نہیں ہوا کرتی۔ ہمیشہ ہی نائب یا وائس سے ملاقات ہوا کرتی ہے۔ چین کا بھی مزاج یہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سوویت یونین میں صدور اکثر و بیشتر وہی

لوگ ہوتے ہیں جن کا تعلق پارٹی کی ہائی کمان سے ہوتا ہے یا جن کو احترام کے لیے عہدہ دینا ہوتا ہے۔ کام کا جہاں تک تعلق ہے نائب یا وائس ہی انجام دیتے ہیں۔ گو میں جناب وائس چانسلر صاحب سے تبادل خیال کرتا رہا، مگر میرا ذہن ایک منٹ بھی اس خیال سے خالی نہ رہا کہ جناب چانسلر صاحب نے ملاقات سے گریز کیا ہے۔ ذہنی تکلیف ہوئی۔ بارے میں نے جناب چانسلر صاحب کے لیے ہدایا وائس چانسلر صاحب کے ساتھ چھوڑ دیے ہیں۔ میں نے وائس چانسلر صاحب کو بتایا کہ ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء کو میں جناب چانسلر صاحب کو ہمدرد یونی ورسٹی لائبریری کے افتتاح میں دعوت زبانی دینا چاہتا تھا اور قبولیت کی صورت میں ان کو میں باضابطہ دعوت نامے پیش کرتا۔

البیرونی انسٹی ٹیوٹ اوف اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند

اب تک میں نے روس کے کئی دورے کیے ہیں۔ سمرقند تک آگیا، مگر تاشقند اور بخارا ہمیشہ ہی رہ گئے، حال آں کہ تاشقند میں جو ذخائرِ علمی محفوظ ہیں ان سے گہری دل چسپی مجھے رہی ہے۔ پاکستان کے جناب محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے بھی یہاں آکر اس انسٹی ٹیوٹ میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے۔ غالباً پاکستان کے کئی اور صاحبانِ علم بھی یہاں آچکے ہیں۔

البیرونی انسٹی ٹیوٹ اوف اورینٹل اسٹڈیز ایک نہایت خوب صورت عمارت میں ہے۔ یہ ان کی اپنی عمارت ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کوئی ایک لاکھ کتابیں ہیں اور کوئی ۲۰ ہزار مخطوطات کا یہاں ایک بے نظیر خزانہ بھی موجود ہے۔ یہاں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ ان کے رفقا بھی ہیں۔ ان سے کوئی ۴۵ منٹ تبادل خیال ہوا۔ غالباً ان کو میری بے چینی کا اندازہ ہوگیا اور پھر انھوں نے دعوت دی کہ میں ان کی لائبریری دیکھ لوں۔ اس لائبریری اور اس میں موجود مخطوطات کو دیکھ کر میں واقعی حیران رہ گیا۔ کیا سلیقہ ہے۔ کیا علم کی قدر ہے۔ سبحان اللہ! میں نے ایسے بھی مقامات دیکھے ہیں کہ نہایت اہمیت کے حامل مخطوطات نہایت بے دردی کے ساتھ الماریوں میں پڑے سڑ رہے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ ان

میں کیا ہے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ایک ایک مخطوطہ نہایت احترام و اہتمام کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ تنظیم بھی ہے اور ترتیب بھی ہے۔

یہاں اس قدر احساس ضرور ہوا کہ اس انسٹی ٹیوٹ کو بھی مالی مشکلات کا سامنا ہے۔ اور ایسے مواقع نہیں ہیں کہ وہ کام کر سکے کہ جن کی ضرورت ہے۔ بہ ایں ہمہ یہ جان کر خوشی ہوئی اور حیرانی بھی کہ اس انسٹی ٹیوٹ میں موجود مخطوطات کا مطالعہ کرکے ان کی بنا پر اب تک گیارہ سو کتابیں یہ انسٹی ٹیوٹ چھاپ چکا ہے۔ یہ تعداد حیران کن ہے۔ مگر مجھے خوشی اس سے ہوئی ہے کہ یہاں مخطوطات محض نمائش کے لیے جمع نہیں ہیں بلکہ ان پر حتی الوسع تحقیقی کام بھی خضوع و خشوع کے ساتھ جاری ہے۔

المیہ یہ ہے کہ دنیائے عرب کہ جہاں آج علم و حکمت کے لیے واقعی بیداری موجود ہے، وہاں بھی حال یہ ہے کہ مخطوطات جمع کیے جا رہے ہیں اور ان کی نمائش سے زیادہ بات آگے آج تک نہیں بڑھی ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ مخطوطات کا حاصل کرنا اور ان کی لائبریریاں قائم کرنا ہرگز اہمیت تامہ کا حامل نہیں ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ان مخطوطات کے مشتملات پر غور کیا جائے اور ان کو عصری زبانوں میں چھاپا جائے۔ میں اس حقیقت پر یقین کامل رکھتا ہوں کہ قدمائے محترم نے دنیا کے ہر معلوم فن و حکمت میں پیش رفت کی ہے۔ دنیا میں موجود کم و بیش تیس لاکھ مخطوطات اس کے شاہد ہیں کہ دور اسلامی میں علم و حکمت کے ہر میدان میں بنیادی اور اساسی کام ہوئے ہیں۔ علوم و فنون کی بنیادیں رکھی گئی ہیں اور تفکر و تدبر معراج پر رہے ہیں اور رہنما قسم کے کام ہوئے ہیں۔ جب اہل اسلام کے ہاں تفکر و تدبر کے دروازے بند ہوئے تو ان کی دنیا میں علم و حکمت کی دنیا تاریک ہو گئی۔ یہ تاریکی اس درجہ گہری ہے کہ آج دنیائے عرب و اسلام میں بدرجہ انتہا روشنیوں اور بیداریوں کے باوجود اپنے ورثہ ہائے علم میں حقائق کی تلاش کا ذوق شوق پیدا نہ ہو سکا۔ بات اس قدر ہوئی ہے کہ مخطوطات کی خریداریوں کا بازار گرم ہوا ہے۔ گراں ترقیمتیں دے دے کر مخطوطات جمع کیے جا رہے ہیں، مگر جو کام کرنے کا ہے اس کا کہیں کوئی

آغاز نہیں ہوا ہے۔

میں نے یہ مشورہ دیا تھا اور دیتا رہا ہوں کہ اگر ۴۲ مسلم ممالک یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ ہر سال کم از کم اپنے پچاس نوجوانوں کے لیے ڈاکٹریٹ کی تعلیم کا اہتمام کردیں اور ایک ایک مخطوطہ ہر ایک کو ڈاکٹریٹ کے لیے حوالے کر دیں تو ہر سال سیکڑوں مخطوطات کے مشمولات سامنے آ جائیں گے۔ اس کام سے علم و حکمت کی دنیا میں ایسی روشنی پیدا ہو جائے گی کہ دنیا کی آنکھیں ایک بار پھر خیرہ ہو جائیں گی اور پھر یہ راز بھی فاش ہو جائے گا کہ عصری علم و حکمت کی اساس و بنیاد کہاں ہے۔ اکثر و بیشتر حالات میں دنیائے موجود میں علم و حکمت کے میدان میں جو انکشاف اور اکتشافات ہوئے ہیں ان کی بنیاد کوئی نہ کوئی قدیم تحقیق ہے۔ مغرب نے اس سے فائدہ اٹھا کر اصل منبع علم کو ضائع کر دیا ہے۔

میری اس تجویز کا ذرہ برابر کوئی نوٹس نہیں لیا گیا ہے اور صورت حال آج بھی حسب سابق ہے۔ شاہ مراکش کے پاس دنیا کا بہترین ذخیرہ مخطوطات ہے جس کی ہوا اہل علم کو آج تک نہیں لگی ہے۔ ترکی میں کم از کم چار لاکھ مخطوطات موجود اور محفوظ ہیں، مگر اہل علم کو ان سے استفادے کا موقع نہیں ملتا۔ پرنسٹن یونی ورسٹی کے ذخیرہ مخطوطات کی ایک فہرست (دو جلدوں میں) میرے دوست پروفیسر فلپس حتی نے مرتب اور شائع کرائی ہے۔ برٹش میوزیم میں بے حد اہم ذخیرہ ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں نادر مخطوطات موجود ہیں۔ اسکوریل اسپین میں ہزار ہا مخطوطات ہیں۔ جیسٹر بٹی لائبریری آئرلینڈ میں ہزار ہا مخطوطات ہیں۔ پاکستان میں یہ تعداد آج بھی ایک لاکھ سے کم نہیں ہے۔ عرب لیگ اس دولت سے مالا مال ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر جمع کرنے اور محفوظ کرنے اور نمائش کرنے سے آگے بات نہیں بڑھتی اور علم و حکمت کی تاریخ کی زنجیر کی کڑیاں کل بھی ٹوٹی ہوئی تھیں اور آج بھی وہ شکستہ ہیں۔ چند سال سے شاہ فیصل فاؤنڈیشن نے مشہور زمانہ اسکالر جناب پروفیسر فواد سیزگین صاحب کو کام کرنے کی اجازت دی ہے اور وہ مخطوطات کو ایڈٹ کرکے انھیں چھاپ رہے ہیں۔ ہر مخطوطے کی وہ پانچ سو کاپیاں چھاپتے ہیں۔ غالباً اہل علم کے درمیان ان

کی تقسیم ہوتی ہے ۔ ہمدرد لائبریری میں بھی یہ سب موجود ہیں ۔ ایسا کرنے سے مخطوطات اہل علم تک تو پہنچ رہے ہیں مگر ان کے عصری زبانوں میں تراجم کا کام ہنوز کہیں شروع نہیں ہوا ہے ۔

اپنے ورثہ ہائے علم سے یہ بے زاری اور یہ فرار اور یہ غفلت بے حد تکلیف دہ ہے ۔ اگر دنیائے عرب فیصلہ کر لیتی تو قدیم ورثہ ہائے علوم و فنون کے تراجم عصری زبانوں میں ہو سکتے تھے اور پھر ایسے حیرت انگیز انکشافات ہوتے کہ دنیا دنگ رہ جاتی ۔ کاش کوئی میری بات سمجھ لے ۔

پاکستان میں ۱۴ویں صدی ہجری کے اختتام اور ۱۵ویں صدی کے آغاز کے موقع پر میں نے سب سے پہلے پیش رفت کی ۔ فروری ۱۹۷۶ء میں جب لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس ہوئی تو ۱۴ویں صدی کے ختم ہونے میں سات سال باقی تھے ۔ میں نے اس وقت سربراہان عالم اسلام کو خطوط لکھے کہ ۱۵ویں صدی کا آغاز ایک سو سالہ منصوبے کے ساتھ کرنا چاہیے اور ۱۴سو سال کا بھرپور جائزہ لے کر ۱۵ویں صدی میں مختلف میدانوں میں منصوبہ بندی کے ساتھ داخل ہونا چاہیے ۔

جو تحریک پاکستان سے شروع ہوئی ' اور جسے میں نے سب سے پہلے پیش کیا افسوس ہے کہ اس کا نوٹس خود پاکستان نے نہیں لیا ۔ مجھے اس سے کوئی دکھ ہے اور نہ کوئی تکلیف کہ خود پاکستان نے یہ سہرا اپنے سر نہ باندھا اور ہر سطح پر مجھے نظر انداز کیا گیا' حتیٰ کہ صدر پاکستان نے سب کچھ جاننے کے باوجود ایک بار بھی یہ نہ فرمایا کہ اس کا محرک کون ہے ۔ خیر' مجھے اس کی خوشی ہے کہ میری اس تحریک کا اثر ہوا اور سارے عالم اسلام نے اس کا استقبال کیا ۔ خود میں نے 'آرگنائزیشن اوف اسلامک کانفرنس جو مرجع و مرکز تحریک ۱۵ویں صدی ہجری بنا ' میں کام کیا ۔ جدہ جا جا کر منصوبہ بندی کی اور نقشے بنائے ۔ بڑی بڑی تجویزیں وہاں بیٹھ کر لکھیں ' غرض جو کچھ ممکن تھا میں نے کیا ۔ مگر ہوا وہی جس کا مجھے شدید خطرہ تھا ۔ میری بہترین کوشش تھی کہ ۱۵ویں صدی ہجری کا آغاز ایک جشن نہ بننے پائے ۔ مگر ہوا یہی کہ یہ ایک جشن کے طور پر منایا گیا ۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلم بھی شریک ہوئے اور جشن سے بات

آگے نہ بڑھی اور کوئی بنیادی منصوبہ بندی نہیں ہوئی ۔ کوئی ایک سو سالہ پلان تیار نہ ہوا ۔

پاکستان میں جناب محترم اے ۔ کے ۔ بروہی صاحب نے اس میدان کو اپنایا ۔ مجھے نظر انداز کیا اور ان لوگوں کو شریک کیا جو شریک تحریک نہ تھے ۔ جناب بروہی صاحب نے ایک کام یہ کیا کہ ایک نیشنل ہجرہ کاؤنسل قائم کرادی اور وہ اس کے بہ عہدہ وزیر صدر بنے ۔۔ یہ ایک نہایت تعمیری قدم تھا ۔ بہ ایں ہمہ پاکستان میں جشن کا سماں رہا اور کوئی ایسا کام نہ ہو سکا کہ جس کے تعمیری نتائج پاکستان کی زندگی میں نمایاں ہوتے ۔

میرا ذہن کبھی مخطوطات سے خالی نہ رہا ۔ میں نے جناب بروہی صاحب کو مشورہ دیا کہ جو کام دنیا بھر میں نہیں ہو سکا ہے وہ' کام نیشنل ہجرہ کاؤنسل کی طرف سے ہو جانا چاہیے ' یعنی مخطوطات پر ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے اسکالر شپ دی جائیں اور کم از کم بارہ اہل علم کو اس کام پر لگا دیا جائے ۔ یہ کام نہ ہو سکا ۔ جناب محترم ڈاکٹر این ۔ اے ۔ بلوچ صاحب نے ایک تجویز یہ رکھی کہ ہم پہلے شائع شدہ اسلام کی ایک سو نہایت اہم کتابوں کا انتخاب کریں جو مختلف علوم و فنون پر حاوی ہوں اور ان کے انگریزی تراجم شائع کیے جائیں ۔ یہ ایک نہایت تعمیری تجویز تھی ۔ اس کے لیے ایک عالمی کمیٹی تشکیل دی گئی اور ایک بار اس کا اس قدر بڑا اجلاس بھی ہوا کہ جس کی ضرورت قطعی نہیں تھی ' مگر اس کا بدیہی طور پر یہ فائدہ ہوا کہ اس کام کو کر گزرنے کے لیے توجہ کا سامان ہوا ۔

جناب وزیر اعظم پاکستان ' محمد خاں جونیجو صاحب نے اس سے پوری دل چسپی لی اور پوری فراخ دلی کے ساتھ اس کام کے لیے پچاس لاکھ روپے کا عطیہ دیا ۔ اس سے راہیں کھل گئیں ۔ صدر محترم پاکستان نے اپنی گہری دل چسپی جاری رکھی ۔ اس سے میں نے بھی اپنی دل چسپی جاری رکھی ۔ اور سب سے پہلے عطیے کے طور پر اپنی کتاب " الجماہر فی معرفۃ الجواہر " از البیرونی بغیر رائلٹی پیش کردی اور وعدہ کیا کہ " کتاب الصیدنہ " پر نظر ثانی کرکے وہ بھی عطیہ کر دوں گا ۔

ایک شدید ترین حادثہ یہ پیش آیا کہ جناب محترم اے ۔ کے ۔ بروہی صاحب ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے ۔ وہ معائنہ قلب کے سلسلے میں لندن کے ایک ہسپتال میں داخل ہوئے ۔ اور دوران معائنہ قلب وہ حادثتہً جاں بحق ہوگئے ۔ وہ بڑا عجیب ہسپتال تھا کہ معائنہ ایسا ہو رہا تھا کہ دوران معائنہ کسی وقت بھی اپریشن کی ضرورت پیش آ سکتی ہے ۔ ہسپتال نے اس کے لیے تیاری نہ کی اور جب معائنے کے دوران حادثہ پیش آگیا تو فوراً اپریشن کا سامان نہ تھا ۔ عجلتیں ہوئیں ۔ کسی دوسرے زیر اپریشن مریض کی جگہ بروہی صاحب کو لے جایا گیا' مگر اس تاخیر کے دوران ان کے دماغ کا دوران خراب ہوگیا اور اوکسیجن کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے دماغ مجروح ہوگیا اور وہ بالآخر اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

نیشنل ہجرہ کاؤنسل اور ایک سو عظیم کتابوں کا یہ منصوبہ جو جناب بروہی صاحب کی شخصیت اور اس شخصیت کے اثرات کی وجہ سے جاری ہوا تھا اس میں رکاوٹ پیدا ہو کر رہی ۔ ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ اس کی ذمہ داری میں قبول کرلوں ۔ میں نے صدر گرامی قدر پاکستان سے اس " منصوبہ ایک سو بڑی کتابیں " کو سنبھالنے کی ذمہ داری اس شرط کے ساتھ قبول کرلی کہ میں وزیر کا عہدہ اس کے لیے قبول نہیں کروں گا ۔ ایک خادم علم کی حیثیت سے کام کروں گا ۔ جہاں تک فیصلے کا تعلق ہے صدر پاکستان محترم نے یہ فائل جناب محترم وزیر اعظم پاکستان کو بھجوا دیا ' جہاں سے فائل کبھی واپس نہیں آیا ۔

اس کے بعد جناب صدر گرامی قدر پاکستان ایک حادثے میں شہید ہوگئے اور نیشنل ہجرہ کاؤنسل ' جو ان کے ایما پر قائم تھا ' متزلزل ہوگئی ۔ نہ اس کا سرپرست رہا اور نہ اس کا صدر ۔ بے یار و مدد گار ۔ اس کے بعد نئی حکومت قائم ہوئی ۔ اس کا مزاج مختلف رہا ۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ دنیا کے ایک بڑے عہدے سے رٹائر ہو کر ایک بزرگ آئے اور انھوں نے صدر گرامی قدر پاکستان سے نیشنل ہجرہ کاؤنسل کی صدارت اپنے لیے منظور کرالی اور ذرا غور نہ کیا کہ موجودہ حکومت ان صاحب کی کسی قیمت پر حامی نہ ہوگی ۔ چناں چہ ان کی صدارت معلق ہوگئی ' بلکہ ایک رٹائرڈ جج

کا نام بھی آیا کہ وہ صدر ہوں گے ۔ وہ آج تک صدر نہ ہوئے ۔ اب لے دے کے نیشنل ہجرہ کاؤنسل میں جناب محترم ڈاکٹر این ۔ اے ۔ بلوچ صاحب رہ گئے ۔ میں نے بے حد کوشش کی سربراہی ان کو دے دی جائے ' کیوں کہ ایک سو عظیم کتابوں کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وہی ایک شخصیت رہ گئے تھے ۔ مگر ان کو رٹائر کر دیا گیا اور اس طرح پاکستان میں جو قابل تقلید کام شروع ہوگیا تھا وہ قطعی طور پر اب معرض خطر میں آچکا ہے ۔

اس نیشنل ہجرہ کاؤنسل کی سربراہی جن صاحب کو سونپی گئی ہے خود وہ پکار اٹھے ہیں کہ میرا یہ مرتبہ ہے نہ مقام کہ میں اس ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہوسکوں ۔ پاکستان میں ہیئت اقتدار کا یہ مزاج رہا ہے کہ جس کام کو نہ کرنا ہو اسے نا اہلوں کی سربراہی میں دے دیا جائے ۔ حکومت وقت کا یہ مزاج نہیں ہے کہ نیشنل ہجرہ کاؤنسل برقرار رہے اور نہ وہ چاہتی ہے کہ بنام اسلام میدان علم و حکمت میں کوئی پیش رفت ہو ۔ اس لیے اس کاؤنسل کا سربراہ ایک ایسے ماہر کو بنایا گیا ہے جس کی مہارتوں کا یہ میدان نہیں ہے اور وہ بے چارہ پریشان ہے کہ ناکامی اس کا مقدر بن جائے گی ۔

تاشقند ۔ انسٹی ٹیوٹ اوف اورینٹل اسٹڈیز ۔ معاہدہ

قابل قدر ہے اور سزاوار تحسین و آفرین کہ اس انسٹی ٹیوٹ میں وہ کام ہو رہا ہے کہ جو آج دنیا میں کسی جگہ نہیں ہو رہا ہے ۔ مخطوطات کا مطالعہ ہو رہا ہے اور ان کے تراجم ہو رہے ہیں اور شائع ہو رہے ہیں ۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے " القانون فی الطب " کا ازبکی زبان میں ترجمہ کر دیا ہے ۔ متعدد کتابیں جن کی تعداد سات سو ہے' ان مخطوطات کے مطالعے کے نتیجے میں ازبکی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع کی جا چکی ہیں ۔

میں نے یہ تمام کتابیں ہمدرد یونی ورسٹی لائبریری کے لیے لے لی ہیں اور ایک معاہدہ میں نے یہ کیا ہے کہ انگریزی تراجم بیت الحکمہ شائع کرے گا ۔ میرے اس فیصلے کا اثر انسٹی ٹیوٹ کے اعلا حکام پر خوش گوار پڑا ہے اور ان کو اطمینان ہوا ہے کہ

اب انسٹی ٹیوٹ اور بیت الحکمتہ مل کر یہ کام کریں گے ۔

قدیم مشرقی نسخہ جات کا خزانہ

جیسا کہ میں نے دیکھا ہے اس انسٹی ٹیوٹ میں مخطوطات کا قابل قدر خزانہ ہے جو محض برائے نمائش نہیں ہے بلکہ تحقیقات کے لیے ہے اور یہاں یہ کام ہو رہا ہے ۔ میں نے جناب قوام الدین منیروف کی تحریر کی مدد سے اس خزانے کے متعلق یہ معلومات حاصل کیں :

سوویت سوشلسٹ ریپبلک ازبکستان کی سائنسی اکادمی کے ابو ریحان البیرونی نامی علوم شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کا علمی خزانہ قلمی نسخہ جات کی دنیا کے قیمتی اور نادر مشرقی قلمی نسخوں کے ذخائر میں سے ایک ہے ۔ اس میں ابو نصر الفارابی ' ابو ریحان البیرونی ' ابو علی ابن سینا ' یوسف خواجہ ' علامہ زمخشری ' نظامی ' فردوسی ' سعدی ' امیر خسرو دہلوی ' الغ بیگ ' عبدالرحمن جامی ' علی شیرنوائی جیسے اعلا قدر علما کی تصانیف موجود ہیں۔ یہ قابل ستائش تصانیف جو انسانی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں ' ہزاروں سالوں کا طویل راستہ طے کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہیں ' اور پہلے کی طرح آج بھی اپنی عظمت کا لوہا منوا رہی ہیں ۔

یہ حقیقت ہے کہ وسط ایشیا اور مشرق وسطی کے ملکوں کے بلند پایہ عالموں ' مفکروں اور شاعروں کی بے مثال تصانیف نے انسانی معلومات کے دائرے کو وسیع اور روحانی دنیا کو مالا مال کیا ۔

تاشقند میں شرقیاتی قلمی نسخوں کا خزانہ عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد معرض وجود میں آسکا۔ جب سوویت حکومت نے ماضی کے قلمی نسخوں اور ان کے ذخائر کو حاصل و جمع کرنے اور ان کی سائنسی ماہیت کا مطالعہ کرنے کے لیے ان کو محفوظ رکھنے پر خاص توجہ کی ۔

قدیم تصانیف ' جو یہاں قلمی نسخوں کا حصہ ہیں ' ہزار ہا سال پرانی ہیں ۔ ان تصانیف میں مشرق کے ممتاز عالم ابن سلام ۲۲۴ ھ/۸۷۳ ء کی تصنیف غریب احادیث

ہے جو کتب احادیث میں ایک غیر معمولی نسخہ مانا جاتا ہے اور دوسری تصانیف بعد کے دور کی ہیں ۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں موجود ادبیات کے نسخے ازبیک ' عربی ' فارسی ' تاجیک ' اردو ' پشتو ' آذر بائیجانی ' ترکی ' تاتاری ' ترکمانی ' ایغور اور مشرق کی دوسری قوموں کی زبانوں میں لکھے ہوئے ہیں اور سب مختلف علوم سے تعلق رکھتے ہیں جن میں تاریخ ادب ' فلسفہ ' قانون (فقہ) ' فلکیات ' طبیعیات ' کیمیا ' طب ' زبان ' دوا سازی ' جغرافیہ ' ریاضی ' موسیقی ' علم معدنیات ' زراعت ' فن مصوری وغیرہ شامل ہیں ۔

مختلف علوم سے تعلق رکھنے والے یہ قلمی نسخے وسط ایشیا ' بھارت ' پاکستان ' افغانستان ' عرب ممالک ' ایران اور دوسرے مشرقی ملکوں کی قوموں کی تاریخ اور کلچر ' ان ملکوں کے درمیان سیاسی ' اقتصادی ' سفارتی اور ثقافتی روابط کے مطالعے کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔

تاریخی تصانیف

کئی جلدوں پر مشتمل تصنیف " تاریخ طبری " ایک تفصیلی تاریخ ہے جو ابو جعفر محمد ابن جریر الطبری (سن وفات ۳۱۰ ھ/۹۲۲ ء) کے زمانے میں عربی میں لکھی گئی اور بعد میں بخارا کے عالم میر ابو علی محمد بلعمی نے اس قلمی نسخے کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

قوموں کے تجربے " تجارب الامم "

دوسری تاریخی کتابوں میں مشہور تاریخ داں ابن مکاویح (سن وفات ۴۲۱ ھ/۱۰۳۰ء) کی تصنیف تجارب الامم یعنی قوموں کے تجربے کا ذکر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ اس خزانے میں اس تصنیف کا ایک پرانا نسخہ موجود ہے جس کو ۵۹۵ ھ/۱۱۹۹ ء میں دوبارہ قلم بند کیا گیا۔ ابن الاثیر (سن وفات ۶۳۰ ھ/۱۲۳۲ء) کی ۱۲ جلدوں والی مشہور تصنیف " تاریخ کامل " (جدید تاریخ) عالمی تاریخ کا ایک پرانا شاہ کار ہے ۔

جامع التواریخ

رشید الدین ابن عماد الدولہ کی تصنیف " جامع التواریخ " جس نے مشرق میں مقبولیت کی سطحوں کو چھوا ماضی کی ایک نادر تصنیف ہے ۔ مشہور سوویت شرق شناس اکادیمیشن وی ۔ وی ۔ بارتولد نے " جامع التواریخ " پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

" عہد وسطی میں ایک بھی یورپی یا ایشیائی قوم کے پاس ایسی تصنیف نہیں تھی " ۔ اس تصنیف کا ترجمہ کو چکنجی خاں (۱۵۳۰ء/۱۵۱۰ء) کے دور حکومت میں محمد علی ابن درویش علی بخاری نے ازبیک زبان میں کیا تھا ۔ ان کے قلمی نسخے دنیا میں واحد مانے جاتے ہیں ۔ ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں سمرقند کے خوش نویس محمد علی ابن مولانا یار علی نے اسے خوش خط لکھا ۔

تاشقند علوم شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں درویش محمد ابن رمضان کی تصنیف " ستہ الابرار " ، حمد اللہ قزوینی کی " تاریخ گزیدہ " ، میر خواند کی تصنیف " روضتہ الصفا " ، خواند میر کی " حبیب السیر " جیسی بے شمار دوسرے مشرقی تاریخ دانوں کی تصانیف بھی موجود ہیں ۔

وسط ایشیا کی قوموں کی تاریخ کے تجزیے سے متعلق متعدد تصانیف موجود ہیں ۔ ان میں ابو بکر محمد ابن جعفر نوشخی کی تصنیف " تاریخ ولایت " یا " تاریخ بخارا " شامل ہے جو ۱۰ویں صدی میں عربی زبان میں لکھی گئی ۔ اس میں بخارا کی تعمیر ، اس کی تاریخ ، طرز تعمیر ، جغرافیائی حالات ، بخارا کے آس پاس کے دیہاتوں ، مختلف علاقوں ، عالموں ، مقتدر اور مشہور لوگوں اور مختلف دور کے حکمرانوں کے بارے میں ذکر موجود ہے ۔ اس کے علاوہ شرف الدین علی یزدی کا " ظفر نامہ " علمی خزانے کی کمیاب تصانیف میں سے ایک ہے ۔ انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں اس کے کئی قلمی نسخے محفوظ ہیں ۔ ان میں سے ایک قلمی نسخہ مزین رنگین تصویروں اور خوش نویسی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے ۔

عبدالرزاق سمرقندی کی کتاب " مطلع السعدین و مجمع البحرین " بھی تاریخ دانوں کی

توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے ۔ اس کے علاوہ وسط ایشیا کی تاریخ سے متعلق تصنیف " مہمان نامہ بخارا " ، فضل الدین ابن روزی خان نے شیبانی خان کی ہدایت پر لکھی ۔ شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں اس تصنیف کا جو نسخہ موجود تھا وہ ۱۶ویں صدی کے شروع میں قلم بند کیا گیا تھا ۔ بعض محققین کی رائے میں یہ ایک نادر قلمی تحریر ہے ۔

علم جو خوشی بخشے

وسط ایشیا کی تاریخ کی عکاسی کرنے والی بہت سی دوسری تصانیف میں سے زیادہ مشہور و معروف قلمی تحریریں یہ ہیں : بنائی کا شیبانی نامہ ، ظہیر الدین محمد بابر کا بابر نامہ ، حافظ تنیش بخاری کا شیبانی نامہ ، سید راقم کی تاریخ راقم ، ابو الغازی خاں کی شجرۂ ترک اور شجرۂ تراکمہ ، محمد امین بخاری کی عبد اللہ نامہ ، شیر محمد مونس کی فردوس الاقبال ، محمد رضا کی ریاض الدولہ ، زبدۃ التواریخ ، جامع الواقعات سلطانی اور گلشن دولت ، محمد حکیم خاں کی منتخب التواریخ اور میرزا عالم کی انساب السلاطین والخواقین وغیرہ ۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی نوادر میں کئی کتابیں ہندستانی تاریخ سے وابستہ ہیں کیوں کہ وسط ایشیا اور ہندستان ایک عرصے تک سیاسی اور ثقافتی روابط سے منسلک رہے ہیں ۔ یہ روابط بابر کے دور سلطنت کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ اس دور کی تصانیف میں خواجہ نظام الدین احمد ابن محمد الہروی (۱۵۹۵ء) کی تصنیف طبقات اکبر شاہی شامل ہے جو اکبر کے دور حکومت میں ایک اعلا فوجی عہدے دار تھے ۔ ان کی تصنیف آج بھی اس دور کی ہندستانی تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے ۔

اس ایک مضمون میں ہم ان تمام تصانیف پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں جو ہندستانی تاریخ کی عکاسی کرتی ہیں اور علامہ ابو الفضل مبارک کے اکبر نامہ یا تاریخ اکبر شاہی اور دیگر تصنیفات سے آگاہ کرتی ہیں ۔ لیکن مزید چند تصانیف کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ۔ مثلاً عبدالقادر ابن ملوک شاہ بدایونی کی منتخب التواریخ ، علامہ ابوالفضل مبارک کا

اکبر نامہ یا تاریخ اکبر شاہی اور میرزا شریف کا اقبال نامۂ جہانگیری ' عبدالحمید لاہوری کا پادشاہ نامہ ' سید جمال ابن میر جلال الدین حسین کا ترخان نامہ وغیرہ وغیرہ ۔

ان تصانیف کے علاوہ علوم شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ میں بیسیوں ایسی تصانیف موجود ہیں جن میں ہندستان کے علاوہ ایران ' افغانستان ' ترکی اور عرب ملکوں کے تاریخی ادوار پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

ادبی تصانیف

انسٹی ٹیوٹ کے خزانے میں عظیم مشرقی کلاسیکی ادب کے فرمارواؤں میں یوسف خاص حاجب بالاساغونی ' رودکی ' فردوسی ' نظامی گنجوی ' سعدی ' امیر خسرو دہلوی ' عبد الرحمن جامی ' علی شیر نوائی ' فرید الدین عطار ' جلال الدین رومی ' حافظ ' عمر خیام ' فضولی اور میرزا عبد القادر بیدل جیسے بلند پایہ اور مشرقی ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف محفوظ ہیں ۔

خمسہ

اس کے علاوہ عظیم مفکر اور عالم ابو علی ابن سینا ' علامہ زمخشری اور محمود کاشغری بھی موجود ہیں جن کی تصانیف میں ادب ' تاریخ اور فلسفہ کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

وسط ایشیا کے عظیم مفکر اور عالم ابو علی ابن سینا علم فلسفہ اور علم طب کی ترقی میں بے پناہ خدمات کے لیے مشہور ہیں ۔ انھیں عالم اور قاموس نگار کی حیثیت سے شیخ الرئیس کا خطاب دیا گیا ۔ اپنے زمانے کے علوم پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ادبی تخلیقات میں بھی بڑی بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ موجودہ وقت تک ان کی شاعری کے کچھ اقتباسات اور ایک ادبی تصنیف " سلامان و ابسال " کی واحد کاپی محفوظ رہ سکی جو اس خزانے کا زیور بنی ۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں ۱۱ویں صدی کے مشہور عالم اور ادبی نقاد یوسف

خاص حاجب کی تصنیف قوتادغو بیلیک ' علم کا ایک خوش نما قلمی نسخہ ہے جو انسٹی ٹیوٹ کے سب سے پرانے نسخوں میں سے ایک ہے جس کو ۱۴ویں صدی میں دوبارہ قلم بند کیا گیا ۔ قلمی نسخوں میں عظیم آذر بائیجانی شاعر نظامی کی تشریحی اور با تصویر تصنیف اور علی شیر نوائی کی " خمسہ " کی جلد بھی موجود ہے ۔ نوائی کی تصنیف کو مشہور خوش نویس عبد الجمیل نے ان کی زندگی ہی میں خوش خطی میں لکھا تھا ۔

۱۶ویں صدی کے مشہور آذر بائیجانی شاعر محمد ابن سلیمان فضولی کے دیوان کے کئی نسخے انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے کی زینت ہیں ۔ دوسرے نسخوں میں عظیم تاجک شاعر عبدالرحمن جامی کی کلیات " اور ان کا دیوان " ہفت اورنگ شامل ہیں ۔ ان میں سے بعض تصانیف مصنف نے خود اپنے ہاتھوں سے تحریر کیں ۔

بلند پایہ شاعر احمد شاہ درانی کا دیوان جو پشتو زبان میں لکھا گیا نایاب قلمی نسخوں میں شامل ہے ۔ ازبیک ادب کی تاریخ سے متعلق قابل ذکر تصانیف کے مصنفوں میں : سکاکی ' لطفی ' علی شیر نوائی ' ظہیر الدین محمد بابر ' مشرب ' مجلسی ' خواجہ ' ہویدا ' غازی حاذق ' محریم عابد ' حکیم زادہ نیازی وغیرہ شامل ہیں ۔

فلسفہ اور علم طبیعی سے متعلق قلمی نسخہ جات

عہد وسطی کے ممتاز عالموں کی تصانیف شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کے علمی خزانے کی زینت ہیں ۔ وسط ایشیا اور مشرق کے بہت سے عالموں نے علمی دنیا میں اپنی قابلیت کی بنا پر جو مقام پیدا کیا وہ علم ریاضی ' طبیعیات ' کیمیا ' فلکیات ' طب ' دوا سازی ' معدنیات ' فلسفہ سائنس اور دوسرے علوم سے متعلق تصانیف کی واضح اہمیت اور شہرت کی وجہ سے حاصل ہو سکا ۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی نسخوں کے خزانے میں نویں ' دسویں صدی عیسوی کے ممتاز کیمیاں داں ابو بکر الرازی کی " کتاب سر الاسرار " کا نادر نسخہ موجود ہے جس کو ۱۵۰۱ء میں دوبارہ قلم بند کیا گیا ۔ انسٹی ٹیوٹ اس قلمی نسخے کے ملنے سے دنیا کے مشرق شناسوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے ۔

وسط ایشیا کے عظیم فلسفی اور مفکر ابو نصر الفارابی نے جو معلم ثانی کے نام سے مشہور ہوئے، عہد وسطیٰ کے تمام کے تمام علوم کی ترقی میں بڑی خدمات انجام دیں۔ اس قلمی خزانے میں ان کی عیون المسائل، فصوص الحکم، فی المعانی العقل، کتاب آرا اہل المدینہ الفاضلہ جیسی قیمتی تصانیف محفوظ ہیں۔

یہاں پہنچنے والی دوسری تصانیف میں عظیم ازبیک عالم و مفکر ابو ریحان البیرونی کی علمی کتابیں بھی شامل ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ میں ان کی تصنیف کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم موجود ہے جو علوم کا قاموس ہے۔ اور علم ریاضی، فلکیات، جغرافیہ اور دوسرے علوم کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس تصنیف کا قلمی نسخہ فارسی زبان میں تیرھویں صدی عیسوی میں دوبارہ لکھا گیا جو قدیم اور نایاب نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی نسخوں میں البیرونی اور ابو علی ابن سینا کے "سوال و جواب" کا نسخہ علم طبیعی کی تاریخ کے مطالعے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عظیم عالم اور قاموس نگار ابو علی ابن سینا کی تصانیف عہد وسطیٰ کے مختلف علوم سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے نسخوں میں ان کی پانچ جلدوں والی کتاب "القانون فی الطب" محفوظ ہے۔ جس کے ایک قلمی نسخے کو ۱۳ویں صدی عیسوی کے آخر میں اور ۱۴ویں صدی کے شروع میں قلم بند کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف بھی محفوظ ہیں جن میں ارجوزہ، کتاب الارشادات اور کتاب الشفا کا ایک نسخہ شامل ہے اور دوسری قلمی تصانیف میں یاقوت حموی کی مشہور کتاب معجم البلدان قابل ذکر ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں عظیم عالم اور ماہر فلکیات الغ بیگ، قاضی زادہ رومی، علی قوشچی، قطب الدین شیرازی اور علوم طبیعیات کے دوسرے عالموں کی تصانیف بھی موجود ہیں۔ یہاں بڑی تعداد میں پائے جانے والے قلمی نسخہ جات وسط ایشیا، مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کی قوموں کے جمالیاتی اور منطق نظریات کی عکاسی کرتے ہیں۔ علم فلسفہ اور سماجی علوم کی تاریخ سے متعلق تصانیف میں نصیرالدین

طوسی، محمد شریف جرجانی اور دوانی جیسے عالموں کی تصانیف کے ساتھ افلاطون اور ارسطو جیسے بلند پایہ قدیم یونانی عالموں کے عربی اور فارسی ترجمے موجود ہیں۔

ادب، قواعد، جغرافیہ، سنگیت کاری، خوش نویسی، تاریخ اسلام، تصوف اور فقہ وغیرہ سے متعلق تصانیف، کتابیں اور ان کی فہرستیں اور یادداشتیں بھی انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے کا حصہ ہیں۔ بعض ایسے قلمی نسخے مشہور خوش نویسوں نے قلم بند کیے ہیں جن کے نقوش مختلف زمانوں کی مصوری کے دل کش نمونے ہیں۔ اور مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کی قوموں کے فنون کی تاریخ کے مطالعے کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کے کمیاب اور نایاب قلمی نسخہ جات مشرقی قوموں کے کلچر اور ماضی کے ثقافتی ورثہ کے مطالعے کی اچھی بنیاد کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ اور ازبکستان کی سائنسی اکادمی کے زیر اہتمام جس کا قیام ۱۹۴۳ء میں ہوا، مشرقی نسخہ جات کے تحقیقی انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی اور پھر انسٹی ٹیوٹ کے وجود میں آنے کے بعد وہ تمام قلمی نسخے اور مسودے وغیرہ جو علی شیر نوائی نامی ریاستی کتب خانے کے مشرقی شعبے میں موجود تھے، اس تحقیقی ادارے کے حوالے کر دیے گئے۔

شروع میں اس ادارے میں قلمی نسخوں کے لیے صرف ایک شعبہ قائم تھا لیکن بعد میں جب انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا تو اس میں ابتدائی مطالعے اور ترتیب کاری کا شعبہ، سائنسی توصیف اور فہرست بنانے کا شعبہ، تحریری تصانیف اور دستاویزات کی تحقیقات اور اشاعت کا شعبہ اور وسط ایشیا کے ساتھ روابط کی روشنی میں ہمسایہ ملکوں کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے مطالعے کے شعبے قائم ہوئے۔ اس ساری ترتیب و تنظیم کے سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ کا نام بھی بدلا گیا اور آج وہ سوویت ازبکستان کی سائنسی اکادمی کا "البیرونی علوم شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے مشہور ہے۔

بے مثال قلمی نسخوں کے خزانے میں اضافہ

علوم شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کی انتظامیہ نے نئے قلمی نسخوں کی تلاش کے سلسلے میں مخصوص کمیشن مقرر کیا ہے۔ اس کمیشن کے ارکان نئے قلمی نسخوں کو حاصل کرنے اور ان کا کھوج لگانے کے لیے ہر سال ازبکستان کے اضلاع، شہروں اور مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہیں۔

اس مہم کے سلسلے میں بخارا میں کئی قلمی نسخہ جات، پرانی چھپی ہوئی تصانیف اور دستاویزات خریدی گئیں۔ ان میں وسط ایشیا کے مشہور مورخ، شاعر اور فن موسیقی کے ماہر حافظ تیش بخاری کی قابل قدر تاریخی تصنیف عبد اللہ نامہ، شرف الدین علی یزدی کا ظفر نامہ، حمد اللہ قزوینی کی نزہتہ القلوب اور زین الدین وصفی کی بدایع الوقایع وغیرہ شامل ہیں۔

مشرق میں نظم "کلیہ و دمنہ" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ عربی زبان میں لکھی گئی اور بعد میں اس کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ یہ تصنیف سبق آموز کہانیوں اور مقولوں پر مشتمل ہے۔ اور اب اس کا دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں اس کا ایک پرانا نسخہ موجود ہے جو ۱۴ویں صدی میں خوش خط اور سلیس زبان میں لکھا گیا۔ یہ دنیا کے نایاب قلمی نسخوں میں سے ایک ہے۔ اس کا ازبک زبان میں ترجمہ ۱۸ویں صدی عیسوی میں ہوا۔

انسٹی ٹیوٹ کے نایاب نسخوں میں کتاب سند باد بھی شامل ہے۔ دنیا میں اس کے صرف تین نسخے موجود ہیں جن میں سے یہاں کا نسخہ سب سے پرانا ہے۔ اس کو ۶۸۵ ھ/۱۲۸۶ء میں ابو السید ابن عمر ابن محمود ابن ابو الحفیظ البشاری (الملقب بہ رکن الانوی) نے دوبارہ قلم بند کیا۔ اس نسخے میں ۱۴ باب ہیں جن میں ۳۵ لاجواب کہانیاں موجود ہیں۔ اس نسخے کے پیش لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نصر الدین ابو محمد نوح بن نصر ابن نصر السامانی کے زمانے سے قبل پہلوی زبان میں تھا۔ پھر نوح بن نصر السامانی کے حکم پر خواجہ عمید الفوارس قناورزی نے اس کو دری زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے دو سو سال گزر جانے کے بعد سمرقند کے عالم محمد ابن علی ابن محمد ابن الحسن الکاتب

نے ۵۵۶ ھ/۱۱۶۱ء میں اس قلمی نسخے میں قلیچ تپغاج خاں کی ہدایت پر کچھ ادبی تبدیلیاں کیں۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں ایک اور کم یاب تصنیف کا اضافہ ہوا جو اندیجان میں پائی گئی۔ یہ مسعود ابن عثمان کوہستانی کی تصنیف تاریخ ابو الخیر خانی ہے۔ دریافت سے پتا چلا ہے کہ اس پرانے قلمی نسخے کو شیبانی خاندان کے دور (۱۰۵۱ تا ۱۵۴۰ء) کے ایک حکمران عبداللطیف کے زمانے میں تخلیق کیا گیا۔ یہ تصنیف زمانہ قدیم سے ابو الخیر خاں کے دور حکومت تک وسط ایشیا کے تاریخی واقعات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں دشت قپچاق میں خانہ بدوش ازبک قبائل کی زندگی، ان کے قریبی اتحاد اور ابو الخیر خاں کی ریاست کے قیام کی تاریخی نوعیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے کاغذ اور خطاطی کا جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۱۶ویں صدی کی تصنیف ہے۔

اب تک اس تصنیف کے صرف دو قلمی نادر نسخوں کے بارے میں علم تھا جن میں سے ایک برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا تاشقند کے اس انسٹی ٹیوٹ میں جب کہ نئے دریافت شدہ نسخے زیادہ پرانے ہیں اور بعض ان نقائص سے مبرا ہیں جو بعد کے ان دو نسخوں میں پائے جاتے ہیں۔ تیسرے قلمی نسخے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انھائیس خوب صورت اور نفیس تصاویر ہیں جو اس قسم کی دوسری تصانیف میں نہیں پائی جاتیں اور اس کے باوجود کہ یہ تصویریں چار سو سال پرانی ہیں آج بھی بہتر حالت میں ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ میں موجود ایک اور قلمی نسخے کا ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ قلمی نسخہ ابو علی ابن سینا کی القانون فی الطب کا پرانا اور مکمل نسخہ ہے۔ یہ نسخہ انسٹی ٹیوٹ کے کمیشن نے شہر اندیجان میں قیام کے دوران شہر لینسک کے لوگوں سے خریدا ہے۔ اس کی دریافت اس وقت ہوئی کہ جب انسٹی ٹیوٹ کے اسکالر القانون کا عربی زبان سے ازبک اور روسی زبانوں میں ترجمہ کر رہے تھے۔ اس کام کو بہتر طور پر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ تصنیف کے سارے قلمی نسخوں کا موازنہ کیا جائے جو مختلف ملکوں میں موجود ہیں اور اس بات کا پتا لگایا جائے کہ ان میں سے کون سا نسخہ سب سے قدیم

ہے۔ نئی دریافت سے پہلے یہاں کے قلمی نسخوں میں جو مخطوطے موجود تھے وہ سب ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی عیسوی کے تھے۔ اس لیے اندیجان سے دریافت ہونے والے نسخے کی زیادہ اہمیت ہے اور اسکالروں نے اس کی دریافت پر بڑی خوشی کا اظہار کیا، کیوں کہ یہ ۱۳ویں صدی کے آخر اور ۱۴ویں صدی کے شروع کا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے نئے قلمی نسخوں میں ابو قلندر کی تصنیف **قلندر نامہ** شامل ہے جو دنیا میں واحد قلمی نسخہ ہے۔ اس کے مطابق مصنف نے ۷۲۰ھ/۲۱-۱۳۲۰ء میں اس کو لکھنا شروع کیا۔ قلندر نامہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ چار جلدیں سلطان ازبیک خاں کے دور حکومت میں تحریر کی گئیں۔ اور پانچویں جلد کریمیا میں سلطان محمود جلال الدین جان بیگ کے زمانے میں لکھی گئی۔ مصنف کے مطابق اس قلمی نسخے کو تحریر کرنے میں بیس سال کا عرصہ لگا۔ تیسری جلد ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء میں مکمل ہوئی اور چوتھی پانچویں جلدیں بعد کے دور میں۔ اس تصنیف کو شیخ بایزید العشاقی انصمریؔنی نے ۷۶۱ھ/۶۰-۱۳۵۹ء میں خوش خطی میں تحریر کیا۔ قلندر نامہ میں اخلاقی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور واقعات کے مطابق یہ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کے جواب میں لکھی گئی۔ یہ تصنیف محبت، انسان، انسان دوستی، زبان، عقل، انصاف، خیرات اور تربیت جیسے مسائل پر مصنف کے نظریات کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار حکایتوں، کہانیوں، کہاوتوں، تمثیلوں، مقولوں کی مدد سے اور متعدد عالموں کی زندگیوں کے دل چسپ واقعات سے کیا ہے۔

خوش قسمتی سے حال ہی میں علی شیر نوائی کے دیوان "نوادر النہایہ" کا قلمی نسخہ دریافت ہوا جس کی کتابت ہرات میں کاتب عبدالجمیل نے شاعر کی زندگی ہی میں کی تھی۔

دوسرے نئے قلمی نسخوں میں قاضی زادہ رومی کی شرح ملخص فی الہیئۃ، بشیر محمد مونس کا دیوان مونس، عبد الرحمن جامی کی یوسف زلیخا جو بے مثال تصاویر سے مرصع ہے، علی قوشچی کا رسالہ در فلکیات، علی شیر نوائی کا خمسہ اور دیوان، آگہی کی جامع الواقعات سلطانی، تصاویر سے مزین دیوان حافظ، شاعر غربت کے دیوان کا دنیا میں واحد نادر نسخہ،

فرقت کی متعدد غزلوں کے علاوہ بہت سی دوسری علمی اور فنی تخلیقات شامل ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کے قلمی نسخوں کے خزانے میں بعض سائنس دانوں اور عالموں کی طرف سے بطور تحفہ پیش کردہ قلمی نسخوں کی وجہ سے بھی اضافہ ہوا۔ مثلاً ازبیک سائنس اکادمی کے اکادمشن یحیٰی غلاموف نے ہمیں خوارزم کے مشہور مورخ اور شاعر محمد یوسف بیانی کی کتاب شجرہ خوارزم شاہی بطور تحفہ پیش کی جو وسط ایشیا کی تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ سوویت طبی سائنس اکادمی کے اکادمشن پروفیسر واسیلی تیرنوفسکی نے شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کے خزانے میں اضافہ کیا۔ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے سے سنگی طباعت کی تقریباً ۱۰۰ جلدیں بطور تحفہ دیں جن میں ۳۰۰ مختلف تصانیف ہیں۔

اس وقت انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے میں کم و بیش ۱۸ ہزار نادر اور بیش قیمت نسخہ جات ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مجموعوں میں کئی کئی تصانیف بھی موجود ہیں۔

سائنسی و علمی ورثے کا مطالعہ

تاشقند شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کے کارکن قدیم نسخہ جات کی ترتیب و فہرست تیار کرنے ترجمہ کرنے اور ایسی دستاویزات اور تصانیف کی اشاعت کرنے کے سلسلے میں بڑا اہم اور مفید کام کر رہے ہیں جو سائنسی معلومات کے لحاظ سے بڑی ضروری ہیں۔

قلمی نسخہ جات کی معلومات رکھنے والے ماہرین کی کئی سال کی انتھک محنت کے نتیجے میں انسٹی ٹیوٹ میں مشرقی مطالعہ کے بعض نسخوں کی فہرستوں میں چار اقسام کی تشخیص کی گئی۔ یہ ہیں نمبر شمار، مصنفوں کے نام، تصانیف اور مضمونوں کے عنوانات۔ یہ محنت طلب کام اب بھی جاری ہے۔ اسی کی بدولت ۱۵ جلدوں پر مشتمل ازبیک سائنسی اکادمی کے قلمی نسخوں کی فہرست کی اشاعت ہوئی جن میں مشرقی قوموں کی زبانوں میں ۱۸۷۹ قلمی نسخوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کا مختصر خلاصہ پیش کیا گیا۔ یہ کام مزید جاری رہے گا۔ ان عام فہرستوں کے علاوہ ابو نصر الفارابی، ابو علی ابن سینا، امیر خسرو دہلوی، عبدالرحمن جامی، علی شیر نوائی جیسے عظیم مفکر، عالم اور شاعروں کی

تصانیف کی الگ الگ فہرستیں شائع ہو چکی ہیں۔

شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کے اسکالروں نے حمزہ نامی فنون کے علمی تحقیقی انسٹی ٹیوٹ کے اسکالروں کے ساتھ مل کر ازبکستان کی سائنسی اکادمی کے علوم شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ کے قلمی نسخوں میں ملنے والی مشرقی تصاویر کا مرقع تیار کیا اور اشاعت کی۔

گزشتہ عرصے میں انسٹی ٹیوٹ کے کارکنوں نے وسط ایشیا کے عظیم عالم ابو ریحان البیرونی، ابو علی سینا اور بعض دوسرے عالموں اور مفکروں کی سائنسی تصانیف پر علمی تحقیقی کام کیا اور بعض ایسی تصانیف کی اشاعت کرانے میں کام یاب بھی ہوئے۔ اس کام میں ماسکو اور لینن گراد کے اسکالروں نے بھی مدد کی۔

انسٹی ٹیوٹ نے مزید جو تصانیف شائع کیں۔ ان میں ابو ریحان البیرونی کی چھے تصانیف شامل ہیں : آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ (ماضی کی نسلوں کی یادگاریں)، تحقیق ما للھند (تاریخ ہند)، کتاب النہایہ (علم پیمائش ارض)، کتاب الصیدنہ فی الطب، القانون المسعودی، کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم۔

انسٹی ٹیوٹ کے اسکالروں نے پانچ کتابوں پر مشتمل ابو علی ابن سینا کی تصنیف القانون فی الطب کا ترجمہ عربی زبان سے ازبک اور روسی زبانوں میں کیا اور پانچ جلدوں میں اس کی اشاعت کی۔ اس تصنیف کے ترجمے کے لیے انسٹی ٹیوٹ کے قلمی نسخوں کی مدد کے علاوہ سوویت یونین کے دوسرے علاقوں میں موجود قلمی خزانوں کے نسخے اور بیرونی ملکوں کے قلمی نوادر کی چھان بین کی گئی۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود بھی اس تصنیف کا دنیا کی جدید زبانوں میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ اس کا پہلا اور مکمل ترجمہ صرف سوویت یونین میں ہوا۔

ابو علی ابن سینا کے ایک ہزارویں یوم پیدائش کے موقع پر ان کی تصنیف القانون فی الطب دوبارہ شائع کی گئی۔ انسٹی ٹیوٹ نے اس عظیم عالم کی تصانیف کے مطالعے، تحقیق اور اشاعت کے سلسلے میں گزشتہ تیس سال میں جو خدمات انجام دیں ان کی تعظیم اور اعتراف کے طور پر اسے بین القوامی ابن سینا انعام سے نوازا گیا۔

انسٹی ٹیوٹ کے اسکالروں نے تاریخ اور ثقافت اور مختلف علوم کی تاریخ سے متعلق جن تصانیف کا ترجمہ کیا اور اشاعت کی۔ ان میں ابو بکر الرازی کی سر الاسرار، ظہیرالدین محمد بابر کا بابر نامہ، گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ، عبد الرزاق سمرقندی کا سفرنامہ ہندستان، (خیوا دولت حجت لاری ریاست خیوا کی دستاویز)، میر عبدالعظیم سامی کی تاریخ اسلاطین منغتیہ، زمچی کی تصنیف مطلع السعدین و مجمع البحرین، نیصیح احمد الحوانی کی بھل نیصیحی، فضل اللہ روزبہان کا مہمان نامہ بخارا، تاریخ گزیدہ و نصرت نامہ، محمد ابن ولی کی تصنیف بحر الاسرار کا جغرافیائی حصے، میرزا بدیع دیوان کی مجمع الارقام، بو علی ابن سینا کی تصانیف الادویتہ القلبیہ (امراض دل کی دوائیں)، ارجوزہ، سلامان و ابسال، ۱۹ویں صدی کی قاراقلپاق تاریخ کی خاص دستاویزات وغیرہ شامل ہیں۔

ان تصانیف کی تحقیق و تعلیم اور ان کی مسلسل اشاعت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سوویت ازبکستان کے شرقیاتی انسٹی ٹیوٹ میں محفوظ قلمی نسخوں کا ازبک اسکالر گہرا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت کی طرف بھی بڑی توجہ کر رہے ہیں۔ سوویت حکومت اور کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے کے مطابق تاشقند میں قلمی نسخوں کو اصلی شکل دینے اور ان کی بحالی کے لیے لیبارٹریاں بھی قائم کی گئی ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انسٹی ٹیوٹ کے قلمی خزانے سے دن بہ دن لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں موجود قلمی نسخے نہ صرف سوویت یونین کے عالموں بلکہ بیرونی اسکالروں کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول کر رہے ہیں۔ مشرق شناسوں کی پہلی کل یونین تاشقند کانفرنس، ایشیائی و افریقی ادیبوں کی کانفرنس، ماسکو میں منعقد ہونے والی ۲۵ویں عالمی مشرق شناسوں کی کانفرنس کے بیشتر شرکا نے انسٹی ٹیوٹ کے قلمی نسخوں کا معائنہ کیا اور اس کے کارکنوں کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی۔

انسٹی ٹیوٹ کے مہمانوں میں فرانس کے سابق صدر مرحوم جارج پامپیدو، بھارت کے سابقہ صدر راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، مسٹر وی۔ وی۔ گری، وزیر اعظم

جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری کے علاوہ بھارت کے مشہور ادیب سید سجاد ظہیر ' پاکستان کے بلند پایہ شاعر و سماجی کارکن ' لینن انعام یافتہ فیض احمد فیض اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ' ایران کے مشہور عالم سعید نفیسی ' عراق کے پروفیسر حسین علی محفوظ ' علی گڑھ یونی ورسٹی کے پروفیسر بشیرالدین ' مغربی جرمنی کی ترک شناس پروفیسر آنا ماریا گابین ' برٹش میوزیم کے ایک شعبہ کے سربراہ بازیل گرے ' دہلی یونی ورسٹی کے پروفیسر متوفی محمد اشرف ' حیدر آباد یونی ورسٹی کے پروفیسر نظام الدین ' قاہرہ کے عربی نسخہ جات کے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر صلاح الدین منجد ' تیونس کے مشہور عالم عبد الوہاب ' ہارورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر بھورال لیمب وغیرہ نمایاں رہے ہیں۔

ڈرامہ۔ الغ بیگ۔ حمزہ تھیٹر

جناب محترم مرزا یوف صاحب نے پروگرام بنایا کہ تاشقند کے حمزہ تھیٹر میں آج الغ بیگ پر ایک ڈرامہ ہے ' اسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ میں بڑی خوشی سے اس کے لیے تیار ہوگیا۔ ہم ۷ بجے تھیٹر پہنچ گئے۔ خیال تھا کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوگا مگر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے ہال میں شاید پچاس ساٹھ ہی آدمی تھے۔ میں نے جناب مرزا یوف صاحب سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ دنیا کا مزاج اب پاپ میوزک جیسے پروگراموں کے لیے ہوگیا ہے۔ اس قسم کے تاریخی اور سنجیدہ پروگراموں کے لیے کم از کم آج کا جوان شوق دید و فہم نہیں رکھتا۔

ڈرامہ واقعی خوب صورت تھا۔ اداکاری کا پایہ بلند تھا۔ الغ بیگ کی زندگی کو بڑے خوب صورت انداز سے پیش کیا گیا۔ اس کی رسد گاہ کو پورے ڈرامے میں حد درجہ اہمیت حاصل رہی۔ جب الغ بیگ کے خلاف اس کے بیٹے نے بغاوت کی تو کشت و خون سے قوم کو بچانے کے لیے الغ بیگ نے تاج و تخت سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ من جملہ سات شرائط کے ایک شرط یہ تھی کہ میری رسد گاہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے تاکہ میں تحقیقات ماہ و انجم میں اپنی زندگی صرف کر سکوں۔ بیٹے نے وعدہ کیا مگر عین اسی رسدگاہ میں الغ بیگ کو قتل کر دیا!

الغ بیگ کی رسدگاہ سمرقند میں قائم تھی جو امتداد زمانہ کی نذر ہوگئی تھی۔ پندرہ سولہ سال ہوئے حکومت روس نے اسے تلاش کیا۔ یہ زیر زمین تھی۔ زمین کھود کر اس رسدگاہ کو نکالا ہے اور اسے بحال کر دیا ہے۔ میں نے شاید ۱۹۷۷ء میں اسے دیکھا تھا جب میں بہ سلسلہ کانفرنس صدرالدین عینی دوشنبہ اور سمرقند آیا تھا۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۹ء

تاشقند ۔ بخارا ۔ تاشقند

صبح آنکھ کھلی تو ٹھیک پونے چار بجے تھے ۔ اب سونے کا کیا سوال ! یہ تو تہجد گزاری کا وقت ہے ۔ واقعی وہ دور بھی کیا ہوگا کہ جب تاشقند مرکز علم و حکمت کے ساتھ مرکز شریعت اسلامی بھی تھا ۔ نہ جانے یہاں کتنے بزرگان دین ہوں گے ۔ تہجد کا سماں رہتا ہوگا ۔ اب اس شہر میں شریعت اسلامی کا دور دورہ نہیں ہے ' گو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہاں اسلام کا نام ونشان تک نہیں ہے ۔ نام ہے اور ضرور ہے ۔ یہاں ہر انسان کا نام مسلماں ہے ۔ مرزایوف ' شوکتوف ' فیروزہ ' مرعوف ' یعقوبوف ' غفاروف ۔ آبادی قدیم میں مساجد ہیں ۔ یہاں اذانوں کی آوازیں بھی فضاؤں میں بکھرتی ہیں اور تحلیل ہوجاتی ہیں ۔ نمازی بھی ہیں ۔ نماز پر کوئی قدغن ہے نہ اذان پر کوئی پابندی ۔ جس تیزی کے ساتھ قدیم آبادیاں مسمار کی جاری ہیں اسی رفتار سے نئی آبادیوں کو وجود دیا جارہا ہے ۔ نئی آبادیاں اکثر و بیشتر فلیٹ سسٹم پر مبنی ہیں اور آبادیاں مل جل رہی ہیں ۔ ان فلیٹوں میں نہ کمال اسلامیت ہے نہ کمال لینینیت ۔ دونوں مزاج ہم آہنگ ہوتے چلے جارہے ہیں ۔ ازبیکستانی اور موسکووی مل جل کر رہ رہے ہیں ۔ ازبیکستانی زبان کو یہاں قرار حاصل ہے ۔ حکومت اس زبان کی سرپرست ہے ۔ ازبیکستانی زبان میں ترکی کے الفاظ خوب ہیں ۔ فارسی بھی آمیز ہے ۔ عربی الفاظ بھی ہیں اور اب روسی زبان کے الفاظ بھی ازبیکستانی زبان قبول و جذب کررہی ہے ۔ اس کا رسم الخط بہر حال روسی ہے ۔ جسے اب سب لکھتے پڑھتے ہیں ' اور کوئی ابہام یا تکلف موجود نہیں ہے ۔ میرا تاثر یہ ہے کہ حکومت روس کو ازبیکستانی زبان سے کوئی بیر ہے نہ اس سے کوئی مخاصمت ۔ روس میں نیا دور اس کے حق میں ہے کہ ازبیکستانی زبان کو اہمیت دی جائے ۔ اسے سرکاری حیثیت اور تائید حاصل ہے جو تسلیم حقوق پر آمادہ ہے اور تہذیب وثقافت اسلام کی دشمن معلوم نہیں ہوتی ۔ ہاں روس کے دور

ماضی میں یہ مزاج نہ تھا ۔ ازبیکستانی زبان کو ثانوی حیثیت بھی حاصل نہ تھی اور بڑی سرعت و شدت کی ساتھ اس میں روسی الفاظ داخل کر کے اس کی اپنی حیثیت ختم کردینے کا رجحان تھا ۔ مگر اب صورت حال ایسی سخت نہیں ہے ۔ پھر بھی حاکم کی زبان بہرحال زبان حاکم ہے ۔ میں یہ تو کہنے کو تیار نہیں ہوں کہ روس میں اقتدار اعلا نام لیوایان اسلام کو' جو روس کے ایک نہایت مستحکم رہنے والے ہیں ' درجہ ثانوی دیتا ہے اور جہاں تک مجھے اندازہ ہے روس میں اسلام کے نام لیوا خود کو حقیر نہیں سمجھتے ہیں ' اور شاید اب ان کے ساتھ کوئی تحقیر آمیز سلوک ہے بھی نہیں ۔ بہ ایں ہمہ لوگوں کے دل ودماغ پر ایک ذہنی کیفیت طاری ہے جس سے نکلنے کے لیے بیداری کا احساس ہوتا ہے ۔ ازبیکستانی زبان میں قدیم علوم و فنون کے تراجم بڑی اہمیت کے ساتھ ہورہے ہیں ۔ اس کی ایک مثال بڑی دل چسپ کی ہے ۔ "القانون فی الطب" از شیخ الرئیس ابوعلی ابن سینا کا روسی زبان میں مکمل ترجمہ چھے جلدوں میں ہوچکا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی القانون فی الطب کا ازبیکستانی زبان میں بھی ترجمہ موجود ہے ۔ القانون فی الطب یقینی طور پر ایک نہایت سنجیدہ کتاب ہے ۔ ایک فنی و علمی اور لازماً ایک طبی کتاب ہے ۔ روسی زبان میں اس کے ترجمے کی حیثیت اور ضرورت اس لیے ہے کہ میدان طب میں باب تحقیق وا ہوسکے اور روس میں علم و حکمت کے میدانوں میں پیش رفت کے لیے دانش قدیم کے نظریات اور فلاسفہ نظرانداز نہ ہونے پائیں ۔ یہ بلندی فکر ہے ۔ نہ صرف بلندی فکر ہے بلکہ یہ علوم وفنون کے میدانوں میں مثبت پیش رفتوں کا عنوان بھی ہے ۔ یہ انداز فکر اس حقیقت کا آئینہ دار بھی ہے کہ قدما نے اپنے تجربات اور مشاہدات کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ علوم و فنون کے ہر میدان میں رہنما حیثیت رکھتے ہیں ۔ روسی زبان میں القانون فی الطب کا ترجمہ روسی علما و مفکرین کی ضرورت ہے' مگر اس علم و حکمت سے ازبیکستانی علما کو محروم رکھنے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے ۔ ازبیکستانی تحقیق کاروں کے لیے بھی القانون فی الطب کا ازبیکستانی زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور چھے جلدوں میں چھاپ دیا گیا ہے ۔ یہ علمی پیش رفت اس حقیقت کی بھی عکاس ہے کہ ازبیکستانی زبان سے حکومت روس کو کوئی

پرخاش نہیں ہے بلکہ وہ پوری دیانت کی ساتھ از بیکستانی زبان جاننے والے علما کے لیے بھی احترامات کے ساتھ سامان تحقیق فراہم کر دینے کو اپنی ذمہ داری قرار دیتی ہے ۔

یہ وہ انداز فکر ہے کہ جس کا میں پاکستان میں داعی رہا ہوں' مگر میں پاکستان کے ڈاکٹروں ' سائنس دانوں اور اقتدار کے متوالوں اور حکومت کے ٹھیکیداروں کو اس فکر پر آمادہ عمل نہ کر سکا ۔ جس طرح ہماری تعلیم اغیار کی رہین منت ہے اسی طرح صحت ملی مغرب کے کثیر الممکلتی شاہوں کے رحم وکرم پر ہے ۔ اگر پاکستان بیمار ان کی دواؤں کی منڈی نہ ہوتی تو ہم شاید مغلوب نہ رہتے ۔ اب تک تو حال یہ ہے کہ ہم محنت سے گریز کر کے اپنی صحی پالیسیاں بھی اغیار سے بنواتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کے لیے مالی امداد ان سے طلب کرتے ہیں ۔ گویا صحت کا پورا نظام گروی رکھ دیا گیا ہے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے ! ایسے غلیظ و پلید ماحول میں علم و حکمت کی آبیاری کیسے ہو سکتی ہے ۔میں چار سال مشیر وزیر رہا مگر میری وزارت صحت کا بیوروکریٹ کرنل جنرل غالب رہا ۔ بات اس کی چلی اور میں بے چارہ کا بے چارہ ہی رہا ۔

صبح بیدار ہو کر میں نے نماز تہجد ادا کری اور پھر لیٹ گیا ۔ نماز فجر میں تو تین گھنٹے باقی ہیں ۔ ہوٹل کے اس کمرے میں ضرور کوئی اللہ والا ٹھیرا ہو گا اور ہو سکتا ہے اس نے بھی یہاں نمازیں ادا کی ہوں ۔ اگر ایسا پہلے نہیں ہوا تو آج تو ہو ہی گیا ہے ۔ شاید کل یہاں کوئی اللہ کا نام لینے والا آ کر ٹھیرے اسے یہاں میری گواہی ملے گی !

ایک دل چسپ مطالعہ

اس ہوٹل کا ماحول نہایت دل چسپ ہے ۔ لوگ آپس میں ملتے ہیں تو السلام علیکم کہتے ہیں ۔ سلام سلام بھی روایت ہے ۔ اکثر و بیشتر کے نام اسلامی ہیں ۔ " اوف " کا اضافہ خالص روسی ہے ۔ مثلاً عاصم صاحب اب خود کو عاصموف لکھتے ہیں ۔ ناموں میں روسی " اوف " کا اضافہ روسی اثر اندازی کا آئینہ دار ہے ۔ یہ ایسا ہے کہ ہم پاکستان میں زید ۔ اے ۔ بھٹو لکھتے پڑھتے ہیں' حال آں کہ یہ ذوالفقار علی بھٹو ہے ۔ مگر

انگریزی نے ہمارے ہاں اثر چھوڑا ہے کہ اکثر و بیشتر بڑے لوگ اپنے نام اسی انداز سے لکھتے ہیں ۔ ایم ۔ ایچ ۔ آفندی صاحب محبت حسین آفندی کو جب انگریزی انداز سے لکھیں تو بدیہی طور پر یہی کہا جائے گا کہ انگریز نے اپنا اثر چھوڑا ہے ۔ ایک نہایت دل چسپ مطالعہ ملاحظہ فرمایئے : پاکستان کے اکثر و بیشتر' بلکہ تمام کے تمام بیوروکریٹوں کے نام آپ نہایت غور سے دیکھیے ۔ گزشتہ پاکستان کی بیالیس سال کی تاریخ میں جس قدر بھی بیوروکریٹ پاکستان میں بر سر اقتدار آئے ہیں سب کے نام اسی انداز کے ہیں ۔ شاید ایک آدھ مثال ایسی ہو کہ کسی نے اپنا پورا نام لکھا ہو ۔ پاکستان کے بیش تر بیوروکریٹ ہنوز دام فرنگ کے اسیر ہیں ۔ ان کا فکر و مزاج اور ان کا انداز غور و عمل خالصتہً مغربی ہے ۔ آج تک ان میں مشرقیت کا کوئی دخل نہیں ہوا ہے ۔ پاکستان کی حکومتی زبان آج بھی انگریزی ہے ۔ جب تک پاکستان میں حقیقی اسلامی انقلاب برپا نہ ہو گا پاکستان سے فرنگیت کا اخراج نہیں ہو گا ۔ عالی مرتبت صدر گرامی قدر شہید کے ساتھ دوسرے مختلف حوادث کے ساتھ ایک حادثہ مسلسل یہ جاری رہا کہ وہ پاکستان میں بیوروکریسی کو مشرقیت سے ہم کنار نہ کر سکے اور دفاتر میں نمازوں کا انتظام کرا دینے کے باوجود وہ بیوروکریسی کو اسلامیت سے سرشار نہیں کر سکے ۔ ان کے دور میں بھی بیوروکریسی غالب رہی اور ان کی تمام مشرقی و اسلامی پیش قدمیوں کی نفی کرتی رہی ہے ۔ وہ دل سے چاہتے تھا کہ پاکستان کے قیام کی تاریخ ۲۷ رمضان المبارک کر دیں ' مگر وہ ۱۴ اگست کو گیارہ سال تک بدل دینے میں ناکام رہے ۔ میرے نہایت محترم ضیاء الحق صاحب پوری قطعیت کے ساتھ اسلامیت کے فروغ و عروج کے خواہاں تھے ۔ میں ان کی نیت کی بھی گواہی دینے کو تیار ہوں ' مگر اس اعلاترین مقصد کے لیے ان کو جو راستے اختیار کرنے چاہییے تھے وہ اختیار نہیں کیے جا سکے اور میں تو ڈنکے کی چوٹ یہ کہوں گا کہ پاکستان میں شریعت اور اسلامیت کے نفاذ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بیوروکریسی رہی ہے جسے صدر شہید نے قابو میں کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ ہم علی الاعلان یہ تو کہتے ہیں کہ پاکستان میں نفاذ شریعت اسلامی اس لیے نہ ہو سکا کہ یہاں ایک اسلام نہیں ہے بلکہ یہاں علما و زعما نے اپنے اپنے اسلام

بنا رکھے ہیں ۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے ؟ مگر پاکستان میں نفاذ شریعت اسلامی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا ہے ' بلکہ اسے معرض تحقیق میں لایا ہی نہیں گیا ہے ۔ میری رائے میں یہ بیوروکریسی ہے ! وہ تو یہ کہیے کہ بیوروکریسی میں اچھے مزاج کے لوگ بھی ہیں اور ان کا کردار قابل تعریف ہے اور لائق رشک ۔ اگر یہ اقلیت موثر نہ ہوتی تو بیوروکریسی کی اکثریت نہ جانے پاکستان میں کیا حالات پیدا کر دیتی ۔

ہمدرد یونی ورسٹی چارٹر اس کی ایک مثال ہے ۔ سب جانتے ہیں کہ ہمدرد یونی ورسٹی کا مزاج اسلام ہی ہو سکتا ہے ۔ میری اور ہمدرد کی یہی شہرت ہے ۔ ہماری یہی پہچان ہے ۔ دغدغہ یہ ہے کہ اگر پاکستان میں ایک واقعی اسلامی یونی ورسٹی بن گئی اور وہاں سے انسان مومن بر آمد ہونے لگے تو اس سے پاکستان کو طاقت اور توانائی حاصل ہوگی ۔ یہ ہے وہ گناہ کبیرہ جس کی وجہ سے گزشتہ آٹھ سال سے پاکستان کی بیوروکریسی ہمدرد یونی ورسٹی چارٹر دینے کو تیار نہیں ہے ۔ شہید ضیاء الحق نے ہمدرد یونی ورسٹی چارٹر پر دو بار اپنے دستخط ثبت کیے ۔ مگر دونوں بار اس بیوروکریسی نے چارٹر کو غتربود کر دیا اور تادم تحریر یہ چارٹر نصیب نہیں ہوا ہے ۔ بیوروکریسی کو پاکستان میں یہ طاقت حاصل ہے کہ صدر پاکستان بھی اس کے آگے بے بس رہا ہے !

بڑی طاقتیں ہیں جو پاکستان کے لوگوں کی قیمتیں لگانا جانتی ہیں ۔ وہ دھڑلے سے قیمتیں لگاتی ہیں اور ذہن پاکستان خرید کر اپنے مفادات پورے کرتی ہیں ۔ کل بھی یہی ہوتا رہا ہے آج بھی یہی ہو رہا ہے ۔ رہنما اور بیوروکریٹ دونوں فروخت ہو رہے ہیں۔ ایک اقتدار ' طاقت اور دولت کے لیے بک رہا ہے اور دوسرا دولت کے لیے خود کو ارزاں کر رہا ہے ۔ اس صورت حال نے ایک طرف پاکستان میں زوال اخلاق اور اضمحلال کردار پیدا کر دیا ہے تو دوسری طرف پاکستان کی معاشیات و اقتصادیات کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا ہے اور معاشرت و معیشت کو آگ لگا دی ہے ۔

ازبکستان ہوٹل میں ' جہاں میں مقیم ہوں ' ایک نہیں دو نہیں تین ایسے ہال ہیں کہ جہاں شام سے آدھی رات ہونے تک شور و غل جاری رہتا ہے ۔ شراب و کباب

کا دور دورہ ہوتا ہے ۔ رقص و سرود کی محفلیں روز جما کرتی ہیں ۔ اس مشرق میں حال یہ ہے کہ یہ مغرب کے کان کاٹتے ہیں ۔ جس ہال میں ہم کھانا کھاتے ہیں وہاں بیٹھ کر دو آدمی آپس میں بات نہیں کر سکتے اور ساز و آہنگ پر گانوں کا شور مستزاد ہے۔ یہ وہ شور ہے جس کے لیے طب و سائنس کا قول فیصل ہے کہ اس سے اعصاب کا سکون تباہ ہو جاتا ہے اور انسان کے فیصلے غلط ہونے لگتے ہیں ۔ میں نے موسکو میں بھی ہوٹلوں میں رہ کر حالات کا مطالعہ کیا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ موسکو کے کسی بھی ہوٹل میں اس انداز و قسم کا شور و غل نہیں ہوتا ۔ وہاں توازن ہے اور اعتدال ہے ۔ وہ مغربی ہیں ' ازبکستان مشرقی ہے ۔ ایک ہی ملک کے مغرب و مشرق میں یہ دو انداز ہائے بود و باش قابل غور ہیں ! اور لائق تحقیق ۔ کیا یہ آزادی عطا کردہ مغرب و استعمار ہے ؟

شادی : ازبیک نغمے

ایک ہال میں آج ایک شادی جشن تھا ۔ زبردست شور تھا ۔ گانوں کا زور تھا ۔ میں نے جناب مرزا یوف صاحب سے پوچھا کہ اس شادی میں گانے کس قسم کے ہیں ۔ کیا یہ ازبیک نغمے ہیں ؟ انھوں نے بتایا کہ ہاں یہ خاص انداز کے نغمے ہیں ۔ ان کی تاریخی حیثیت بھی ہے ۔

ازبیک نغمہ اس قوم کے مزاج ' جوش و ولولہ اور جذبہ و روح کا ترجمان ہے ۔

مشہور ازبیک ادیب اور شاعر نبیک نے عوامی نغمات کی یوں تعریف کی تھی :

طوئی (شادی) کی تقریبات میں اور عام تفریحات اور تہواروں نیز ایک رہائشی جگہ سے دوسری رہائشی جگہ میں منتقلی کے دوران قوبیز اور دومبرا کی سنگت میں عوامی مغنیوں' بخشیوں کی آوازیں فضا میں گونجتی تھیں ۔ داستان گو بخشی اپنے سیدھے سادے اور حقیقت پر مبنی نغموں میں عوام کی پر مشقت محنت اور زندگی نیز سورماؤں کے جانبازانہ کارناموں کے گن گاتے تھے ۔

ماضی میں ازبیک عوام کی دشوار زندگی نغموں کے مضمون و مفہوم کی رہنمائی کرتی

تھی ۔ ازبیک نغمات کی بہت سی اقسام مشہور ہیں جن میں رہن سہن اور محنت سے متعلق نغمے ، رسوماتی اور عشقیہ نغمے ، مزاحیہ اور رزمیہ نغمے نیز اجتماعی احتجاجی نغمے شامل ہیں ۔ ان میں رسم و رواج اور محنت کے متعلق نغمات سب سے پرانے ہیں ۔ رسوماتی نغمات مقابلتہ کچھ کم ہیں ۔ ان میں سے دو یعنی " طوئلار مبارک " (شادی مبارک ہو) اور " یار یار " (دلہن کی آمد کے موقع پر گایا جاتا ہے) ازبیکستان بھر میں ہمیشہ سے مشہور رہے اور آج بھی ہیں ۔

ازبیک قومی گیتوں میں عشقیہ نغمات کو ممتاز درجہ حاصل ہے جن میں " لپر " (عاشق و معشوقہ کا مکالمہ) اور " یلہ " (مغنی کے نغمے کے دوران رقاصہ ناچتی ہے) بھی شامل ہیں ۔ عوامی گیتوں میں " کاتا آشولہ " (طویل نغمہ) خاص طور پر مقبول عام ہے جو باری باری دو گلوکار گاتے ہیں ۔ گانے کے دوران وہ اپنے ہاتھوں میں چھوٹی رکابی یا تھال لیے اور اس سے بھونپو کی مانند استفادہ کرتے اور اس کے سہارے ہوا کی سمت پر قابو پاتے ہیں ۔

عوامی نغمات کے ساتھ ہی ساتھ پیشہ ورانہ فن موسیقی نے بھی ترقی کی جو ساز و آواز کا ایک طویل سلسلہ ہے ۔ یہ نغمہ و سرود عام طور پر پیشہ ورانہ فنکاروں کی طرف سے گایا بجایا جاتا ہے ۔ ازبیکستان میں " مقام " کے تین سلسلے ہیں : بخارا ، خوارزم اور فرغانہ و تاشقند طرز کے سلسلے ۔

صدی در صدی ، سال بہ سال گزر جاتے ہیں ، لیکن عوامی گیت کی دل ربائی اور قوت کشش ماند نہیں پڑتی ، اس کی دھنوں اور طرز ادا کو بھی زوال نہیں ہے ، بالکل اسی طرح ازبیک قومی گیت اور موسیقی کا شجرابدی بھی نہیں مرجھا سکتا اور ہمارے معاصرین کو فیض یاب کرنے والی موجودہ ازبیک موسیقی اسی شجرابدی کی مرہون منت ہے ۔

تاشقند کا ہوائی میدان

موسکو سے تاشقند آنے پر میرے اور سعدیہ کے ساتھ خصوصی سلوک ہوا ۔ ہمیں

آسانیاں فراواں میسر ہوئیں ۔ اور اب کہ ہم بارہ گھنٹے کے لیے تاشقند سے بخارا جا رہے ہیں ، صبح ساڑھے سات بجے ہوائی میدان پر ہر سہولت میسر ہے ۔ دوستی کی انجمن نے اہمیت کے ساتھ تمام انتظامات کیے ہیں ۔ ہوائی جہاز میں سوار ہوئے ۔ دیکھا تو یہ جہاز " فوکر " نکلا ۔ میرے پاکستان میں اس کا پورا نام " فوکر فرینڈ شپ " ہے ۔ میں آج تک فرینڈ شپ کے معنی نہیں سمجھ سکا ہوں ۔ ایسا تو نہیں ہے کہ پاکستان کو عطیہ کے طور پر اور فرینڈ شپ میں یہ جہاز ملے ہوں ! جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ آج سے اٹھائیس تیس سال پہلے پاکستان نے یہ جہاز پرانے خریدے تھے ۔ یہ خریداری مظاہرۂ فرینڈ شپ ہی تو تھا ! ہم ہی ایسے بدقسمت لوگ ہیں کہ ہم دوسروں کا کوڑا اٹھا کر پاکستان لے آتے ہیں ۔ خود بھی بے وقوف بنتے ہیں اور بنائے بھی جاتے ہیں ۔ مگر ہم اس کی قیمت بھی وصول کرتے ہیں اور یہ کمیشن ممالک غیر میں جمع ہو جاتا ہے ۔ فوکر کے ساتھ متعدد قسم کی " فرینڈ شپس " وابستہ ہیں ۔ ہم دوستی کو دوام بھی دینے کے رسیا ہیں ۔ گزشتہ ستائیس اٹھائیس سال سے ہم دوستی کا حق ادا کر رہے ہیں ۔ ہمارے یہ جہاز فرسودہ ہو چکے ہیں ، روز ان کے ساتھ حوادث پیش آیا کرتے ہیں ، مگر ہم یہ فیصلہ اب تک نہیں کر سکے ہیں کہ اس دوستی کے جہازوں سے ان میں سفر کرنے والوں کی جاں بخشی کریں ۔

روس کا فوکر جہاز ۱۵۶ نشستوں کا ہے ۔ بہت مضبوط ہے ۔ ہم نے دیکھا کہ اس کے پائلٹ اور کوپائلٹ بھی اسی قدر مضبوط ہیں ۔ وہ مسافروں کے بیٹھنے کے بعد بڑی شان سے جہاز کے اندر آتے ہیں اور مسافروں کے اترنے سے پہلے نہایت کر و فر اور وقار کے ساتھ پہلے اتر جاتے ہیں ۔ آج بڑی کہر ہے ۔ تاشقند سے بخارا تک گہرے ابر چھائے رہے اور فوکر جہاز بادلوں کے اوپر پرواز کرتا رہا یہاں تک کہ بخارا کا ہوائی میدان آگیا ۔ یہاں بڑی زبردست کہر ہے ۔ جہاز نے اترنے کے لیے اپنے پنجے باہر پھیلائے مگر نیچے آکر پھر اپنے پہیے اندر کر لیے اور بلندیوں پر پرواز کر لی ۔ پائلٹ بڑی مشکل میں تھا ۔ جہاز اتارنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا ۔۔ اس کی مشکل کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا ۔ وہ بار بار رن وے کے سامنے آکر نیچے اترنے کی کوششوں میں ناکام

رہا۔ مگر پائلٹ نے ہمت نہ ہاری اور ایک بار وہ موقع پاکر اور کہر کو پھاڑ کر جہاز کو اتار لینے میں کامیاب ہوگیا! جہاز نے جب زمین پر قدم رکھے تو کانوں کان خبر نہ ہوئی ۔ میں نے بے اختیار تالیاں بجائیں ۔ مگر میری تائید کسی نے بھی نہیں کی ۔ حتیٰ کہ پچیس چھبیس امریکی جو ہمارے آگے کی اولین پانچ قطاروں میں بیٹھے تھے انھوں نے بھی پائلٹ کی محنت کی داد نہ دی ۔

بخارا کے ہوائی میدان پر

انجمن دوستی ' روس کے جناب خمانت عظمت صاحب اور محترمہ رعنا دونوں ہوائی جہاز کے باہر پاکستان کے حکیم محمد سعید اور ان کی بیٹی سعدیہ کے استقبال کے لیے موجود تھے ۔ میں جب نیچے اترا تو میرے دونوں ہاتھوں میں بڑے دبیز و ضخیم ہینڈ بیگ تھے ۔ یہ میں نے جہاز سے اترتے ہی ایک ضخیم و دبیز خاتون کے حوالے کر دیے جو ان بیگوں کے وزن سے اپنا توازن کھو کر جہاز میں لڑھک گئی تھیں ۔ پھر میں اپنے میزبانوں سے ملا ۔ دونوں ہنس کھ! ان سے مل کر دل خوش ہوگیا ۔ بخارا کے ہوائی میدان پر سخت سردی ہے ۔ بتایا گیا کہ دو سنٹی گریڈ ہے ۔ ہاتھوں کا خون جم گیا ۔ سعدیہ تو جیسے ڈیپ فریزر کے حوالے ہو گئیں! مگر ہم جلد ہی موٹروں کے پاس آگئے اور ان میں سوار ہو کر "انٹور" ہوٹل میں آگئے ۔ انٹور (Intour) روس کی ایک ٹورسٹ تنظیم ہے جس نے پورے ملک میں اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں ۔ جس شہر جائیے انٹور موجود ہے ۔ یہ تنظیم چھوٹے بڑے سب قسم کے ٹورز کا اہتمام کرتی ہے ۔ روس کی انجمن دوستی بھی اپنے انتظامات انٹور کے ذریعہ سے کراتی ہے ۔ ہمارے ساتھ بیس بائیس امریکیوں کا ایک سیاح گروپ ہے ۔ اس کے تمام انتظامات "انٹور" نے کیے ہیں ۔ ان کے پاس ہر زبان کے مترجمین بھی ہیں جو گائڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں ۔ اس تنظیم کے اپنے ہوٹل ہر شہر میں موجود ہیں ۔

انٹور ہوٹل میں ہمارے ناشتے کا اہتمام تھا ۔ ہمارے میزبانوں نے کہا کہ انھوں نے ہمارے لیے کمرے محفوظ کیے ہوئے ہیں ' مگر میں نے ان سے کہہ دیا کہ ہم تمام دن ہی

مقامات تاریخی کا دورہ کریں گے اس لیے کمروں کی ہمیں قطعی ضرورت نہیں ہے ۔ اچھا ناشتہ تھا ۔ میں نے بھی واجبی سا ناشتہ کر لیا ۔ ایسا کہ لنچ کے وقت تک ہضم ہو جائے اور میں لنچ اس حساب سے کروں کہ رات کے ڈنر کی ضرورت نہ رہے ۔

بخارا ۔ تاریخ

ازبکستان سوویت سوشلسٹ ریپبلک کا ایک افسانوی طور پر مشہور شہر بخارا ہے جسے امام بخاری کے وطن ہونے کا اعزاز اور سعادت حاصل ہے ۔ یہ شہر زر افشاں دریا کی وادی میں شاخ رود نہر پر ایک آباد نخلستان میں واقع ہے ۔ پرانے بخارا اور نئے بخارا کاگان کے درمیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے ۔

بخارا کب آباد ہوا؟ صحیح طور پر معلوم نہیں ۔ ۵ ویں صدی عیسوی کی چینی تاریخ میں اس کا ذکر موجود ہے ۔ یہ شاہراہ ریشم کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا ۔ ساتویں صدی عیسوی میں یہاں مسلمان آگئے تھے ۔ دسویں صدی میں یہ سامانی بادشاہوں کا دارالحکومت تھا اور علمی مرکز کے طور پر مشہور تھا ۔ ۱۲۲۰ء میں چنگیز خان نے اسے بیدردی سے برباد کر دیا تھا ۔ ۱۶ ویں صدی میں شیبانی خاندان کی حکومت قائم ہوئی ۔ ۱۸۶۸ء میں اس پر روس کا قبضہ ہوا ۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد کچھ عرصے تک یہاں کا امیر حکمران رہا پھر یہ ازبکستان کے سوویت روس کے انتظام میں آگیا ۔

بخارا پہلے ہی سے روئی ' ریشم اور پھلوں کے لیے مشہور تھا ۔ عشرۂ ۱۹۵۰ء میں قریبی صحرا میں گیس دریافت ہوئی ۔ چنانچہ بخارا میں اس گیس کا فیلڈ اسٹیشن بنایا گیا ۔ بخارا سے ۷۰ میل شمال مغرب میں مقام غزلی سے یہ گیس پائپ لائن کے ذریعہ سے یورال لے جائی گئی اور دوسرے مقام اوچ کیر سے موسکو لے جائی گئی ۔ دو اور گیس فیلڈ زرکاک اور مبارک ہیں جن کی گیس سمرقند اور تاشقند لے جائی گئی ہے ۔

بخارا کی ایک مشہور پیداوار قراقلی کھالیں ہیں ۔ قراقلی بھیڑوں کی ایک خاص نسل ہے ۔ بخارا میں ریشم کے کپڑے اور سونے کے زیور بنائے جاتے ہیں ۔ بخارا کی قالینیں دنیا بھر میں مشہور ہیں ۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ قالین سازی کا بخارا میں

کوئی وجود نہیں ہے! بخارا کا پرانا شہر تنگ گلیوں اور قدیم عمارتوں کی وجہ سے ماضی کی ایک اہم یادگار ہے ۔ نئے شہر میں سرکاری دفاتر ' کالج ' تھیٹر وغیرہ ہیں ۔ بخارا کی سب سے پرانی عمارت اسمٰعیل سامانی کا مقبرہ ہے جو دسویں صدی عیسوی کا ہے ۔ یہاں پر ۱۵۰ فیٹ بلند کلیان مینار ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں خطرناک مجرموں کو اس مینار سے نیچے گرا دیا جاتا تھا ۔ ۱۴۱۸ء کا مدرسہ الغ بیگ وسط ایشیا کی سب سے پرانی درس گاہ ہے ۔ ۱۵۰۹ء کا کوکلباش مدرسہ رقبے کے لحاظ سے وسط ایشیا کا بڑا مدرسہ ہے۔ علاوہ ازیں کلیان مسجد اور میر عرب مدرسہ بھی مشہور ہیں ۔ شہر میں گنبد والا بازار بھی ۱۶ ویں صدی کا ہے ۔ بخارا کے قریب ۵۵،۳۰۰ مربع میل کے رقبے پر ایک اوبلاسٹ ریجن واقع ہے جہاں روئی کی کاشت کی جاتی ہے اور قراقلی بھیڑیں پالی جاتی ہیں ۔ اسی اوبلاسٹ سے گیس بھی نکالی گئی ہے ۔ اوبلاسٹ کی آبادی تقریباً ۸ لاکھ اور بخارا کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے ۔ ادبی اور اسلامی ثقافت کے لحاظ سے بخارا کو ازبکستان کے دوسرے شہروں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔

شیخ الرئیس ابو علی ابن سینا

شہر بخارا سے باہر کوئی ستائیس اٹھائیس کلومیٹر دور ایک گاؤں " افشانہ " ہے ۔ ہم نے اس گاؤں کا رخ کیا اور بڑی بے قراری تھی کہ جلد افشانہ پہنچ جائیں ۔ ہاں ' مجھے یہ معلوم تھا کہ افشانہ وہ خوش قسمت مقام ہے کہ جہاں شہنشاہ طب اور مجدد طب جناب محترم ابو علی ابن سینا پیدا ہوئے تھے ۔ بخارا کے بطن خاکی سے ایسے انسانوں نے جنم لیا کہ جن کی شہرت عالمی دوام حاصل کر چکی ہے ۔ ان میں ایک ابن سینا بھی ہیں ۱۹۸۰ء میں ابن سینا کو ایک ہزار سال ہوئے ۔ ان کا جشن ۱۹۸۰ء میں افشانہ میں منایا گیا۔ اس جشن عالی میں شرکت کے لیے دعوت نامہ مجھ عاجز کے نام بھی جاری ہوا تھا مگر ان دنوں میں پاکستان کی وزارت خارجہ کے ایک ایسے سکریٹری صاحب تھے کہ جن کی ہر ریاضت کا منتہا روس سے " مناظرہ " رہا ۔ انھوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر ' بلکہ مجھے بتائے بغیر ' خود یہ فیصلہ کر دیا کہ " جناب وزیر ان دنوں مصروفیت کی بنا

پر روس کا سفر نہیں کر سکیں گے ۔ "اور اس فیصلے سے سفیر روس کو مطلع کر دیا ۔ دعوت نامے کی اطلاع مجھے سفیر روس سے اس وقت ملی کہ جب پاکستان کے سکریٹری خارجہ وزیر سے استمزاج کے بغیر معذرت کر چکے تھے ۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ پاکستان کا بیوروکریٹ کس درجہ غالب و قادر ہے اور وہ اپنے سامنے وزیر کو ایک کٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہیں دینا چاہتا ۔ پاکستان کا ہر بیوروکریٹ ہر وزیر کو کٹھ پتلی بنائے رکھتا ہے اور وہ کھیل کھیلتا ہے کہ حد اور بس! مجھے یاد ہے کہ میں نے پاکستان کے سکریٹری خارجہ کے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا تھا ۔ میں نے کہا تھا کہ جب یہ سکریٹری خارجہ کابل میں بہ حیثیت سفیر پاکستان ریاض کر رہے تھے اس وقت ان کی ریاضی کو کیا ہو گیا تھا کہ تاجیکستان میں دوشنبہ سے کابل تک پکی چوڑی سڑک تیار ہو گئی اور ان کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور اب یہ نحیف و نزار پاکستان میں بیٹھ کر روس سے مقاطعہ کی پالیسی اختیار کر رہے ہیں ۔ ان کی عقل و دانش کو آخر کیا یہ گھن لگا ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کے تند و تلخ مزاج کو دیکھنے اور سمجھنے کے اہل نہیں رہے ہیں ۔ میں نے عالی مرتبت صدر گرامی قدر شہید کے سامنے برملا کہا تھا کہ پاکستان کے حق میں نہیں ہے کہ روس سے مقاطعہ کی پالیسی اختیار کی جائے ۔ ہمیں روس سے دوستی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور اس کی دوستی کو استحکام دینا چاہیے اور پاکستان میں ایسے صاحبان علم کو جنم دینا چاہیے کہ جو روس اور اہل روس سے علمی سطح پر کلام کر سکیں ۔

افشانہ مولد ابن سینا

افشانہ گاؤں آیا تو بتایا گیا کہ یہ نواح میں جس قدر اجتماعی زرعی زمین ہے اس کا نام ابن سینا زرعی زمین (ابن سینا کلیکٹیو فارم) ہے ۔ یہاں بھی روئی کو اہمیت حاصل ہے ۔ سارا فارم روئی کا ہے ۔ ازبکستان پورے کا پورا روئی کا علاقہ ہے ۔ پورے روس کی ۶۰ فیصد ضرورت ازبکستان سے پوری ہوتی ہے ۔ ایک اندازے کے مطابق پچاس لاکھ ٹن روئی سالانہ کی پیداوار ہے ۔

ایک زمانہ تھا کہ افشانہ بڑی جگہ تھی، مگر یہاں سرخ صحرا اور سیاہ صحرا ہیں اور دونوں خاصے تباہ کن ہیں۔ ایک وقت آیا کہ یہاں پانی کی شدید قلت بلکہ قحط پڑا اور گاؤں کے گاؤں خالی ہوگئے۔ بارے افشانہ پھر آباد ہوا۔ تمام حوادث کے باوجود ابن سینا کے اس مولد کو کسی نے فراموش نہیں کیا۔

روس کی حکومت ازبکستان کے جذبات سے آگاہ ہے۔ خود ازبکستان کے لوگ ہوں یا تاجیکستان کے، آذربایجان کے ہوں یا کسی اور ریاست کے اپنی تاریخ سے آگاہ ہیں اور اپنی تاریخ سے ان کو محبت ہے۔ اپنے اکابر رجال کا انھیں احترام ہے۔ ان کی محبت کی گرمی اور ان کے احترام کی شدت کو نہ صرف مقامی حکومتیں بہ نگاہ احترام دیکھتی ہیں بلکہ ان کی سیاسی مصلحتیں بھی یہ ہیں کہ ان مسلم علاقوں کی تاریخ کو مسخ نہ کیا جائے بلکہ اس کو زندہ کیا جائے۔

یہی وہ تاریخ سے محبت ہے اور یہی وہ احترام اکابر ہے کہ ازبکستان کے اہل علم وفن نے یہ فیصلہ کیا کہ مولد ابن سینا میں ابن سینا کا ایک مجسمہ نصب کیا جائے اور اس سے ملحق ایک میوزیم بنایا جائے جہاں ابن سینا سے متعلق جملہ معلومات جمع کر دی جائیں۔

اس منصوبے پر نہایت احترام و اہتمام کے ساتھ عمل کیا گیا۔ ہم ابن سینا زراعتی فارم سے آگے بڑھے تو ایک تیس بتیس فیٹ بلند مجسمہ ابن سینا نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میں سب سے پہلے آگے بڑھا اور میں نے اپنا سر احترام شخصیت ابن سینا کے سامنے جھکا دیا۔

ہائے افسوس عین یہاں آکر میرا کیمرا خراب ہوگیا۔ نہ جانے اس میں اچانک کیا خرابی پیدا ہوئی ہے۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ اب اس جائے عظمت کی کوئی تصویر نہیں بن سکے گی۔

میں نے اپنا خاصا وقت میوزیم دیکھنے میں صرف کیا۔ اس میوزیم میں ابن سینا کے زمانے کے ماہرین مثلاً البیرونی وغیرہ کی تصاویر بھی لگائی گئی ہیں۔ ابن سینا کے آلات سرجری کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ ہے۔ اس کی کتابوں کے صفحات کی فوٹو کاپیاں ہیں۔ گو

اس میوزیم کے قیام کے لیے جذبات عالیہ کارفرما ہیں، مگر اس کے لیے زیادہ تحقیق اور توجہ کی ضرورت تھی۔ بہ حیثیت مجموعی یہ خوب چیز ہے۔ توقع ہے کہ اس میں اضافات ہوتے رہیں گے۔ اور ممکن ہے کہ کبھی ایسا وقت آئے کہ یہاں تحقیقات طب کا ایک مرکز بن جائے۔

اس میوزیم کو دیکھ کر میری فکر کو آج مہمیز لگی ہے۔ میں نے میوزیم کے بارے میں زیادہ غور کیا ہے مثلاً ابن سینا کا رسالہ "ادویہ قلبیہ" ہے۔ برادر محترم جناب حکیم عبدالحمید نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ ابن سینا نے اس میں حیرت انگیز باتیں لکھی ہیں۔ ایک اس رسالے پر میوزیم کا ایک شعبۂ قلب وجود حاصل کر سکتا ہے۔

حال دل

آج تمام دن اجاڑ بخارا میں پھرتا رہا۔ دل کی بڑی عجیب کیفیت ہے۔ دو ہزار پانچ سو سال اس شہر کی تاریخ ہے۔ عجیب انقلابات اس شہر نے دیکھے ہیں۔ اس شہر کا دور اسلامی اپنی نہایت دل چسپ تاریخ کا حامل ہے۔ علم و عرفان سے عبارت بخارا نے وہ دور مسلم بھی دیکھا کہ اہل اسلام نے اپنی روایات کو ترک کر دیا اور عیش و عشرت ان کے ہاں آگیا۔ علم و حکمت کے مراکز خاموش اور سرد ہوگئے۔ تعمیر سے غفلت ہوئی۔ آزادی کی برکات کا تصور محو ہوا۔ ظلم و تشدد کے حالات پیدا ہوئے۔ خود بخارا کے مسلمان امیر کے خلاف صف آرا ہوئے۔ صدر الدین عینی اس بغاوت کے رہنما ہوئے جس سے امیر بخارا کو بخارا سے فرار ہو کر کابل جانا پڑا۔ اس بغاوت کے نتیجے میں بخارا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ وہ مدرسہ بھی تباہ ہو گیا جہاں خود صدر الدین عینی نے دو سال تعلیم پائی تھی۔ اب یہ مدرسہ ویران ہے۔ اس ویرانی کو دیکھنے کے لیے صدر الدین عینی موجود نہیں ہیں، مگر ان کی اولاد تاجیکستان میں موجود ہے۔

مسلم حکومتوں کے زوال کا سبب ہمیشہ ان کے باہمی نزاعات ہوئے ہیں۔ شریعت اسلامی سے ان کا فرار، اللہ تعالیٰ سے بغاوت، رسولؐ سے عدم محبت، قوانین اسلام سے سرکشی جب بھی آئی ہے زوال آیا ہے۔ زوال بخارا بے سبب نہ تھا۔ روس جابر

اگر تھا مگر پھر بھی دور تھا۔ جب حالات بخارا خراب ہوئے تو راہ انقلاب ملی اور اس انقلاب کا عنوان روس بن گیا اور اب بخارا روس کے زیر نگیں ہے۔

انٹور ہوٹل

تمام دن جسم و روح کو زخمی کرکے شام انٹور ہوٹل آئے۔ یہاں ڈنر تیار تھا۔ میں نے ڈنر سے ہاتھ کھینچ لیا کہ دن کو میں نے حسب ضرورت نوش جان کر لیا تھا۔ ڈنر پر بخارا پلاؤ آیا تھا۔ اس نام سے کئی یادیں وابستہ ہیں۔ ایک یاد اپنی جوانی کی ہے جب دہلی میں بخارا کے طالب علم بخاری پلاؤ تیار کرتے تھے۔

استاذی محترم حضرت مولانا قاضی سجاد حسین صاحب کے یہ تمام شاگرد تھے۔ سال میں دو تین بار ہمدرد منزل میں بخاری پلاؤ کی دعوت ہو جاتی تھی۔ اب نہ وہ ماحول رہا نہ وہ حالات رہے۔ بخارا کی مناسبت سے ہر چیز ختم ہوئی بس اب بخاری پلاؤ ہی نام رہ گیا ہے۔ بخارا کی عظیم ترین سلطنت کی یادگار بس بخاری پلاؤ رہ گیا ہے۔ آج اگر میں بخاری پلاؤ کھاتا تو کس دل سے!

ہوائی میدان پر

بخارا سے رات ساڑھے آٹھ بجے جہاز روانہ ہوتا ہے۔ سردی سخت ہے۔ ہوائی میدان سردی میں ڈوبا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کو بھی سردی لگ گئی ہے۔ کوئی خرابی آئی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر کا امکان ہے۔ خاصی پریشانی ہوئی اس لیے کہ کل صبح ساڑھے چھ بجے ہوائی جہاز تاشقند سے باکو (آذر بائیجان) روانہ ہوگا۔ ہوٹل سے ۵ بجے نکلنا ہوگا۔ تاخیر اور پھر سخت سردی۔ خیر کوئی چارہ نہ تھا۔ بارے رات ساڑھے نو بجے جہاز روانہ ہوا۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے شب ہوٹل تاشقند واپس آگئے۔

نماز عشا ادا کرکے بستر پر دراز ہوا تو سخت سردی کے باوجود میرے جذبات میں گرمی چھپکی ہوئی تھی۔ اعصاب مرتعش تھے۔ نیند کوسوں دور تھی کہ آج دن بھر میں جو کچھ

دیکھا تھا وہ ایک اجڑی ہوئی تاریخ تھی۔ میں بخارا و سمرقند کی اجڑی تاریخ میں خود کو لے گیا۔ میرے دل نے کہا کہ

سمرقند و بخارا کی یہ عظمت مٹ نہیں سکتی

سوویت روس میں مسلمان آبادی

سوویت روس کی ۲۸۰ ملین آبادی میں سے ۵۳ ملین مسلمان ہیں۔ یہ سب کے سب منگولیا کے ان بہادر قبائل کی اولاد ہیں جنھوں نے عہد وسطیٰ میں وسط ایشیا میں ایک شان دار سلطنت قائم کی تھی۔ روسی ترکستان کے مسلمان اپنے قبائل کے لحاظ سے آذری، بلکری، اشکھری، کاراچ، کارا کلپک، کازک، کرغیزی، کومیک، تاتاری، ترکمان، ازبیک اور تاجک ہیں۔

۱۹ویں صدی میں یہ آزاد مسلمان سلطنت کسی طرح روس کے قبضے میں آگئی۔ پھر عشرہ ۱۹۲۰ء میں ان پر کیمونزم مسلط کر دیا گیا۔ ان کی ۲۶۰۰ مساجد میں ۲۲۰۰ مساجد ضبط کرکے بند کر دی گئیں۔ سوائے دو کے تمام مدارس بند کر دیے گئے۔ یہاں یہ بتانا برمحل ہوگا کہ روسی اقتدار سے پہلے روسی ترکستان میں ۲۶ ہزار مساجد تھیں۔ عشرہ ۱۹۲۰ء سے لے کر اب تک پولٹ بیورو کی سطح تک صرف تین مسلمان ترکوں کے نام ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے کیمونسٹ حکومت کی اتنی سختی کے باوجود سیکڑوں مخفی قرآنی مکتب اور خفیہ مساجد میں اپنے دین کو زندہ رکھا اور ہزاروں گشتی علمائے دین اس تمام جبر و استبداد کے باوجود اپنا فریضہ تبلیغ و ہدایت ادا کرتے رہے ہیں۔

ان لوگوں میں اتنی جرات ہے کہ وہ حکومت کے خلاف احتجاج بھی کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب کازخستان کا صدر ایک ماسکو روس کے شخص کو لگایا گیا تو انھوں نے زبردست احتجاج کیا ور اس وقت سے لے کر اب تک وہ کئی باتوں پر ایک سو احتجاجات کر چکے ہیں۔

روس نے اس علاقے کی پانچ مسلمان ریاستوں کو زرعی پیداوار کے لیے مختص کر رکھا ہے۔ ازبکستان کپاس اور کازخستان گندم پیدا کرتا تھا، لیکن اس کے باوجود

اس علاقے کی وہ ترقی نہیں ہوئی جو یورپی روس کی ہوئی ہے۔

سلام سمرقند و بخارا کو، سلام پانچ جمہوریتوں پر مشتمل پورے روسی ترکستان کو جنھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنی اسلامی ثقافت اور شناخت کو زندہ رکھا ہے اور اب جب کہ بندشوں کے رسن ٹوٹے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ ۵۰ برس میں ان کی ثقافت کی ایک کڑی بھی نہیں ٹوٹی۔

روس تسلیم کرے یا نہیں، عالمی برادری مانے یا نہ مانے، سمرقند و بخارا کی عظمت مٹ نہیں سکتی۔ یہ زندہ و تابندہ قوم ایک عظیم قوم بن کر ابھرے گی۔

شاہراہ ریشم

روسی ترکستان شاہراہ ریشم کا حصہ ہے۔ جس زمانے میں مشرق و مغرب کی معیشت میں شاہراہ ریشم کو اہمیت حاصل تھی، اس زمانے میں یہ تمام علاقہ نہایت آباد تھا اور تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ تو مغربی مورخین کی ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے ہر بات کا سہرا یورپ کے سر باندھنے کے لیے پوری دنیا کی تاریخ کو مسخ کر ڈالا ہے اور عالمی تہذیب میں روسی ترکستان کے کردار کو اجاگر نہیں کیا۔

تاریخ کے آئینے میں

تاریخ کے آئینے میں دیکھیے تو ۷ویں صدی قبل مسیح میں بھی اس علاقے میں جس کے باشندوں کو خانہ بدوش کہا جاتا رہا ہے، قلعہ بند شہر اور زرعی مراکز موجود تھے۔ مورخین نے یہی غلطی عربوں کے بارے میں بھی کی ہے۔ عرب جس میں ملکہ سبا کے زمانے میں بھی صنعا اور مکہ اور مدینہ اور دیگر مشہور شہر تھے، جہاں ایک ایسی تہذیب موجود تھی جس کے آثار حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جاتے ہیں وہ علاقہ ان مورخین کی نظر میں ہمیشہ خانہ بدوش ہی رہا ہے۔

سائرس کے زمانے میں اور اس کے بعد دارا نام کے تین بادشاہوں کے زمانے میں جو سلطنت ایران میں قائم ہوئی اس میں بھی روسی ترکستان اور آذربائیجان کے علاقے

شامل تھے۔ یہ سلطنت ۵۵۹ قبل مسیح میں قائم تھی۔ اس زمانے میں بھی یہ دنیا کا آباد ترین اور مہذب ترین علاقہ تھا۔

۳۳۰ اور ۳۲۷ قبل مسیح میں سکندر اعظم نے دارا کو شکست دے کر ایران اور پنجاب تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ سکندر اعظم کی افواج روسی ترکستان میں بھی گئیں اور اس وقت بھی سمرقند اور بخارا بڑے با رونق تجارتی مراکز تھے۔

سکندر اعظم کی موت کے بعد روسی ترکستان اور پنجاب جو مشرقی حصہ کہلاتا تھا سیلوکس کے زیر نگیں آیا۔ وہ مرکزی کنٹرول قائم نہ رکھ سکا اور کئی امارتیں قائم ہو گئیں۔

تیسری صدی قبل مسیح میں ایران کے کئی امرا نے یونانی حکمرانوں کے خلاف ایک کامیاب بغاوت کی۔

۱۲۴ قبل مسیح میں مثرادیت دوم نے بابل پر قبضہ کرلیا۔ اس زمانے میں اس نے روسی ترکستان کے راستے چین سے تجارتی تعلقات برقرار رکھے۔

اس کے بعد روسی ترکستان میں کشن قوم نے اقتدار پایا۔ بخارا، سمرقند اور مرو کے راستوں پر شہروں اور تجارتی کاروانوں کی حفاظت کشن کرتے رہے۔

تیسری صدی عیسوی میں ایران میں ساسانی حکومت قائم ہوئی۔ چوتھی صدی عیسوی میں انھوں نے کشن قوم کو شکست دے کر شاہراہ ریشم پر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔

چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں اس علاقے میں طوائف الملوکی پھیل گئی، لیکن تجارت کسی نہ کسی حد تک جاری رہی۔

ترکوں کا آغاز

چھٹی صدی عیسوی کا وسط ترکوں کے آغاز کا زمانہ بتایا جاتا ہے، لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ان کا آغاز پردہ راز میں ہے۔ ان کا "ہن" قوم سے تعلق ابھی تک مستند طور پر ثابت نہیں ہو سکا۔ خود ترک یہ کہتے ہیں کہ ایک قبائلی جنگ میں صرف ایک نوجوان باقی بچا تھا۔ بعد میں اس ایک نوجوان کے دس بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک

کا نام "آ۔ شن۔ نا" تھا۔ اسی کی اولاد کو ترک کہا جاتا ہے۔ لفظ ترک کے معنی ہیں مضبوط اور قوت والا۔ ترکوں کا پہلی بار ذکر چین کی تیسری صدی قبل مسیح کی ایک کتاب میں ملتا ہے، لیکن ایک طاقت ور قبیلے کے طور پر یہ چھٹی صدی میں ابھرے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل وطن موجودہ منگولیا کا کوہستان الطائی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے اصل وطن میں وہ جو آن جو آن قوم کے ماتحت کارکن تھے اور آہن گری کا کام کرتے تھے۔ بعد میں جب ترکوں نے ایک مضبوط قبیلے کی حیثیت اختیار کی تو ان کے ایک اجداد میں سے ایک شخص بومین نے اپنی آقا قوم جو آن جو آن کی شہزادی کا رشتہ مانگا۔ اس پر جنگ چھڑ گئی اور ترک کام یاب ہوئے۔

۵۵۲ عیسوی میں مغربی وے سے ابھر کر ترکوں نے جو آن جو آن سلطنت کو تاراج کر کے محکوم بنا لیا اور منگولیا کے میدانوں پر چھا گئے۔ اسی زمانے میں (یعنی نصف چھٹی صدی میں) انھوں نے روس میں وولگا کا علاقہ فتح کیا اور مشرق میں دریائے زرد تک ان کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ اس زمانے میں اتنا بڑا علاقہ کسی سلطنت کے پاس نہ تھا۔ ۵۶۵ عیسوی میں انھوں نے شاہراہ ریشم پر قبضہ کر لیا اور بخارا، سمرقند اور تاشقند ان کے زیر نگیں آئے۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں ان کی سلطنت مشرقی (چینی) اور مغربی سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی۔

اسلامی دور

ساتویں صدی عیسوی میں ایک عظیم اسلامی سلطنت کا عرب میں ظہور ہوا جس نے دو تین عشروں میں مصر سے لے کر شام، عراق اور ایران تک علاقہ فتح کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳۲ء میں ہوئی اور ایران کا آخری تاجدار ۱۹ برس بعد مرو میں مارا گیا۔

۶۵۴ء میں عرب افواج نے موجودہ ازبکستان کو فتح کر کے دریائے آمو کو عبور کر لیا تھا لیکن اس فتح کو استحکام اس وقت نصیب ہوا کہ جب قتیبہ ابن مسلم ۷۰۵ء میں خراسان کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے بخارا اور سمرقند کو فتح کیا۔ روسی ترکستان اموی

دور ہی میں پوری طرح مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔

۷۵۱ء میں چین نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ابھرتی ہوئی اسلامی قوت اس پر نہ چھا جائے مسلمانوں سے تاشقند کے قریب تلاس میں جنگ لڑی۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور یہ طے ہو گیا کہ شاہراہ ریشم کا یہ حصہ یعنی روسی ترکستان پر مسلمانوں کے اقتدار کا ستارا جگمگائے گا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں بحیرہ ارال کے جنوب میں اسلامی ثقافت کے ان مٹ نقوش کندہ ہو گئے۔

روسی ترکستان کے ترک قبائل نے تو ساتویں صدی ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن کئی قبیلے جو میدانوں میں گھومتے رہتے تھے ابھی تک ارواح پرست تھے۔ انھوں نے ۱۱ویں ۱۲ویں صدی میں اسلام قبول کیا مثلاً سلجوق، اور پھر یہی ترک ایشیائے کوچک پر یعنی موجودہ ترکی پر قابض ہوئے۔

روسی ترکوں کا ایک مشرقی گروپ چنگیز خان کی قیادت میں اوائل ۱۳ویں صدی میں آندھی اور طوفان کی طرح فتوحات کرتا ہوا سمرقند و بخارا پر قابض ہوا۔ اس کی سلطنت بحرالکاہل (چین) سے ڈینیوب اور سائبیریا سے بہا تک پھیلی ہوئی تھی۔ آج جن کو ہم آذری، کازخ، ازبک اور ترکمان کہتے ہیں، چنگیز کے بیٹوں اور پوتوں کے زمانے میں ان علاقوں میں آباد ہوئے جو اب ان کے ناموں سے مشہور ہیں البتہ تاتاری کریمیا میں آباد ہوئے تھے جنھیں اسٹالن نے جبراً کریمیا سے نکال کر موجودہ تاتاریہ میں زبردستی آباد کیا۔ انھوں نے جو ظلم و ستم دیکھے ہیں وہ شاید ہی کسی اور نے دیکھے ہوں۔

چودھویں صدی میں اس قوم کا ایک عظیم فاتح تیمور اٹھا اور اس نے دیوار چین سے یورال تک ایک عظیم سلطنت قائم کی جس کا صدر مقام سمرقند تھا۔ الغ بیگ تیمور کا پوتا تھا جس نے اپنے وقت میں ایک عظیم رصد گاہ بنوائی تھی۔ اس نے کئی کالج کھلوائے اور اعلا تعلیم کو ترکستان میں عام کیا۔ ہندستان کی شاندار مغل سلطنت بھی انھی کی اولاد کی قائم کردہ تھی۔

۱۵۰۰ء میں ازبکوں نے سمرقند پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ ۱۵۰۷ء میں ازبکوں

نے تیموریوں کو مار بھگایا۔ اس کے بعد تین سو برس تک اس علاقے میں مختلف امارتیں قائم رہیں۔

۱۸۰۰ء میں روس نے اس علاقے میں اپنے پاؤں جمانے شروع کیے اور ۱۹۰۰ء تک اس تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جس کا رقبہ اندازاً پاکستان کے رقبے کا پانچ گنا، فرانس کے رقبے کا سات گنا، متحدہ جرمنی کے رقبے کا دس گنا اور ہندستان کے رقبے سے تھوڑا سا زیادہ ہے۔

۱۹۱۷ء میں انقلاب روس ہوا لیکن یہ دس برس جوں کا توں رہا۔ ۱۹۲۷ء میں اس کو بھی جبرو استبداد سے کمیونسٹ بنا دیا گیا۔

روسی ترکستان کے علمی منظر کی ایک جھلک

بخارا ہی میں ابن سینا ۹۸۰ء میں پیدا ہوا تھا اس عظیم طبیب، سائنس داں اور فلسفی کی کتاب القانون دسویں صدی سے پندرھویں صدی تک یورپ میں طب کا نصاب رہی اور اس کے بعد بھی ۱۹ ویں صدی تک اس کا اثر قائم رہا۔

خیوہ میں البیرونی کی ۹۷۳ء میں پیدائش ہوئی۔ البیرونی طبیب، سائنس داں، جغرافیہ داں، ماہر فلکیات اور فلسفی تھا۔ اس نے اپنے دور میں صحیح طور پر عرض بلد طول بلد معلوم کیا اور گلیلو سے ۶۰۰ برس پہلے روشنی اور آواز کی رفتاریں معلوم کیں اور زمین کی محوری گردش کو موضوع بحث بنایا۔ یورپ کے سائنس داں آج جس معروضی ضرورت کا تقاضا کرتے ہیں اس کے بارے میں ۱۰۰۰ء میں البیرونی نے لکھا تھا، "ہمیں وہ تمام اسباب دور کرنے چاہئیں جو حقیقت تک پہنچنے میں انسان کو اندھا کر دیتے ہیں مثلاً رسم و رواج، تعصب، رقابت اور جذباتیت اور اقتدار کی خواہش تاکہ ہم تاریخی حقیقت کو معروضی طور پر صحت سے قلم بند کر سکیں"۔

۱۴ویں صدی میں الغ بیگ نے اس وقت ایک رصد گاہ بنائی جبکہ دوربین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایک کیلنڈر مرتب کیا اور زیچ ترتیب دی۔ ڈھائی سو برس بعد ۱۶۵۲ء میں جب اوکسفرڈ میں اس کے زیچ کا ترجمہ شائع ہوا تو مغرب اس کو داد

دیے بغیر نہ رہ سکا۔

روسی ترکستان کی جمہوریتوں اور عوام کے خاکے

آذربائیجان کوہ قاف کے جنوب مشرق کی طرف کیسپئن کے کنارے دنیا کا ایک قدیم ترین علاقہ ہے جس کا ذکر ۵۰۰۰ سال قبل کی تاریخ میں ملتا ہے اور اس وقت بھی اس علاقے کو دولت مند اور شاندار بیان کیا گیا۔ بعض مورخ زرتشت کا اصل وطن بھی اسی علاقے کو بتاتے ہیں۔ یہاں آذری ترک آباد ہیں جو غالباً سلجوقوں کے عہد میں یہاں آباد ہوئے۔ مذہباً یہ لوگ شیعہ ہیں۔ یہاں گندم، سبزیاں، کپاس، انگور اور دیگر پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ روس میں کپاس سب سے زیادہ ازبکستان اور اس کے بعد آذربائیجان میں پیدا ہوتی ہے۔ اس علاقے میں تیل نکلتا ہے۔ باکو اس کا مشہور شہر ہے۔ فارسی ادب میں لنکران کا نام آتا ہے، وہ آذربائیجان کی ایک وادی ہے۔

باکو روس کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ پہلے چار موسکو، لینن گراڈ، کیف اور تاشقند ہیں۔ آذربائیجان روس میں تیل پیدا کرنے والا دوسرا بڑا علاقہ ہے، پہلا تاتاریہ خود مختار جمہوریہ ہے۔ وہ بھی روایتی طور پر ایک مسلمان آبادی والا علاقہ ہے۔ باکو میں ۱۲ویں سے ۱۵ویں صدی کی کئی عمارتیں ہیں۔

ازبکستان

ازبک ایک امیر کا نام تھا۔ اس کے نام پر اس علاقے اور اس قوم کا نام رکھا گیا ہے۔ روس میں سب سے زیادہ کپاس یہاں پیدا ہوتی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں پانچ ملین میٹرک ٹن کپاس پیدا ہوئی۔ یہاں عموماً عورتیں کپاس چنتی ہیں اور نو گھنٹوں میں ۵۰ کیلو گرام کپاس چن لیتی ہیں۔ پہلے بچوں کو بھی اس کام پر لگایا جاتا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں ایک قانون کے ذریعہ سے بچوں کو ہر قسم کی محنت سے مستثنا کر دیا گیا ہے۔

اب ازبکستان میں اتنی بیداری آگئی ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو ۲۰ امریکی

سینٹ فی کیلو گرام کپاس ملتے ہیں ۔ حکومت اسے بیرون ملک ساڑھے تین ڈالر فی کیلو بیچتی ہے ۔ دوسرے ہم سے اتنی سستی کپاس لے کر ہم پر ایک قمیص ۴۲ ڈالر میں بیچی جاتی ہے ۔ اس لیے کپڑا بنانے کے کارخانے خود ازبکستان میں بنانے چاہئیں ۔

سوویت یونین کے موسکو کے علاقے میں کارکن ۱۵۰ ڈالر ماہانہ کماتا ہے جب کہ ازبکستان میں اسے ۸۵ ڈالر ملتے ہیں ۔ یہ عدم مساوات قابل اعتراض ہے اور سوویت حکومت کے علم میں ہے ۔

روسی ترکستان کے لوگوں کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ روسی ترکستان روس میں تیسرے نمبر پر تیل پیدا کرتا ہے ' روس کے قدرتی تیل کا ایک چوتھائی یہاں سے نکلتا ہے ' تانبے کا ایک چوتھائی یہاں سے نکلتا ہے ' روس کا نصف سونا اور سو فیصد یورانیم یہیں سے نکلتا ہے ' مگر یہاں کے لوگوں کو ابھی تک جدید سہولیات اور اچھے معیار زندگی سے محروم رکھا گیا ہے ۔

ازبکستان کے دستر خوان کی بہترین چیز پلاؤ ہے ۔ اگرچہ تازہ نان بھی بڑی لذیذ ہوتی ہے تاہم پلاؤ ایک قومی ڈش سمجھا جاتا ہے ۔ یہاں پر گاجریں ' ٹماٹر اور سلاد بھی بہت استعمال ہوتے ہیں ۔ بند گوبھی تو میں نے دیکھا فٹ بال کے سائز کی ہوتی ہے ۔

شہر مارجیلان میں ریشم کے کارخانے ہیں ۔ کوئی دس ہزار کارکن اس میں کام کرتے ہیں ۔

ازبکستان میں ایسی ماؤں کو ۶۰۰۰ میڈل مل چکے ہیں جن کے دس دس بچے ہیں ۔ جنگ عظیم دوم سے پہلے یہ میڈل جاری کیا گیا تھا ۔ لیکن یہ عورتیں میڈل لینے کے لیے بچے پیدا نہیں کرتیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں صحت سے نوازا ہے ۔ مردوں اور عورتوں کے جینز صحت مند ہیں ۔ دوسرے وہاں یہ ثقافتی روایت ابھی موجود ہے کہ مضبوط خاندان باعث برکت ہوتا ہے ۔ میں نے وہاں یہ سنا ہے کہ جب والدین کے بڑے بیٹے کی شادی ہوتی ہے تو وہ اپنی بیوی سمیت والدین کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ رہتا ہے ۔ جب دوسرے بیٹے کی شادی ہوتی ہے تو پھر بڑا بیٹا الگ گھر بناتا ہے

اور دوسرا بیٹا ماں باپ کی خدمت کرتا ہے ۔ اسی طرح تیسرا اور چوتھا ۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ خود ازبیکی نشہ بہت کم کرتے ہیں بلکہ نہیں کرتے جب کہ یورپی روس کے جو لوگ وہاں ہیں وہ نشے کے سخت عادی ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے اسلام میں نشہ منع ہے ۔ مساجد اور مذہبی اجتماعات میں حالانکہ وہ خفیہ طور پر منعقد ہوتے تھے ' ازبیکوں کو بتایا جاتا تھا کہ شراب مت پیو کہ یہ حرام ہے ۔ اسلام کی یہ تعلیم بے اثر نہیں گئی ۔ لوگوں نے اس بات کا احترام کیا ہے ۔

ہوٹلوں میں پہلے تو بھوک لگانے والی چیزیں (نقل) مثلاً پنیر اور گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں ' انگور ' ناشپاتی ' سیب ' اخروٹ ' بادام ' پستہ وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں ۔ پھر مولی ' ناشپاتی ' چیری اور توت کے مربے اور آخر میں گرم گرم پلاؤ جس سے بھاپ نکل رہی ہوتی ہے ۔

خاص طور پر ازبکستان کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کے وطن جیسا وطن کوئی نہیں (مثلاً فرغانہ وغیرہ) اس لیے وہ ترک وطن بالکل نہیں کرتے ۔ سوویت روس نے بہت زور لگایا اور ان کو دوسری جگہ جاب پیش کی لیکن انھوں نے کہا ہم یہیں کام کر کے روکھی سوکھی کھالیں گے ۔

ازبکستان میں خاص طور پر تاشقند میں زلزلے بہت آتے ہیں ۔ ایک آدمی سے تو میں نے سنا ہے کہ جب سے ریکارڈ رکھا گیا ہے ۲۵۰۰ زلزلے آچکے ہیں ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

ازبکستان والوں کی زندگیاں اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں ۔ بچے پیدا ہونے پر نام رکھنے کی رسم ہوتی ہے جس میں مقامی مولوی یا کسی اور مذہبی شخصیت کی شرکت لازمی ہوتی ہے ۔ اگر لڑکا ہے تو اس کی رسم ختنہ ہوتی ہے ۔ اس میں بھی مقامی مولوی یا کوئی اور مذہبی شخصیت شریک ہوتی ہے ۔ بعض علاقوں مثلاً فرغانہ میں رسم نکاح مسجد میں ادا کی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی خفیہ طور پر مولوی یا کسی مذہبی شخصیت کو بلاتے تھے ۔ شادی کے موقع پر اگر ممکن ہوتا ہے تو دولھا سونے کی انگوٹھی دلھن کو پہناتا ہے ۔ شادی میں اعزہ و اقربا اور پڑوسیوں میں

سے ۴۰۰ سے ۵۰۰ افراد شامل ہوتے ہیں ۔ جو پلاؤ تیار ہوتا ہے اس میں کوئی ۲۰۰ گاجریں ڈالی جاتی ہیں ۔ جو لوگ دور سے آتے ہیں ان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے ۔

ایک آدمی سے میں نے یہ بھی سنا ہے کہ خطبہ نکاح کے دوران امام واضح طور پر جوڑے کو یہ اسلامی احکام سناتا ہے کہ حلال روزی کماؤ ' چوری نہ کرو ' کام میں کوئی عار نہیں کام کرو ۔ اگر خاوند کسی اور جگہ کام کو جاتا ہے تو اسے بیوی کی گزر بسر کا پیشگی انتظام کرنا چاہیے ' بچوں کی صحیح طور پر تربیت کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ ۔

جنازے اکثر مقامات پر مساجد میں پڑھے جاتے ہیں ۔ امام صاحب اعزہ و اقارب کو صبر کرنے کی نصیحت کرتے ہیں ۔ جنازے میں کم سے کم دو ڈھائی سو افراد شرکت کرتے ہیں ۔ جیسا کہ پاکستان میں رائج ہے میت کو چارپائی پر رکھ کر اٹھایا جاتا ہے اور قبرستان تک پہنچایا جاتا ہے ۔

ایک دن میں نے فرغانہ کے ایک شخص سے پوچھا کہ وہاں جمعہ پڑھنے کتنے آدمی جاتے ہیں ۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ کوقند کی مسجد نوریوتاہے میں دس ہزار آدمی نماز پڑھنے جاتے ہیں ۔ ایک اور مقام مارجیلان میں جو کہ کوقند سے نسبتاً چھوٹی جگہ ہے پانچ چھے ہزار نمازی جاتے ہیں ۔ اب آپ اندازہ فرما لیجے کہ وہاں پچاس ساٹھ برس جبر و استبداد کا دور رہا ہے جس میں مذہب پر عمل کرنا قریب قریب ناممکن تھا اور اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا ۔

میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ ترک خواہ وہ روسی ترکستان کے ہوں یا ترکی کے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و سلم سے جتنی محبت رکھتے ہیں اور جس قدر وہ آپؐ کی عزت کرتے ہیں ' اتنا اور کوئی نہیں کرتا ۔ وہ روضہ رسولؐ کی طرف پشت کرنا گوارا نہیں کرتے ۔ شاید ان کی یہ محبت امام بخاری اور امام مسلم رحمتہ اللہ علیہما جیسے بزرگوں کی بدولت ہے جنھوں نے اس قوم کی تربیت کی ۔

روسی ترکستان میں اسلام

کہا جاتا ہے کہ ۱۵۵۲ء میں خوفناک ایوان نے کازان کی ترک امارت پر قبضہ کر لیا ۔

ایوان ظالم و جابر جیسا بھی تھا اسلام کے لیے اس میں کچھ نہ کچھ روا داری تھی ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک تاتاری کی لڑکی سے شادی بھی کی تھی ۔ ایوان کی موت کے بعد متعصب عیسائیوں نے وہاں کی مساجد کو شہید کر دیا اور مسلمانوں پر سخت مظالم توڑے حالانکہ اسی امارت کو وہ برسوں خراج دیتے آئے تھے ۔ بعد میں ملکہ کیتھرین دوم نے مسلمانوں سے رواداری برتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو ایک معقول مذہب سمجھتی تھی ۔ ۱۷۸۲ء میں اس نے اورین برگ میں مسلم روحانی انجمن قائم کی ۔ بعض مورخ اسی کو مسلم بورڈوں کی اولین اساس قرار دیتے ہیں ۔

کمیونسٹ دور میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن اسٹالن تھا ۔ ۱۵ویں کمیونسٹ پارٹی کانگرس کے بعد ۱۹۲۸ء میں اسے بے انتہا طاقت حاصل ہو گئی ۔ اس نے مساجد منہدم کرانے کی ایک نہایت ظالمانہ اور مشرکانہ مہم شروع کی جو جنگ عالم گیر دوم تک اسی شدت سے جاری رہی ۔

میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ۱۹۸۹ء میں کمیونزم کی عمارت کے یکایک گر جانے کے کئی وجوہ میں سب سے قوی اور زور دار وجہ اسٹالن کے بے روک ٹوک مظالم ہیں ۔ مذاہب کا تو خیر وہ دشمن تھا ہی اس نے ۲۰ ملین کسانوں کو نہایت بے دردی سے اور چوری چھپے موت کے گھاٹ اتروا دیا جو سرکاری فارموں پر جبری کام کرنے کے خلاف تھے ۔ اس کے دور میں بیوی خاوند کی اور خاوند بیوی کی جاسوسی کرتا رہا ۔ لوگ اگرچہ چپ رہے تاہم وہ یہ کیسے بھول سکتے تھے کہ ان کے اب و جد کو سفاکانہ طور پر جنگلوں میں گولی مروا کر کھڈوں میں ڈلوا دیا گیا تھا ۔ انھوں نے یہ سوچا کہ جس نظام میں اس وحشیانہ سفاکی کی ہر وقت گنجائش ہے وہ طبعی طور پر برا ہے ۔

جہاں تک استحصال کا تعلق ہے سرمایہ دارانہ نظام میں استحصال کیا کم ہے ؟ استحصال سے اسکائی سکریپر استادہ کیے جاتے رہے ' لیکن اس میں جبر و استبداد اس قدر نہیں جتنا کہ کمیونزم میں تھا ۔

اسلام جبر و استبداد کا کلی استیصال کرتا ہے ۔ اسلام کے مطابق طاقت کا مالک کوئی

انسان نہیں بلکہ اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ کوئی ازم، کوئی فیشن، کوئی فلسفہ یا نظریہ ایسی طاقت کا حامل نہیں ہو سکتا جو انسانوں کو اپنی بندگی اور اندھا دھند اطاعت پر مجبور کرے۔ اسلامی عقیدہ مسلمانوں میں ہائیڈروجن بم کی طاقت بھر دیتا ہے۔ ہٹلر اور اسٹالن جیسے لوگ، جنھوں نے کروڑوں کو خون میں نہلا کر موت کی نیند سلا دیا، روسی ترکستان کے مسلمانوں کو اسلامی عقیدے سے منحرف نہ کر سکے۔ اسلام کی ابدیت کے لیے علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

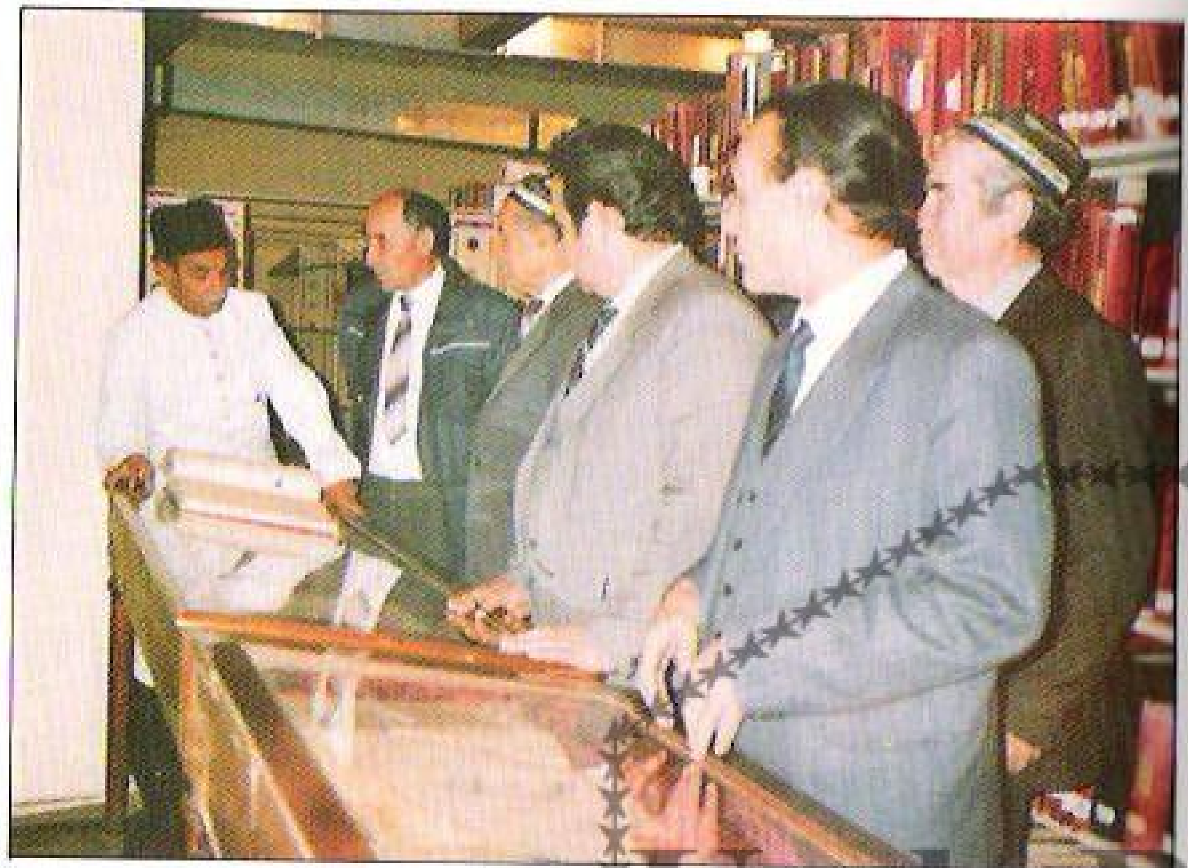
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

روس میں مسلمانوں پر پابندیاں اٹھانے کی تبدیلی اب ۱۹۸۹ء سے آئی ہے۔ باکو میں ۶۰ مقفل مساجد مسلمانوں کو واپس کی گئی ہیں۔ وہاں مسلمان علما کی تربیت کا ایک اسکول کھولنے کی اجازت بھی ملی ہے۔ بخارا میں میر عرب مدرسے کے علاوہ ایک اور دینی درس گاہ کی اجازت مل چکی ہے جس پر چار ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔ تاشقند میں بھی چالیس مقفل مساجد مسلمانوں کو واپس کی گئی ہیں۔

روسی ترکستان کی سب سے بڑی ضرورت ایسے علما ہیں جو قرآن و حدیث کی روح کو مقامی زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ چوں کہ دینی درس گاہوں پر پہلے پابندی تھی اس لیے اس پائے کے عالم پیدا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت لگے گا۔

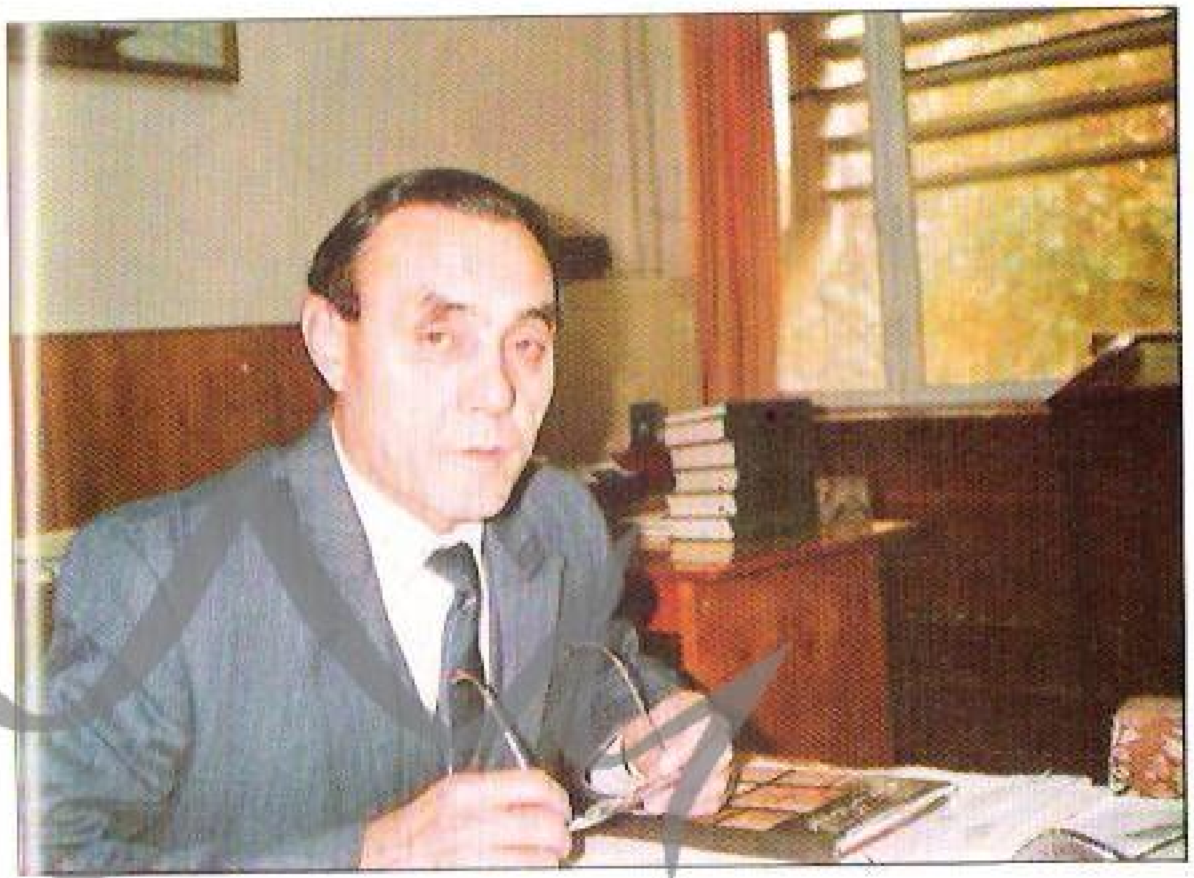
روسی ترکستان میں قرآن مجید کے مقامی زبانوں میں تراجم کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ازبک عالم التن چان تورا تیرازبج نے حال ہی میں (۱۹۸۸ء) میں مدینے میں وفات پائی ہے۔ ان کی عمر ۹۰ برس تھی۔ انھوں نے ۳۰ برس کی محنت سے قرآن مجید کا ازبک زبان میں ترجمہ کیا۔ سنا ہے یہ ترجمہ سعودی عرب میں شائع ہوا۔ ازبکی زبان بھی عربی حروف تہجی میں لکھی گئی ہے، لیکن یہ ترجمہ روسی ترکستان نہیں پہنچ سکا۔

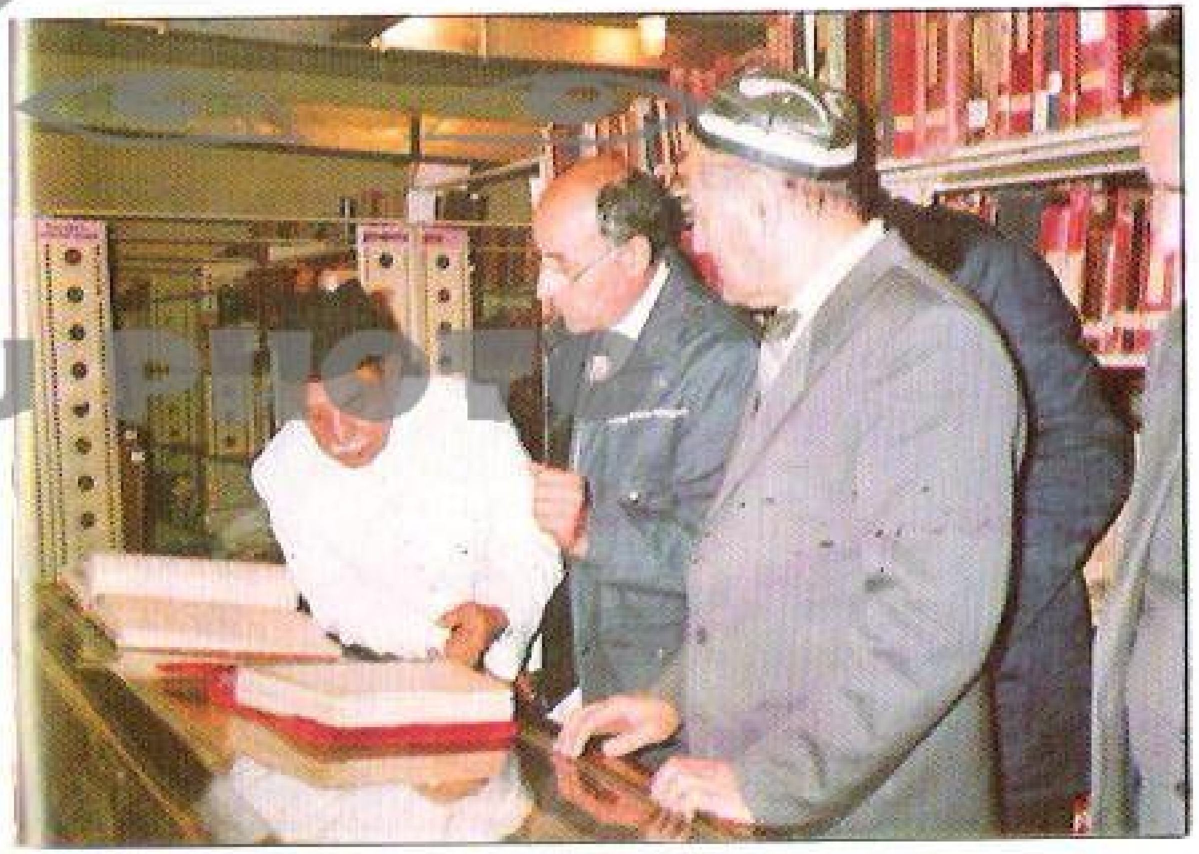
کہا جاتا ہے کہ پینتیس چالیس میں قرآن مجید کے چھے اڈیشن تاشقند میں چھاپے گئے۔ چوں کہ آخری اڈیشن دس ہزار نسخوں کا تھا اس لیے اندازہ یہ ہے کہ کل ساٹھ ہزار نسخے چھاپے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قرآن مجید بالکل دست یاب نہیں اور



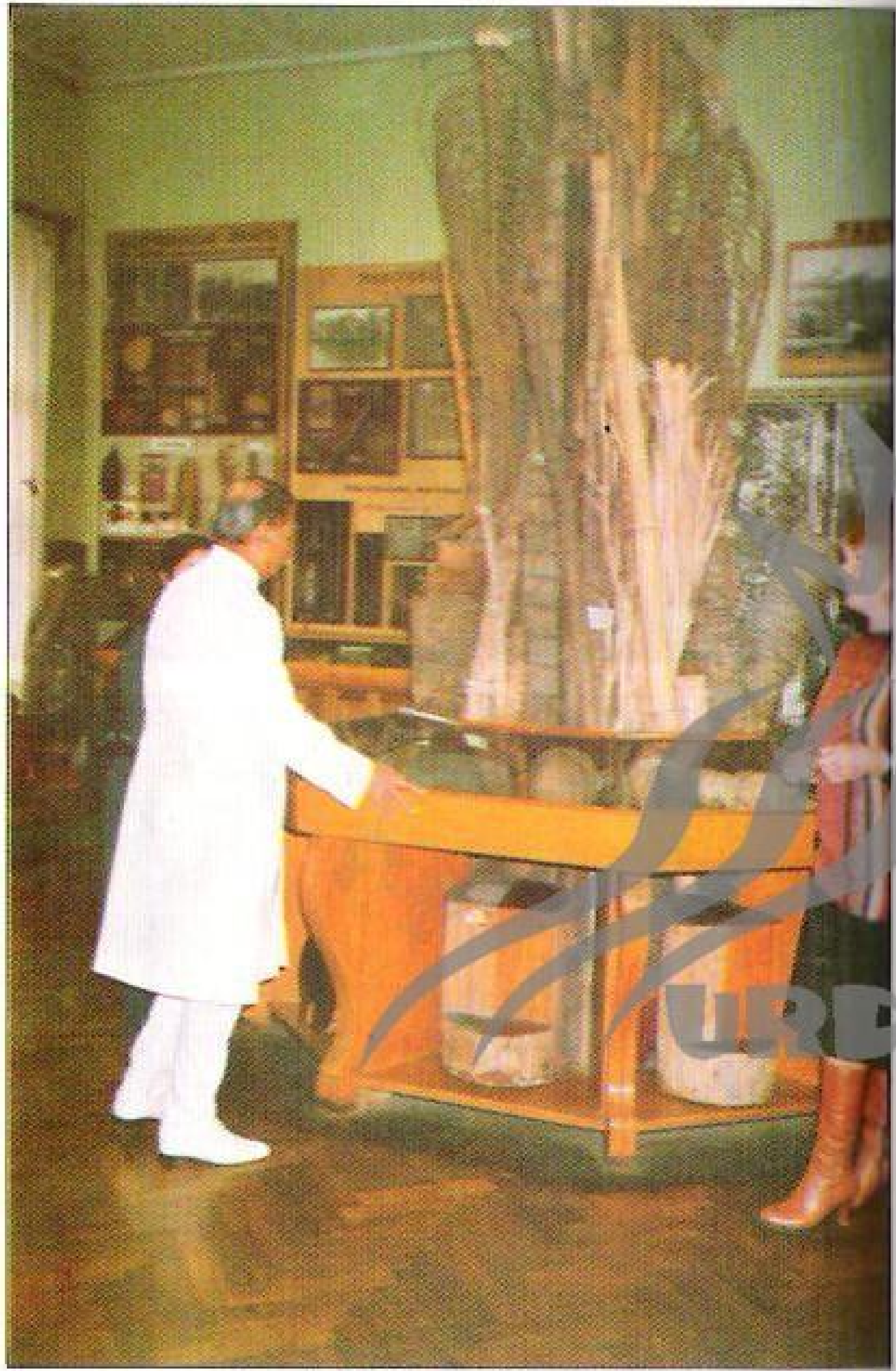


البیرونی مرکز تحقیقات علوم شرقیہ، تاشقند میں

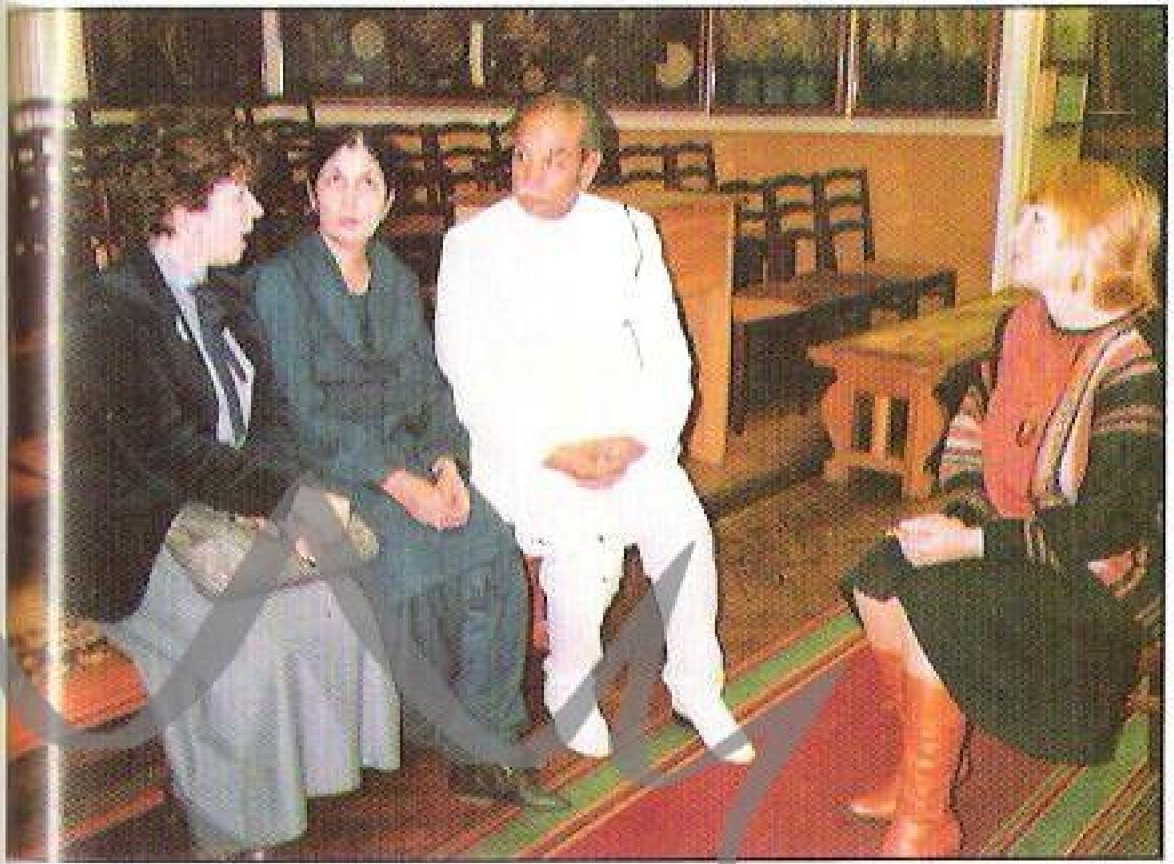


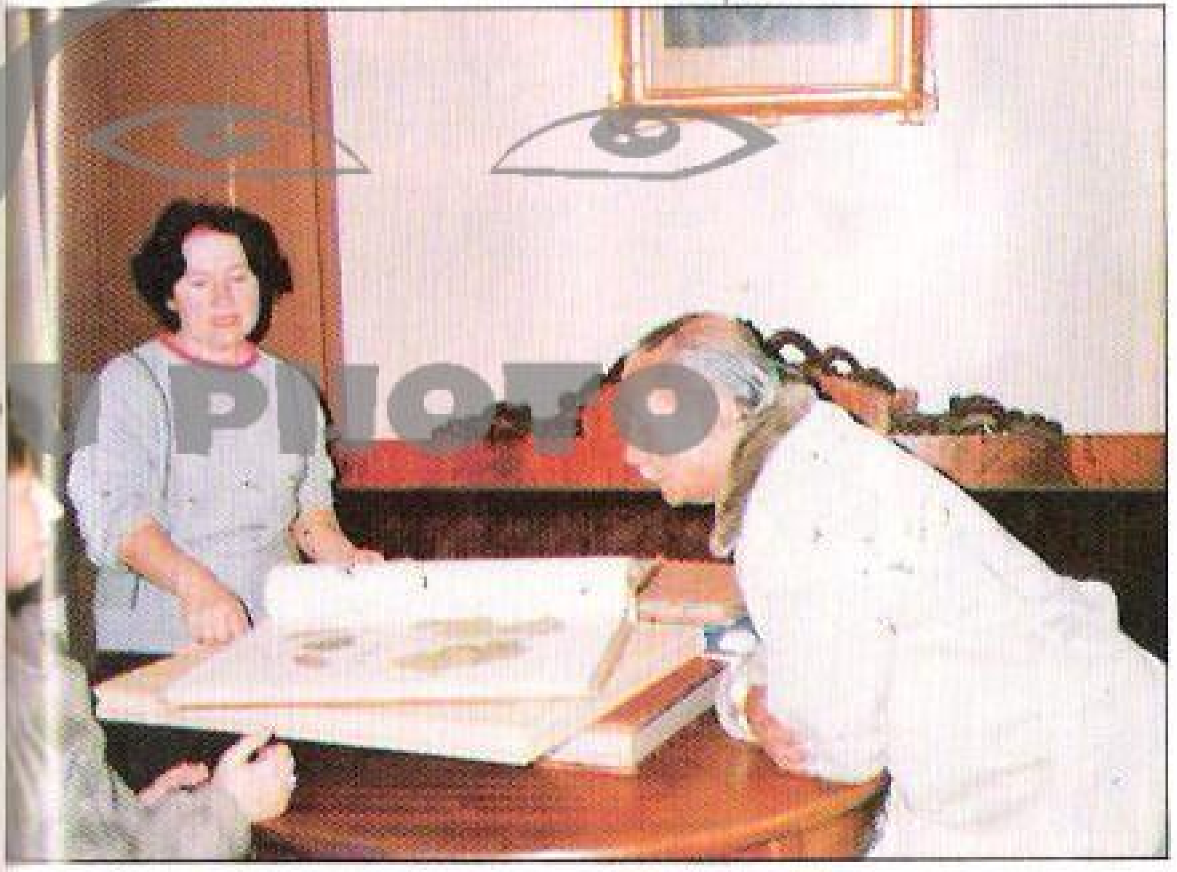


ڈائریکٹر البیرونی مرکز تحقیقات علوم شرقیہ، تاشقند اور اسی مرکز کا شعبہ مخطوطات۔



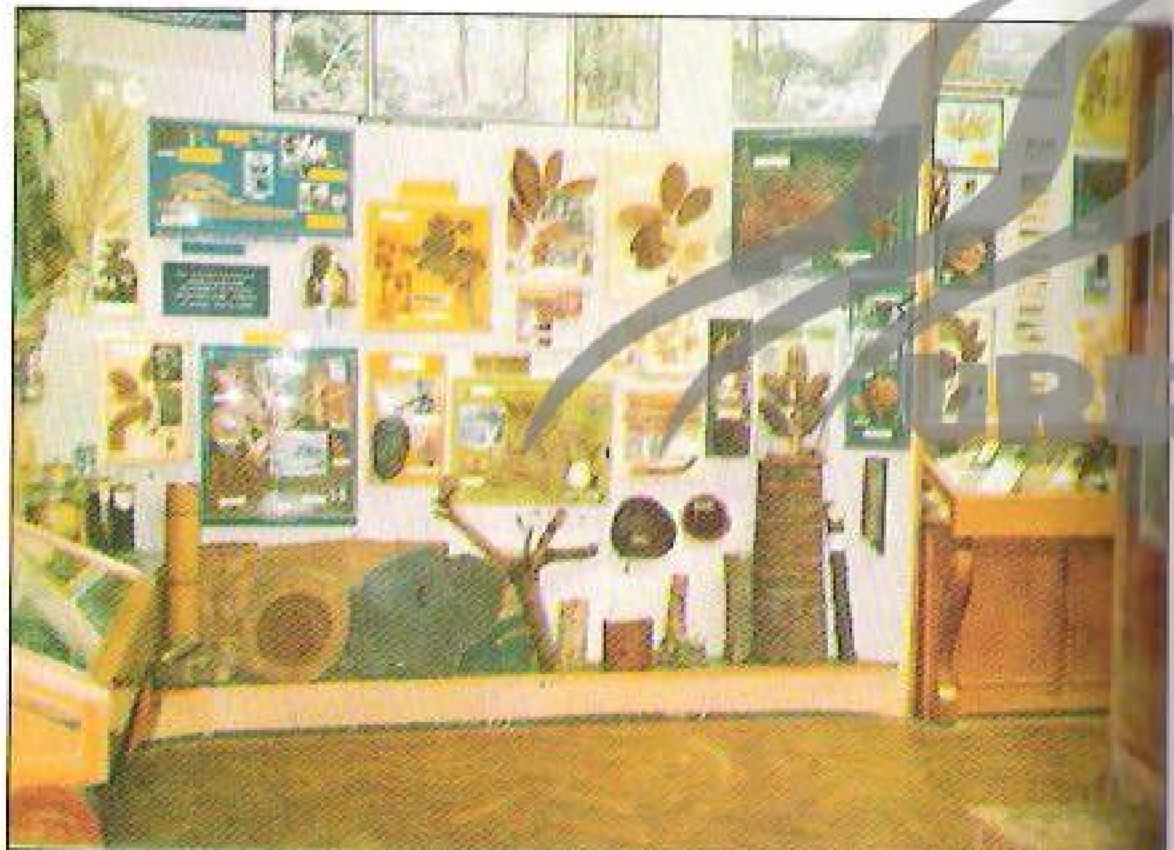
لینن گراد میں دنیا کا بڑا باغ نباتات





اوپر، مرکز نباتات میں محترمہ آئرین جی زبکوفا سے ایک تبادلِ خیال ۔ نیچے، باغ نباتات کی لائبریری کا شعبہ مخطوطات ۔ اس لائبریری میں ایک لاکھ سے زیادہ عظیم کتابیں ہیں





نباتات میوزیم، لینن گراد کے مناظر



باغ نباتات لینن گراد کا ایک ہاٹ ہاؤس

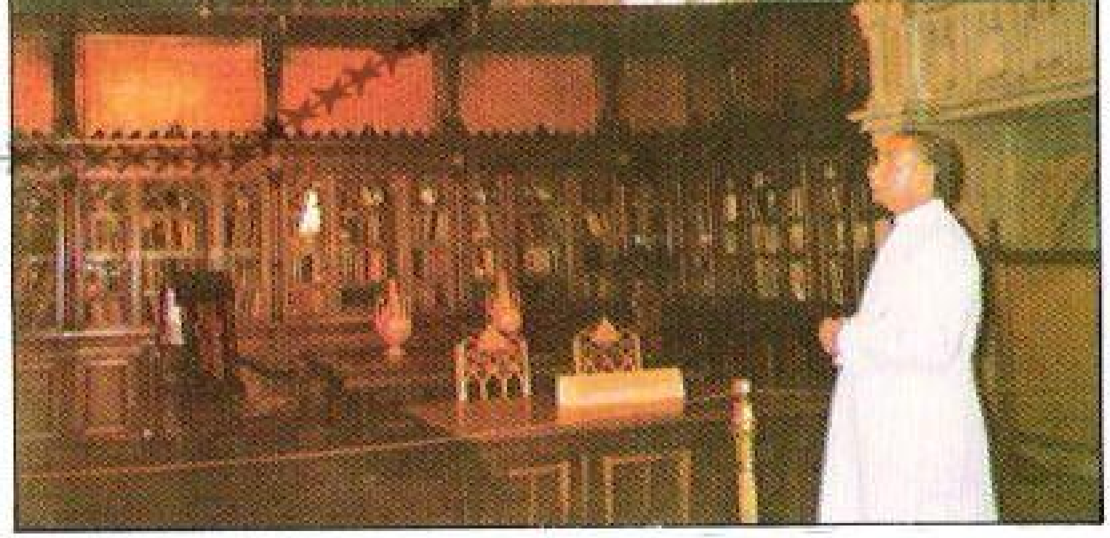




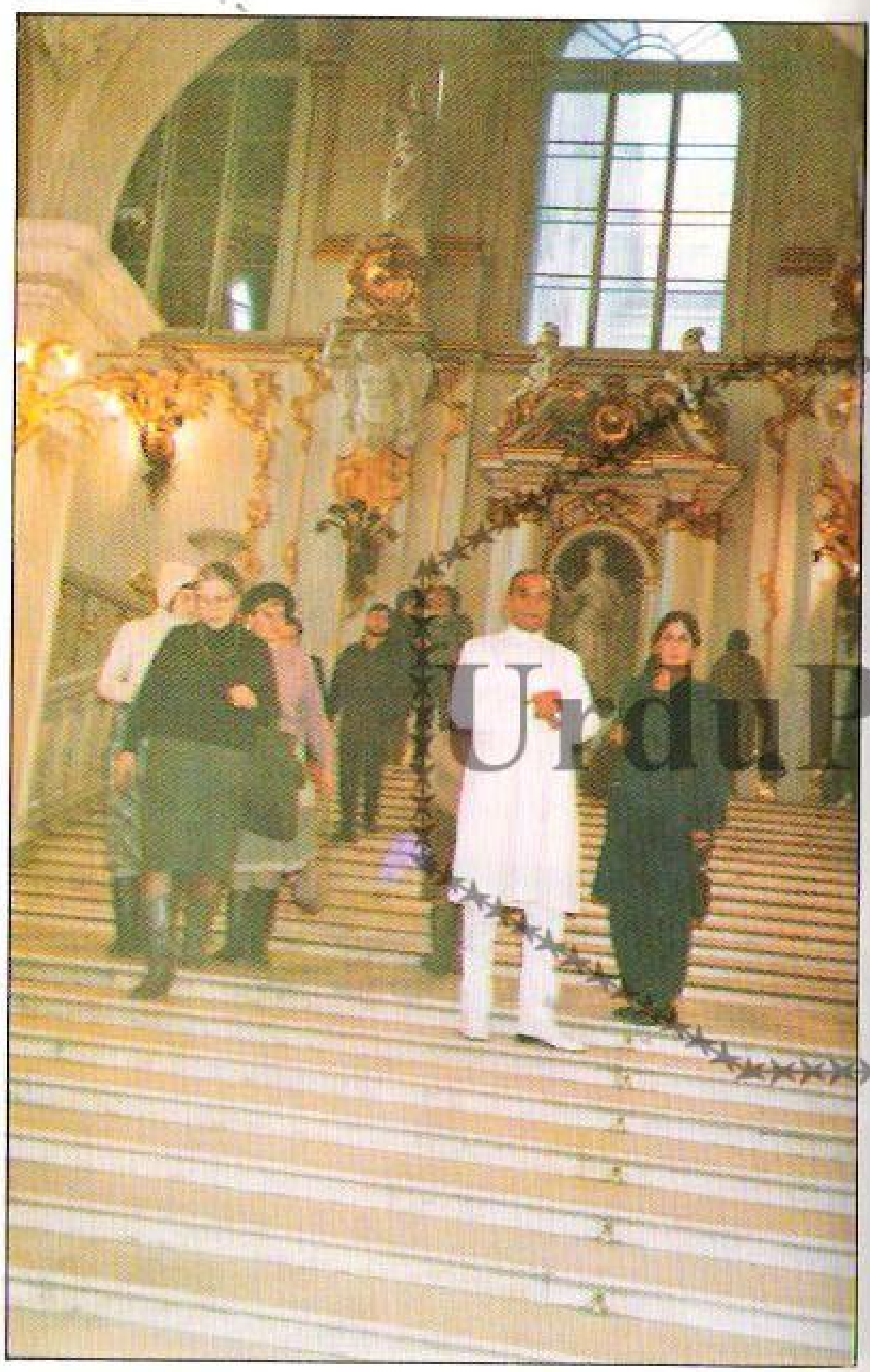
اوپر' نباتات میوزیم میں آرائش نباتات ۔ نیچے' باغ نباتات میں آنے والے نونہالوں کے ساتھ ۔



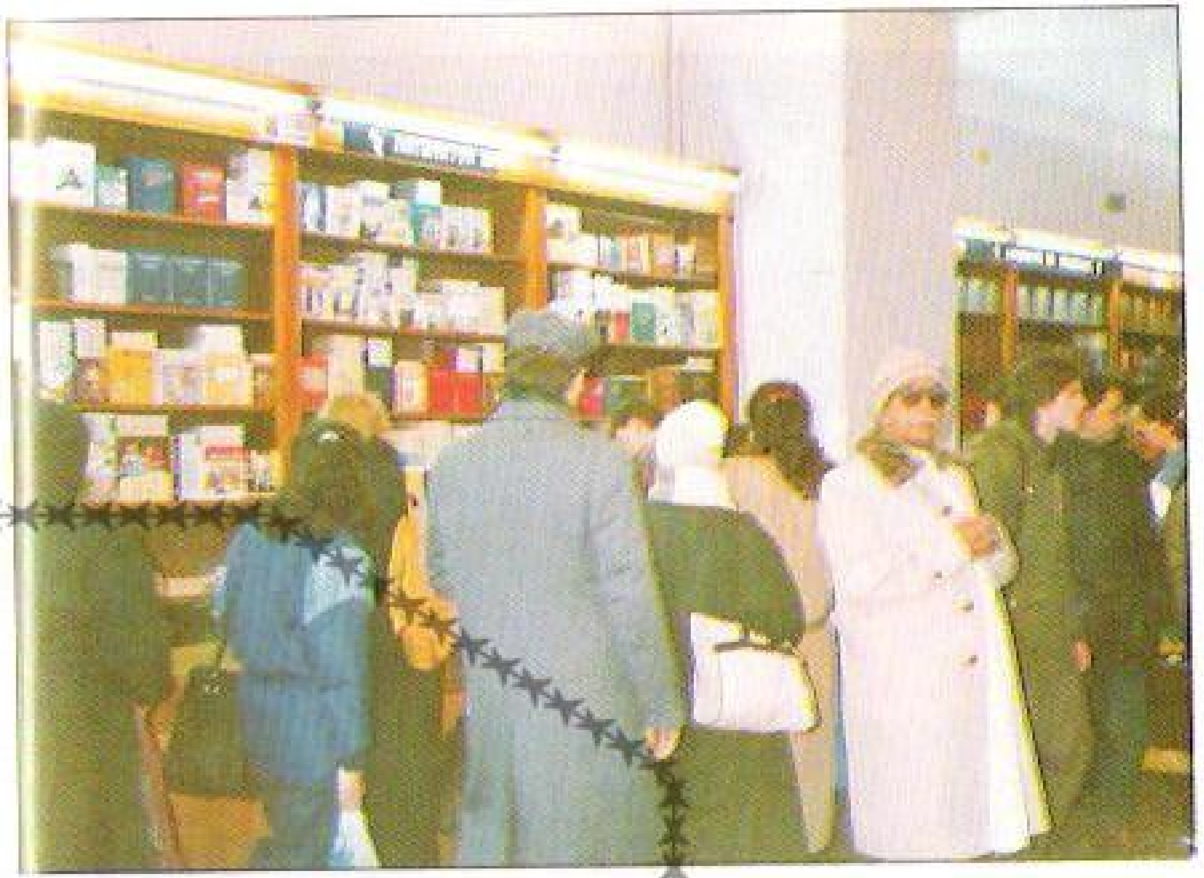




لینن گراد میں ایک نہایت عظیم ہری تاژ میوزیم کے چند مناظر۔ اس کے ڈائریکٹر
جناب ڈاکٹر پروفیسر بورلیس پیتروفسکی ہیں۔



ہری تاژ میوزیم کا ایک منظر





اوپر 'لینن گراد میں ایک کتاب گھر۔ نیچے 'لینن گراد کی برف باری میں ایک شام۔



لینن گراد میں ایک چلڈرن فنڈ قائم ہے جہاں معصوم اور ضرورت مند نونہالوں کی پرداخت ہوتی ہے۔ اس فنڈ کے ڈائریکٹروں کے ساتھ۔





اوپر، باکو میں آذربائیجان کے وزیر صحت جناب محترم طلعت قاسموف کے ساتھ ایک تبادلِ خیال - نیچے، وزیر ثقافت جناب محترم پولاد بو بُلبُل کے ساتھ تبادل خیال



باکو، صدر مقام آذربائیجان میں قدیم کارواں سرائے اب ریستورانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں - آذربائیجان پاکستان انجمن دوستی کے جناب نبی خضری نے کارواں سرائے میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا -



باکو میں مرکز تشخیص امراض (ڈایا گنوسٹک سنٹر) ڈائریکٹر جناب محترم شیر علیوف اوکتائی کاظم اوغلی صاحب کے ساتھ -

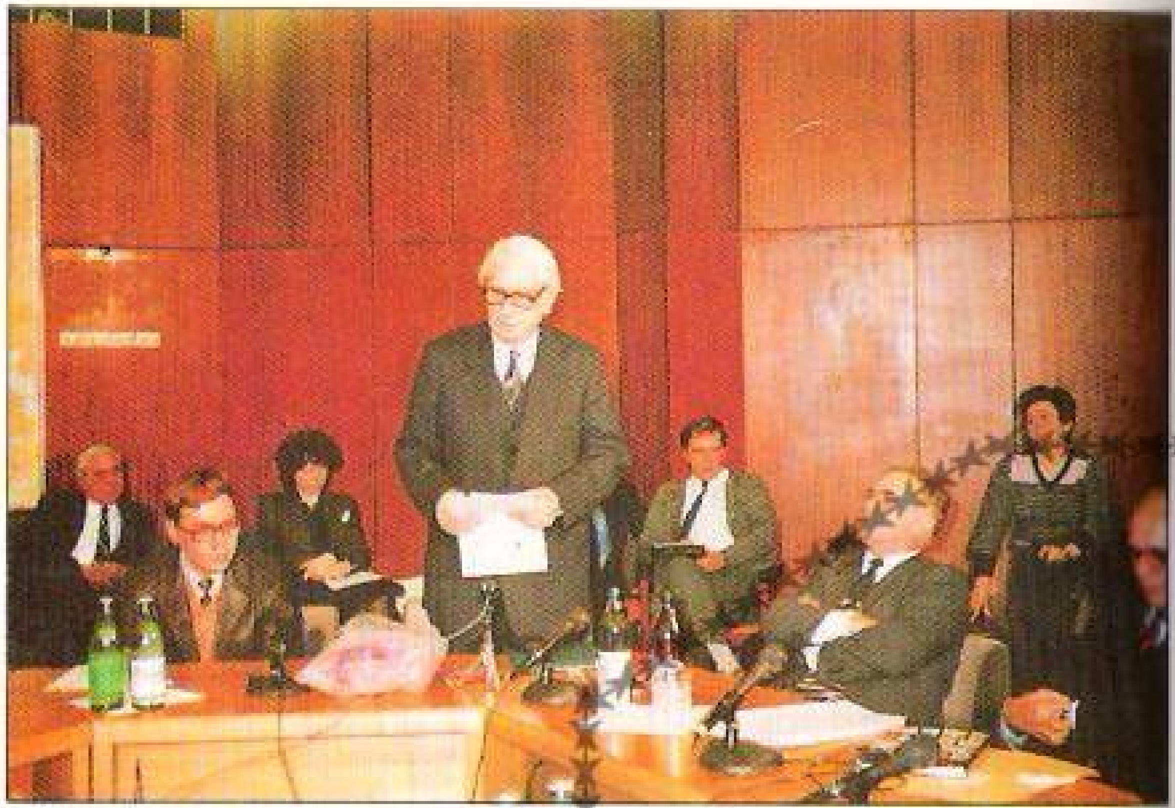
عالمی ابن سینا ایوارڈ

یونیسکو کی تحریک پر روس نے ایک عالمی ایوارڈ ابن سینا قائم کیا ہے۔ متعدد ممالک پر مشتمل ایک جیوری دنیا بھر سے ابن سینا ایوارڈ کے لیے موزوں شخصیت کا انتخاب کرتی ہے۔ ۱۹۸۸ء کی عالمی شخصیت مصنف کتاب ہذا کو قرار دیا گیا ہے۔ موسکو میں ۱۷ نومبر ۱۹۸۹ء میں یہ عالمی ایوارڈ عطا ہوا۔ مصنف عالمی ابن سینا ایوارڈ وصول کر رہے ہیں۔

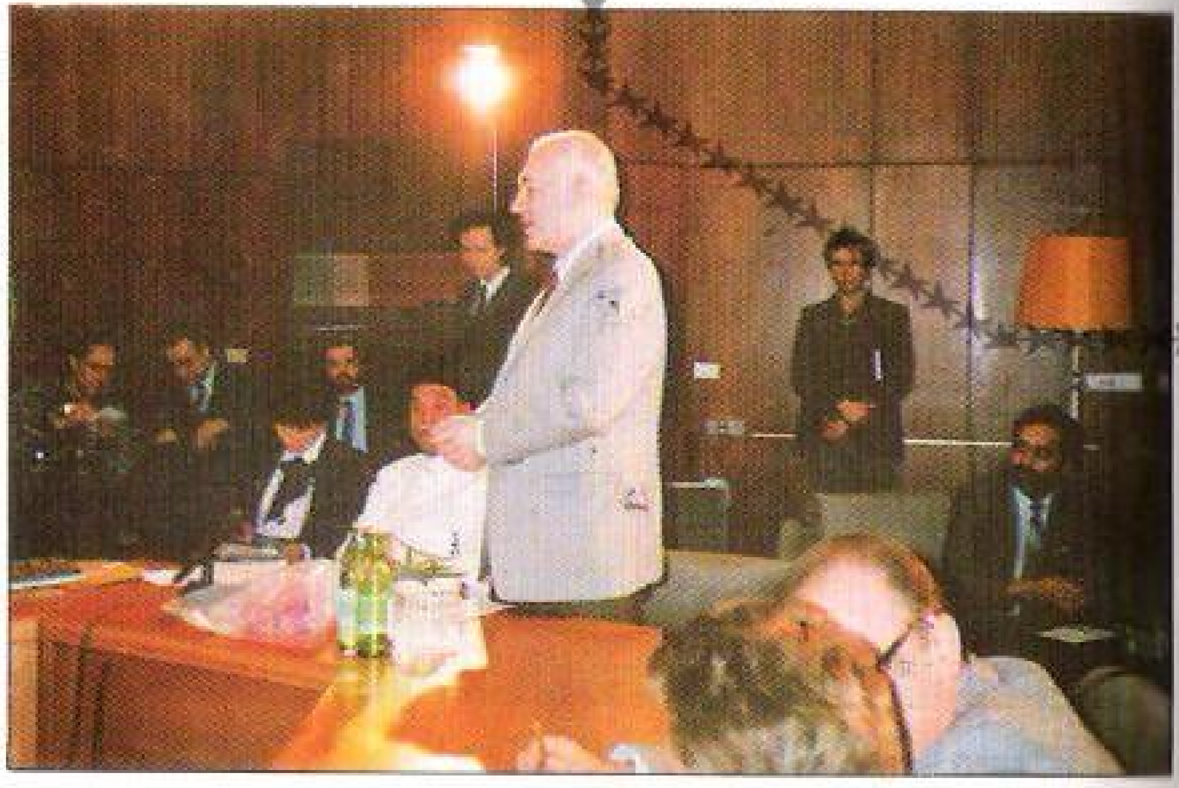




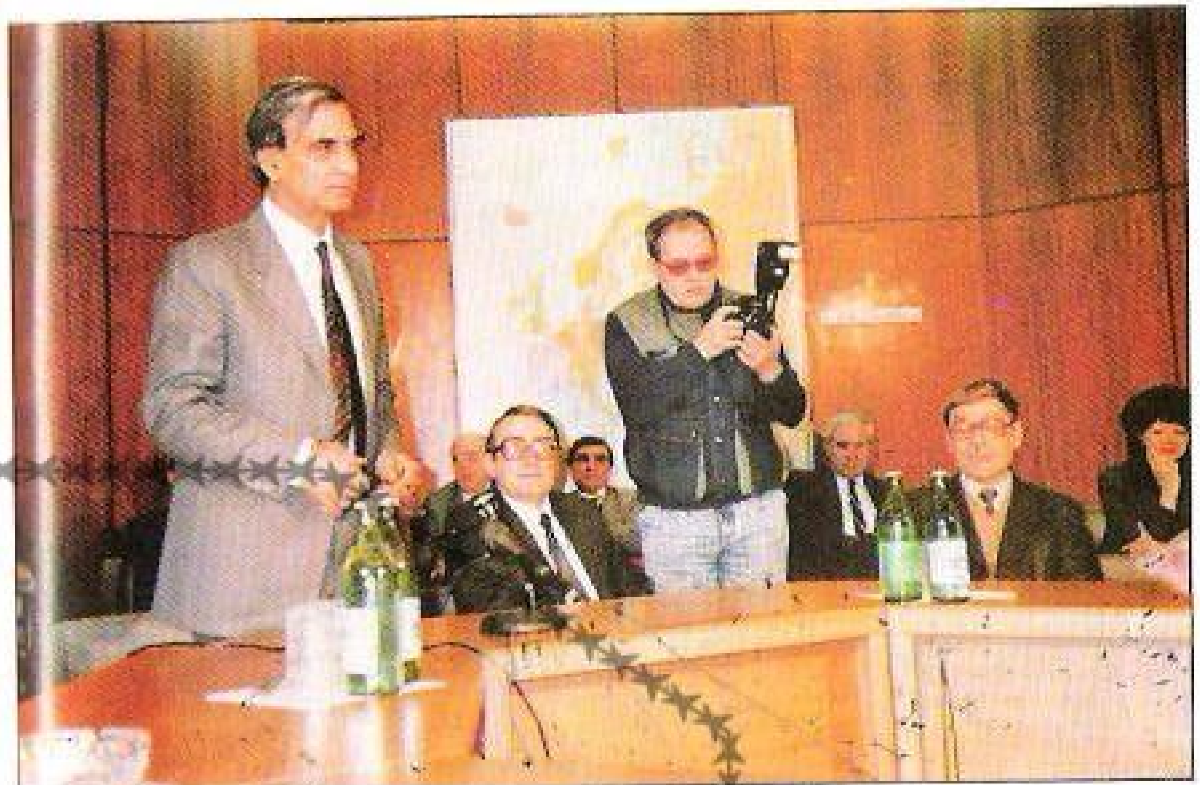
عالمی اعزاز وصول کرنے کے بعد اظہار تشکر



اس موقع پر ابن سینا عالمی ایوارڈ پروفیسر بورس پیتروفسکی ڈائریکٹر ہری تاژ میوزیم کو بھی عطا ہوا۔ پروفیسر پیتروفسکی شکریہ ادا کر رہے ہیں۔



عالمی شہرت یافتہ اسکالر اور مصنف کے دوست پروفیسر گنگواسکی نے عالمی ابن سینا ایوارڈ کے موقع پر ایک تعارفی تقریر کی۔



روس میں سفارت خانہ پاکستان کے نائب سفیر جناب محترم رعنا صاحب نے بھی پاکستان کی طرف سے عالمی ابن سینا ایوارڈ عطا کرنے پر چند کلمات ارشاد فرمائے۔



پروفیسر بورلیس پیتروفسکی اور مصنف ریڈیو ماسکو کے لیے اپنے تاثرات رکارڈ کرا رہے ہیں۔

دوسری کتابوں کا تو تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۸۷ء میں اشقاباد کے ایک اخبار کے مطابق مقامی طور پر چوری سے اسلامی لٹریچر چھاپنے والے دو علما کو دس دس سال کی سزا سنائی گئی تھی۔ سمرقند میں ایک عورت اور اس کے والد کو جو اسلامی لٹریچر بیچ رہے تھے سزا دی گئی تھی۔

میں نے یہ سنا ہے کہ روس میں قرآن کا ہدیہ ۳۰۰ امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ افغانستان کی جنگ کے دوران کچھ لوگ روسی ترکستان میں قرآن مجید کے نسخے لے گئے اس سے ہدیہ ۳۰۰ سے گر کر ۷۵ امریکی ڈالر ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ انقلاب روس سے پہلے تیس چالیس ہزار روسی مسلمان حج کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں حج پر جانے کی مکمل ممانعت ہو گئی۔ ۱۹۴۵ء سے پندرہ بیس افراد کو اجازت دی جانے لگی حال آنکہ ۱۹۸۸ء میں چین سے بھی دو ہزار حاجی آئے تھے۔

متشدد کمیونسٹ دور میں پورے روس میں صرف ترک ہی ایسے لوگ تھے جن پر روسی انسان کی چھاپ نہیں لگ سکی۔

گرچہ مختلف وجوہ کی بنا پر کئی شخصیتوں کو عظیم لیڈر کہا جا سکتا ہے، لیکن میں اپنی ذاتی رائے میں جناب گورباچوف کو عظیم ترین لیڈر سمجھتا ہوں کہ انھوں نے چوری سے نہیں، ڈکٹیٹرشپ سے نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے اندر ایک نئی سوچ پیدا کر کے روس کے ۲۸ کروڑ افراد کو جبر و تشدد کے نظام سے نجات دلائی ہے۔ اپنے طور پر کوئی چاہے تو اینجلز، مارکس اور لینن کے فلسفے کو دل سے لگا رکھے، لیکن اسے زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا درست نہیں۔ یہ ایک اتنا عظیم کام ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

میں تو اہل روس کو اس لیے داد دیتا ہوں کہ انھوں نے کم از کم ۷۰ برس کے تجربے کی ناکامی کو مان تو لیا۔ انسان کے تراشے ہوئے ازم انسانیت کے لیے ابدی اقدار نہیں بن سکتے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو بھی مقدس نہ سمجھ لیا جائے۔ اس میں بھی نجاست اور خباثت موجود ہے۔ دولت و ثروت فرعونیت اور

ظلم کو جنم دیتی ہے۔ استحصال کوئی اور روپ دھار لیتا ہے۔

سرمایہ داری اور جمہوریت جو سرمایہ داری کے عزائم کو پروان چڑھاتی ہے، کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو لیکن اس الزام کا جواب نہیں دے سکتی کہ وہ لذت پرستی پیدا کرتی ہے۔ ویڈیو، بیلے، کار ریس، فائیو اسٹار ہوٹل، سیکڑوں قسم کی شرابیں، ہزاروں قسم کے مرغوبات، ہشت پایوں اور سانپوں کے سوپ، سیکس کا جنون یہ سب کچھ طاؤس و رباب اول اور طاؤس و رباب آخر ہی تو ہے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مفکر، فلسفی، مذہبی اسکالر اور دیگر مدبرین سر جوڑ کر بیٹھیں اور جمہوریت کی لذت پرستی کو روکنے کی تجاویز سوچیں۔ یہ فکری مسئلہ ہے۔ اس کے لیے گہری سوچ کی ضرورت ہے۔ اگر انسانیت طوق و سلاسل سے آزاد ہو کر نشے سے دھت ہو کر تباہی کے گڑھے میں جا گرے تو ایسی جمہوریت کا کیا فائدہ۔ جمہوریت ہو تو ایسی جس کی بنیاد دانش پر ہو جو انسانی شخصیت میں توازن پیدا کرے۔ انسان دنیا میں رہتے ہوئے کثافتوں سے پاک ہو کر اپنے خالق حقیقی کے حضور سر تسلیم خم کرے تو بات بنے گی۔

۱۲ نومبر ۱۹۸۹ء۔ اتوار

باکو۔ آذربائیجان

جناب تش مرزا خالر زائف آخر نہ مانے، صبح ۵ بجے از بیکستان ہوٹل آگئے۔ شب گزشتہ میں نے درخواست کی تھی کہ ہم اسی وقت ایک دوسرے کو خدا حافظ کہے لیتے ہیں مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی۔ ہم شب گزشتہ کوئی ساڑھے بارہ بجے سامان وامان باندھ کر لیٹے تھے۔ میں کب سویا: فکروں میں رات بھر غرق رہا۔ ہم صبح چار بجے اٹھ بیٹھے اور تیار ہو کر ۵ بجے نیچے آگئے۔ ہمارے میزبان جناب گنادی صاحب بھی مستعد انسان ہیں۔ وہ ہمہ دم ساتھ ہیں اور بڑی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارے آرام و آسائش میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ خلوص کے پیکر ہیں۔

آج تاشقند کا سفر ختم ہو رہا ہے۔ یہاں دو نہایت معروف مگر نہایت مفید اور پر مقصد دن گزرے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر جناب مرزا یوف صاحب نہ ہوتے تو اس قدر جلد اس قدر کام نہ ہوتے۔ مرزا یوف صاحب بہترین اردو جانتے ہیں۔ مسلسل اردو سیکھ رہے ہیں اور اب اردو زبان پر اپنا تحقیقی کام شائع کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے تعاون کا اطمینان دلایا ہے۔ شب گزشتہ انھوں نے اپنے مسائل سے مجھے آگاہ کیا اور تحقیقی مقالہ کے لیے چند ضروریات علمی کی یاد داشتیں لکھ کر مجھے دی ہیں۔ میں حتی الامکان ان کی مدد کروں گا!

تاشقند کے ہوائی میدان پر نہایت حزن و ملال تھا۔ مرزا صاحب سے جدائی ہو رہی تھی۔ اب نہ جانے کب ایسے اچھے انسان سے ملاقات ہو۔ خلوص مجسم، عالم، اسکالر۔ اللہ ان کو اپنی پناہ میں رکھیں۔ ہوائی جہاز ساڑھے پانچ بجے وقت مقررہ پر اڑتا ہے۔ ہم وی آئی پی سے نکل کر جہاز میں سوار ہوئے۔ اندازہ ہوا کہ جہاز تو خالی ہے۔ ڈھائی سو نشستیں خالی پڑی تھیں۔ مگر جلد ہی لوگوں کا ریلا آیا اور جہاز کی ایک ایک سیٹ بھر گئی۔ ہمارے نگراں جناب گنادی صاحب نے اب بتایا کہ ہفتے کو

اس جہاز میں جگہ نہ مل سکی اس لیے تاشقند کا ایک دن بڑھ گیا جس کو ہم نے بخارا کے سفر سے بھرلیا۔ اتوار کے لیے بھی بہ مشکل جگہ ملی ہے!

باکو آذر بائیجان ریاست کا دارالحکومت ہے۔ ۸ بجے جہاز باکو کے ہوائی میدان پر اس طرح اتر گیا کہ پتا تک نہ چلا۔ یہی تاشقند میں ہوا کہ ہوائی جہاز کب ہوا میں بلند ہو گیا احساس تک نہ ہوا۔ کہنا چاہیے کہ روسی پائلٹ نہایت ماہر ہیں۔ ان کو جہاز اڑانے اور جہاز اتارنے کی غیر معمولی مشق ہے۔ اب تک جتنے جہازوں میں سفر ہوا ہے تجربہ یہی رہا ہے۔ ایک دور تھا کہ پاکستان کے پائلٹ سب سے اچھے شمار ہوتے تھے۔ اس قدر اچھے کہ جب سنگاپور ایر لائن کو ضرورت ہوئی تو اس نے پاکستان کے سترہ پائلٹ اپنے ہاں بھرتی کر لیے اور ان کو دوگنی تنخواہیں دیں۔ وہ اللہ کے بندے اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے جا ملے تھے۔ پھر معلوم نہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا، کب چینیوں نے ان کو سنگاپور ایر لائن سے نکالا دیا۔

ہوائی جہاز سے باہر نکلے تو اندازہ ہوا کہ یہاں سردی کم ہے۔ باکو کیس پئین ببی (بحیرہ خضر) کے کناروں پر آباد ہے۔ درجہ حرارت یہاں گیارہ ہے۔ اس موسم سے سعدیہ خاصی خوش ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ابھی تو لینن گراد اور موسکو کی سردی باقی ہے جہاں درجہ حرارت ایک دو ہونے کا امکان ہے۔ "اچھا تو ابھی موسم سے مقابلہ باقی ہے!" سعدیہ نے کہا۔

ہمارے لیے خصوصی گاڑی جہاز کے دروازے پر آکر لگ گئی تھی۔ ہم اترے اور گاڑی میں بیٹھ کر وی آئی پی روم میں آ گئے۔ سامان بعد میں آتا رہا۔ ہم نے چاہا کہ ہم جہاز سے اترتے ہوئے اپنے سامان کی نشان دہی کر دیں مگر جناب راشدہ میروف صاحب نے ہمیں زحمت نہ دی۔

ذرا دیر بعد باکو کی سڑکوں پر ہماری موٹر کار دوڑ رہی تھی۔ یہاں بارش ہوئی ہے۔ بعض سڑکوں کے کناروں پر پانی جمع ہے، مگر اس پانی کو پانی چوسنے والی مشینیں صاف کر رہی ہیں تاکہ ٹریفک میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ہم تو ایسے مواقع پر موٹر کاروں کو پانی پر چلوا کر اور پانی اچھال اچھال کر پانی کو خشک کرنے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں خواہ مخواہ پانی اٹھا رہے ہیں!

ہوائی میدان سے آذر بائیجان ہوٹل تک کا راستہ بیس منٹ میں طے ہوا۔ اس بیس منٹ میں اندازہ ہوا کہ شہر چھوٹا نہیں ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ شہر باکو کی آبادی کوئی ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

تاشقند، دوشنبہ، سمرقند اور بخارا کی طرح باکو بھی ایک ایسا شہر ہے کہ جہاں عرصہ دراز تک غلبہ اسلام رہا ہے۔ مگر اب روسی دور میں زبان تو قطعی طور پر روسی ہو چکی ہے، یعنی اب حکومت روس کے زیر نگیں ہر علاقے میں روسی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، مگر علاقائی زبانوں کی سرپرستی سے انحراف کی جرات اب تک نہیں ہوئی ہے۔ البتہ علاقائی زبانیں اب روسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ آذر بائیجان کی زبان تاشقند کی زبان سے مختلف ہے۔ اسی طرح دوشنبہ (تاجیکستان) میں ہنوز فارسی زبان ہے۔ مگر یہ فارسی اب روسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ ان کا اپنا رسم الخط اب باقی نہیں رہا ہے۔

ہوٹل آذر بائیجان میں سعدیہ اور میرے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ مگر ہم نے ایک کمرہ چھوڑ دیا ہے اور ایک کمرے میں دونوں باپ بیٹی آ گئے ہیں۔ دوسرا کمرا اسراف تھا۔ ایسا فیصلہ ہم نے ازبکستان ہوٹل میں کیا تھا، مگر وہ کمرا نہایت چھوٹا تھا وہاں بے چاری سعدیہ کو خاصی تکلیف ہوئی۔ بارے یہاں کمرا نمبر ۱۰۷ خوب اچھا ہے۔ کمرا کیس پئین سی کے رخ پر ہے۔ سامنے نہایت خوب صورت منظر ہے۔ کئی جہاز بھی کھڑے ہیں۔

تاشقند سے باکو کا وقت دو گھنٹے پیچھے ہے۔ جب ہماری گھڑیوں میں دس بجے تھے باکو میں اس وقت ۸ بجے تھے۔ ہم نے اپنی گھڑیاں درست کر لی ہیں۔

ناشتہ

شب گزشتہ ہم نے کھانا نہیں کھایا۔ صبح اٹھے تو ہڑبڑاہٹ ایسی ہوئی کہ جو انگور بچے رکھے تھے وہ بھی کھانے کا موقع نہیں ملا۔ بھوک تو سخت تھی مگر ناشتے کا کوئی موقع

یہاں نہ تھا۔ مگر اب باکو کے ہوٹل آذر بائیجان میں ناشتے کا سامان ہو گیا۔ نہایت شان دار ڈائننگ ہال ہے۔ میں نے انڈے نوش جان کرنے کا فیصلہ کیا۔ معلوم ہوا کہ انڈے افراط سے ہیں۔ پتا یہ چلا ہے کہ انڈوں کی وجہ سے "سالمونیلا" مرض کا خطرہ محسوس کیا گیا ہے اس لیے یہاں لوگوں نے انڈے کھانے بند کر دیے ہیں۔ اب مرغیاں ہیں کہ انڈے دیے چلی جا رہی ہیں اور باکو میں انڈوں کے انبار لگ گئے ہیں۔

"سالمونیلا" جراثیم ہیں جو ان کھانوں میں پیدا ہو جاتے ہیں کہ جو بے احتیاطی سے اور زیادہ عرصے تک رکھے جاتے ہیں۔ یہ بہرحال مضر صحت ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہم مزاجاً سالمونیلا کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کراچی میں بڑے بڑے ہوٹل بچی ہوئی غذاؤں کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ وہ کھانے جو میز پر "بو الہوسین" چھوڑ جاتے ہیں ہوٹل والے احترام غذا کے طور پر ان کو بھی سنبھال لیتے ہیں اور دوسرے تیسرے دن بھوکوں کو وہ غذا پیش کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے غذاؤں کا بھرپور احترام ہو جاتا ہے۔ وہ ضائع ہونے سے بچ جاتی ہیں۔ اب اگر انسان ایسی غذائیں کھا کر نہ بچے تو یہ قصور تو اس معالج کا ہوا جس نے علاج میں ناکامی کا اعتراف کیا!

ناشتے میں سورج مکھی کے بیجوں کا حلوا بھی تھا۔ اچھا خاصا بد مزہ تھا، مگر چوں کہ مغرب کی تحقیقات نے سورج مکھی کے پھول اور اس کے بیجوں کو مفید قرار دے دیا ہے اس لیے کم از کم مشرق میں یہ بد مزہ حلوا بھی نہایت رغبت سے کھایا جاتا ہے۔ میں نے نہایت بدمزہ حلوا نہایت رغبت سے اس لیے نوش جان کیا ہے کہ اس سے میری صحت کو فائدہ پہنچے گا۔ ہمیں تو اپنی صحت عزیز ہے۔ اس لیے ہم ذائقہ وغیرہ کے تکلفات کا خیال نہیں کرتے ہیں۔ ہاں ناشتے پر کھیس یہاں بڑی رغبت سے کھائی جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں کھیس تو اس وقت بنتی تھی کہ جب گائے بھینس بچہ دیتیں اور ان کا پہلا دودھ پکانے سے جم جاتا تھا، اس کو کھیس کہتے تھے۔ بڑی بوڑھیاں اس کے مفید صحت ہونے کی بڑی تعریفیں کرتی تھیں۔ مجھے کچھ شروع ہی سے ایسی غذاؤں سے بے رغبتی رہی ہے! ۔ خود ہمارے ہاں بھی ایک زمانے میں بھینس ہوتی تھی اور وہ بچے بھی دیتی تھی۔ ہماری والدہ محترمہ بڑے اہتمام سے کھیس

تیار کرتی تھیں اور ہمیں زبردستی کھلایا کرتی تھیں۔ وہ محبت سے سرشاری کے عالم میں خاطر کرتی تھیں، مگر ہم اس سے بھاگتے تھے۔ کم از کم کھا کر میرا تو جی متلا جاتا تھا، اب کھیس عام بنا کرتی ہے۔ اس کا تعلق اب گائے بھینس کے بچہ جننے سے نہیں رہ گیا ہے۔ مصنوعی کھیس آج ناشتے پر تھی۔ میں نے اسے مزے لے لے کر کھایا۔ ذرا بھی متلی نہ ہوئی۔ دراصل اب خالص غذاؤں کا زمانہ نہیں رہا ہے۔ انسان اب خالص کے تکلفات سے آزاد ہو چکا ہے۔ اسے بس ذائقہ چاہیے۔ ذائقے کے لیے مغرب نے مصنوعات کے ذریعہ سے ہر سامان کر دیا ہے۔ ہم حلال و حرام سب نوش جان کر لیتے ہیں۔ آج ہی کھانے پر ایک غیر ملکی پنیر تھا۔ اس کے بنانے میں سور سے حاصل کردہ رینٹ (rennet) ملائی جاتی ہے۔ ہم اس پنیر کو خاصے ذوق شوق سے کھاتے ہیں۔ پاکستان میں مغرب سے آئے ہوئے یہ پنیر خاصے مقبول ہیں۔ نظام شریعت جب پاکستان میں آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔ جب تک شریعت اسلامی دور ہے پنیر کو قریب رکھنے میں کوئی احتیاط ضروری نہیں ہے۔!

ہوٹل آذر بائیجان کے ڈائننگ ہال میں فن لینڈ سے سیاح آئے ہوئے ہیں۔ آج ان میں سے کسی کا "برتھ ڈے" ہے۔ مبارک باد کا دل چسپ ہنگامہ رہا۔

فن لینڈیوں کو دیکھ کر مجھے اپنا سفر فن لینڈ یاد آ گیا۔ یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر ار کامولا صاحب نے ترکو (فن لینڈ) میں "آرچی پلیچو" پر ایک عالمی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ یہ کانفرنس پانی کے جہاز پر تھی۔ ہم سب سات دن تک "کرسٹینا براہے" جہاز پر رہے۔ کانفرنس بھی جاری رہی اور فن لینڈ کے ہزار ہا جزائر میں سے چند اہم جزیروں کی سیر بھی کی۔ وہاں ایک ایسا جزیرہ بھی تھا جس کی سفید مٹی عمارتی سامان کے لیے نہایت اہم تھی۔ ہم نے دیکھا کہ سعودی عرب کے لیے یہاں ستون، کالم وغیرہ تیار ہو رہے ہیں۔ کانفرنس کے بعد ترکو سے میں بذریعہ ہوائی جہاز ہیلے سنکی (دارالحکومت) آ گیا۔ یہاں یونیورسٹی ہاسٹل میں قیام رہا۔ وہاں معلوم ہوا کہ جو اسکالرز یہاں آ کر تحقیقی کام کرتے ہیں ان کے اخراجات حکومت ادا کرتی ہے۔ مجھ سے ایک پیسہ نہ لیا۔ یہ بات میں نے پلے میں باندھ لی۔ اب میں بیت الحکمت

میں تحقیق کا کام کرنے والے ماہرین کے لیے ایسی سہولتیں دینے پر غور و فکر کر رہا ہوں!

ہاں ' یہ تو یاد ہی نہ رہا

روسی ہوائی جہازوں کی اڑان بڑی اعلا ہے - مگر یہ لوگ ناشتے اور کھانے وغیرہ کا زیادہ تکلف نہیں کرتے - اب صبح ساڑھے پانچ بجے ہوائی میدان پر بلا لیا اور پھر تاشقند سے باکو پہنچا دیا - ناشتا تو کیا چائے تک نہ دی!

روسی ہوائی جہازوں کی ایر ہوسٹیس مسافروں کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں مسکراتیں - بھئی نہ مسکراؤ اس سے کیا فرق پڑتا ہے - میری تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ پاکستان ایئر لائن اپنی ایئر ہوسٹسوں کو مسکرانے کی تربیت کیوں دیتے ہیں! بھئی مسکرانا ہوابازی کا کوئی جزولاینفک تو ہے نہیں - اب اگر آپ اس مسکراہٹ کی قیمت لینا چاہتے ہیں تو یہ بڑی زیادتی ہے - سنا ہے کہ پاکستان انٹر نیشنل ایئر لائنز ملکی (ڈومیسٹک) کرایوں میں اضافہ کرنے پر تلی ہوئی ہے - میری رائے ہے کہ پی - آئی - اے کو اندرون ملک پروازوں میں ناشتے ' کھانے کا تکلف ختم کردینا چاہیے اور ایئر ہوسٹسوں کی مسکراہٹ کو غیر ضروری قرار دے دینا چاہیے - بلکہ ان کو تخفیف کرایہ پر غور کرنا چاہیے - روس میں اندرون ملک پروازیں اس قدر کم کرائے پر چلائی جا رہی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے - پی آئی اے کراچی تا لاہور (ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز) کا کرایہ ہزاروں روپے لیتے ہیں - روس والے اسی قدر پرواز کا کرایہ چند روبل لیتے ہیں - یہ پی آئی اے کا چوتھائی کرایہ ہے - اب ذرا غور فرمائیے روس میں آخر ہوائی جہاز اڑ ہی رہے ہیں - ان کو کیسے پڑتا پھیلتا ہے - پی آئی اے میں کون سا حسن کا چاند لگ گیا ہے کہ وہ کرایہ پر کرایہ بڑھاتے چلے جائیں؟

سیر باکو

آج اتوار ہے - طے یہ پایا کہ تین بجے دن سے پانچ بجے شام تک باکو کی ایک سیر

کرلی جائے - کل سے انشاء اللہ سنجیدہ کام شروع کردیے جائیں گے - یہاں باکو میں سب سے زیادہ اہم شے جناب سرگے کروف کا مجسمہ ہے جو سی کے کنارے بنایا گیا ہے - ہیبت ناک حد تک یہ بڑا مجسمہ ہے - اس کی بلندی پچاس پچپن فیٹ تو ضرور ہوگی - یہ مجسمہ رات دن کسپین سی کی لہریں گن رہا ہے - مگر صحیح کہنا یہ ہے کہ کسپین سی کے مد و جزر پر نگاہ رکھے ہوئے ہے - سرگے کروف فاتح لینن گراد ہیں - انھوں نے آزادی کی حفاظت میں اپنی جان دی تھی - حکومت روس نے اپنے اس عظیم انسان کو ایسی عظمت دی ہے کہ اسے دنیا کا ہر وقت سامنا کرنے کے لیے بلندیوں پر استادہ کردیا ہے -

روس میں انسان کی قدر کا تصور عظمتوں اور رفعتوں کو چھوتا ہے۔ روس کے کسی شہر میں چلے جایے اس قدر کثرت سے یادگاریں اور مجسمے ملتے ہیں کہ روس کے ہر فرد بشر کو ہر وقت درس عظمت ملتا رہا ہے اور قدر انسان سے وہ ہمہ دم سرشار رہتے ہیں - سرگے کروف سے آگے بڑھے تو " باکو کوہسار " کی ایک یادگار دیکھی - یہ واقعہ ان چھبیس انسانوں کا ہے جن کو امپریل طاقتوں نے ہلاک کردیا تھا - ان ۲۶ کامریڈوں کی یاد میں یہ مجسمہ انسان بنایا گیا ہے جس کے سامنے رات دن شمع فروزاں رہتی ہے -

میں ابھی اس یادگار پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک نوبیاہتے دولھا دلہن کا جوڑا آیا - اس نے اس یادگار پر پھول چڑھائے - اس کے احترام میں ذرا دیر اپنے سانس بند کیے - نکاح کے بعد یہاں حاضری سے شادی کی رسوم مکمل ہوئیں - موسکو میں بھی جناب لینن کے مزار پر نوشادی شدہ جوڑے آتے رہتے ہیں -

دی اسٹیٹ اوف آذربائیجان کارپٹ میوزیم

ان دونوں یادگار مجسموں کو دیکھ کر میں نے اس ماحول کا جائزہ پیدل چل کر لیا - معلوم ہوا کہ یہاں ہی حکومت آذربائیجان کا قائم کردہ ایک کارپٹ میوزیم ہے - میں یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوا - دروازے پر دیکھا کہ آیات قرآنی کندہ

ہیں- مسجد ہے- ۱۳۱۸ ہجری میں تعمیر ہوئی ہے - اندر گیا تو سینکڑوں قالین آویزاں دیکھے- آذربائیجان کے قالین بڑی شہرت رکھتے ہیں - بہت سے قالین شعرائے ایران کے اشعار پر ان کی تصاویر کے ساتھ بنے ہیں -

یہ عمارت از اول تا آخر مسجد ہے - محراب و منبر بھی موجود ہیں - نہایت شاندار مسجد ہے - مگر آج باکو میں یہ مسجد قالین کا عجائب گھر بنی ہوئی ہے - سرگے کروف کے مجسمے پر کھڑے ہوکر دیکھیے تو کس ہیئن سی اور پورا شہر باکو سامنے آجاتا ہے - سعدیہ کو دور ایک گنبد و مینار دکھائی دیا - گائڈ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہاں یہ مسجد ہے- باکو میں ایسی ۳ مسجدیں ہیں - اب موقع ملا تو جاکر دیکھوں گا کہ یہ مسجد جس کا گنبد و مینار دیکھا ہے آباد ہے یا یہاں بھی کوئی میوزیم لگا ہے - میں گراں قلب اس مسجد سے باہر نکلا تو قریب ہی ایک عمارت کو غور سے دیکھا - یہ بھی مسجد ہے - آثار قدیمہ نے یہاں جو بورڈ لگایا ہے اس کی رو سے ۱۲ ویں صدی عیسوی کی یہ تعمیر ہے - سادہ چوکور مسجد ہے - بند ہے - اس کی چھت پر کوئی گھر آباد ہے - کپڑے سوکھ رہے ہیں - ذرا آگے بڑھا تو ایک چرچ بھی قریب بنا دیکھا - اس میں اب مے خانہ لگا ہوا ہے - ۱۲ویں صدی کی مسجد کے عین سامنے کاروان سرائے ہے اور ایک ترکش حمام بھی موجود ہے - اسی ماحول میں ۸۲ فیٹ بلند ایک ٹاور بھی موجود پایا - اس کا سن تعمیر معلوم نہ ہوسکا - بارے اس پر عبارات خط کوفی میں کندہ ہیں - ظاہر ہے کہ یہ اسلامی دور کا مینار ہے اور غالباً کس ہیئن سی سے اس کا کوئی مینارۂ نور کا تعلق ہوگا -

مجھے اندازہ نہیں ہے کہ شان دار مساجد میں قالین کے عجائب گھر قائم کرنا کس انداز فکر کا عکاس ہوتا ہے - اگر یہاں مسلمان اس سے غافل ہیں تو حکومت وقت کو تو غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے - یہ تو اسپین والا معاملہ ہے کہ وہاں مسجد اس وقت میوزیم بن چکی ہے یا کلیسا میں بدل گئی ہے یا پھر تاراج کر دی گئی ہے -

گلستان میں بہار آئی ہے!

باکو میں بھی انجمن دوستی ہماری میزبان ہے - اس انجمن دوستی کی طرف سے آج

شب گلستان ' میں آذر بائیجانی نغموں ' گانوں بجانوں میں شرکت کی دعوت تھی - تعارف سے میرے ذہن میں تصور یہی بنا کہ قدیم تہذیب و روایت کے مظاہر دیکھنے میں آئیں گے - مگر ایسا نہ تھا ' بلکہ آج کے آذر بائیجان کے رقص و سرود کے مظاہر یہاں دیکھنے میں آئے -

اول تو یہ جگہ ہی حیرت انگیز طور پر بڑی حیران کن ہے - بہت بڑی عمارت ' سنگ سفید سے مزین ' بہترین قالینوں سے آراستہ پیراستہ - گلستاں کے باہر موٹر کاروں کا ہجوم دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ اندر بہار گلستاں ہے - اندر داخل ہوئے تو منیجر نے استقبال کیا اور پھر اوپر گئے تو انجمن دوستی کے نائب سے شرف ملاقات حاصل ہوا - ان کے افسر رابطہ تو ہمارے ساتھ ہیں - موسکو سے آئے ہوئے ہمارے نگہ بان میزبان جناب گناوی صاحب بڑے خوش ہیں - سعدیہ اور میں حیران - بڑے بڑے آذر بائیجانی قالینوں سے آراستہ ہالوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے - اسے دیکھ کر حیرانیوں میں اضافہ ہوا - یہاں سیکڑوں میزیں لگی ہوئی ہیں اور ان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں - گلستاں میں بہار آئی ہے! سیکڑوں مرد و زن کھانے میں کم پینے میں زیادہ مصروف ہیں - نہایت نفیس برتن ہیں - میزوں پر بلوری گلاس جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں - ان میں رنگ برنگ کے مشروبات اچھل رہے ہیں - آب انار بھی ہے اور آب رنگ ترہ بھی - امریکی کولا مشروبات بھی ہیں اور آب معدنی آذر بائیجانی بھی موجود ہے -

خواتین و حضرات کے لباس ستھرے اور بھڑکیلے - ان کے حسین چہرے روشن - ماحول میں مسکراہٹیں بکھری ہوئی ہیں اور قہقہے پھیلے ہوئے - کشاں کشاں ہم اپنی میز پر پہنچ گئے - اپنی میز کا جائزہ لیا - یہاں بھی کیا نہیں ہے - اللہ کا دیا بہت کچھ ہے - آب انار ترش ' آب رنگترہ ' آب امریکی اور آب آذربائیجانی -

بہترین سیب اور سنگترے ' نفیس رسیلے اور میٹھے انگور - انگور کی بیٹیاں اور بیٹے بھی حاضر ہیں - ایک حسین قاب میں اپنی جان کھوئے ہوئے مرغ و ماہی - ان پر انار دانے بچھے ہوئے - مکھن اور پنیر - نان آذربائیجانی اور امریکی - مچھلی کے سنہرے و سیاہ انڈے .

کیوی یار ! باریک تراشی مچھلی کے ٹکڑے - جگر گاؤ کے قتلے - آذربائیجانی پلاؤ - یہ سب کچھ موجود - اس کے علاوہ جو مانگیں وہ حاضر -

کھانوں اور مشروبات کا جائزہ لینے کے بعد میں نے اس ہال کا بھرپور جائزہ لیا جہاں ہم بیٹھے ہیں - ہو نہ ہو پچیس تیس ہزار مربع فیٹ کا ہال ہے - کوئی ستون نہیں ہے فرش کا چپہ چپہ آذر بائیجانی قالینوں سے ڈھکا ہوا ہے اور چھت بجلی کے گول سفید ہنڈوں سے پٹی پڑی ہے - فرنیچر کو دیکھا تو بے نظیر پایا - کٹلری ' کراکری بے مثل - کھانا کھلانے والے نفیس لباسوں میں ہر طرف موجود اور مستعد -

اب نگاہ جاکر اسٹیج پر جم گئی ! یہ فلور ہے جہاں فلور شو ہونا ہے - میں نے دنیا میں بہت سے فلور شو دیکھے ہیں - پیرس کے نائٹ کلب بھی دیکھے ہیں اور لندن کے اوپیرا بھی دیکھے ہیں - امریکا اور کینیڈا میں بھی کلب دیکھے ہیں - اور موسکو میں بھی ایسے مقامات میں شرکت کی ہے - مگر باکو (آذربائیجان) کا یہ فلور اور یہ ہال اپنی نوعیت کا ایک ہی ہے - ارکیسٹرا ایک کونے میں ہے جہاں سے ہلکی دھنوں کی آوازیں کانوں میں موسیقی گھول رہی ہیں -

اتنے میں ایک گھنٹی بجی - ہال کے تمام قمقمے خاموش ہوگئے اور ارکیسٹرا کی دھن سخت تیز ہوگئی - رنگین سرچ لائٹس روشن ہوئیں اور اوپر ایک کونے پر مرکوز ہوگئیں - دیکھا کہ آسمان سے پریاں زمین پر اتر رہی ہیں - ارکیسٹرا کی بلند و بانگ دھنوں نے زمین پر ان پریوں کا استقبال کیا اور ہزار تالیوں نے ان کو خوش آمدید کہا - پریوں کے جسم نیم عریاں - جہاں جہاں لباس وہاں وہاں جب رنگ برنگ روشنیاں پڑتیں تو ہیرے اور لعل و جواہر جگمگا اٹھتے - آنکھیں خیرہ ہوجاتیں - اس پر جوش استقبال سے حسین و جمیل پریاں چمک اٹھیں - ان کے نازک جسم محو رقص ہوگئے - سازندے جوان ہوگئے اور گلوکار بیدار ہوگئے - رقص و سرود کا وہ ماحول پیدا ہوا کہ انگشت ہائے حیرت بدنداں ہوگئیں - حسین و جمیل شریک محفل عورتیں شرمندہ ہوگئیں ' پریوں کا حسن و جمال ان کو تڑپا گیا - اکل و شرب سب بھول گئے - عقلیں فروخت ہونے لگیں -

آسمان پریوں سے بھرا پڑا تھا - ایک جھرمٹ آتا تھا اور دوسرا جاتا تھا - ایک سے ایک حسین و جمیل ! خیام سے بے نیام ! مقصود سے بے قصور - ایک گھنٹہ پلک جھپکتے گزر گیا - آسمان سے پریاں اترتی رہیں اور پھڑپھڑاتی رہیں اور واپس جاتی رہیں - ان پریوں کی آمد پر روشنیاں چمکتی رہیں اور ان کے اڑجانے پر ارکیسٹرا کا دل دھڑکتا رہا -

اس خواب و خیال میں بہت سے لوگ مدہوش ہوچکے تھے - عورت اور مرد دخت رز سے سرشار ہوچکے تھے - خواتین بپھر چکی تھیں اور مرد بدحال - گلستاں کا فلور ان کے لیے خالی ہوگیا - روشنیاں پھر زندہ ہوگئیں - مرد و زن محو رقص ہوگئے - جوانیاں اور بڑھاپے بھی ٹکراتے دیکھے اور رعنائیاں نثار ہوتے دیکھیں - بوس و کنار سے جذبات کے شعلے بھڑکتے اور پھڑکتے رہے - ارکیسٹرا کی دھنیں بدلتی رہیں - لیلیٰ و مجنوں رقص و سرود سے نہال ہوتے رہے اور شیریں و فرہاد فدا ہوتے رہے -

سعدیہ اور میں بے تاب ہوگئے اور تاب نہ لا کر اٹھ گئے - میزبانوں سے بدقت رخصت ہوئے اور بہ خیریت ہوٹل آذربائیجان آگئے جہاں میدان حسن برپا تھا - شوروغل سے ماحول بھرا ہوا - مہمانوں سے ہال بھرا ہوا - بہ مشکل تمام لفٹ میں جگہ ملی - ہم دونوں باپ بیٹی اپنے کمرے میں آگئے اور دونوں ایک دوسرے سے سخت شرمندہ - زبانوں پر تالے لگ گئے - میں نے وضو کیا اور قبلہ رو کھڑا ہوگیا - ادھر سعدیہ سربسجود ہوگئیں اور ہم دونوں خاموشی سے لیٹ گئے اور سوگئے -

میں مسلمان ہوں !

گلستاں میں فلور شو جاری تھا - رقص و سرود کی گرمیوں سے دل پگھل رہے تھے - عظیم عورت کی حیا نگوں سار تھی - مرد کی انا بے نیام تھی - اتنے میں ایک مرد ناتواں جھومتا ہوا ہماری میز پر آیا - انجمن دوستی کے نائب اور ہمارے میزبان نے اس کا استقبال کیا - دونوں کے ہاتھوں میں جام تھے - وہ ٹکرائے - محبت و سرور نے ایک دوسرے کے بوسے لیے - پیمانے چھلک پڑے - میزبان نے ہمارا تعارف کرایا - مرد بے قرار نے ہمیں سلام کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں - جانتا ہوں کہ مسلمان

شراب نہیں پیتا - مگر میں آرٹسٹ ہوں اور پیتا ہوں!

میزبان نے بتایا کہ آذربائیجان کے یہ بڑے نام ور آرٹسٹ ہیں اور ساتھ ہی بلند مرتبہ اداکار ہیں - میں نے درد دل کے ساتھ داد دی - اس داد و تحسین پر ان کا چھلکا ہوا جام ہمارے میزبان نے پھر بھر دیا - اپنا بھی بھر لیا -

پلک جھپکی اور دونوں جام خالی ہوگئے! لوگ بلانوش ہوگئے -

میں مسلمان ہوں

میں مسلمان ہوں

یہ کہتا ہوا آذربائیجان کا آرٹسٹ اور اداکار کسی دوسری میز پر چلا گیا - میں سوچتا رہا کہ یہ آرٹسٹ مسلمان ہے - کیا اس نے مسجد کبیر میں لگا ہوا قالینوں کا میوزیم دیکھا ہے؟ کیا اس نے ۱۲ویں صدی عیسوی کی وہ مسجد دیکھی ہے جس کی چھت پر کپڑے سوکھ رہے ہیں؟ کیا اس نے وہ مینار دیکھا ہے جس پر خط کوفی میں اس کی تاریخ کندہ ہے؟ کیا اس نے لینن گراد کے جاں نثار سرگے کروف کے عظیم و رفیع مجسمے پر کھڑے ہو کر وہ گنبد و مینار دیکھے ہیں کہ جو خاموش ہیں؟

آذربائیجان

آذربائیجان سوویت سوشلسٹ ریپبلک روس میں بحیرہ کیس پین کے مغرب میں کوہ قاف میں واقع ہے - ناخی چیون آٹونومس ریپبلک اور ناگورنو کاراباخ آٹونومس ریجن بھی اسی ریپبلک میں واقع ہیں - اس کی آبادی چھ ملین اور سات لاکھ ہے اور اس کا صدر مقام باکو ہے -

کہا جاتا ہے کہ زرتشت آذربائیجان ہی میں پیدا ہوا تھا - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں سو برس عمر والے افراد کافی تعداد میں ہیں اگرچہ اوسط عمر ۶۷ برس ہے - ہر دس ہزار افراد میں ۳۹ کی عمر سو برس تک کی ہوتی ہے - محمود علیوازوف، شیر علی مسلموف اور مجید آگائیف ۱۵۶، ۱۶۷ اور ۱۴۷ برس کی عمریں پاکر مرے ہیں - خواتین میں گلبادام اللہ خیروفا ۱۵۰ برس کی عمر پاکر مری ہیں -

آذربائیجان کے بحیرہ کیس پین کا ساحل ۸۰۰ کیلو میٹر ہے - کوہ بازاریوزو ۴۴۶۶ میٹر بلند اور کوہ شاہ داغ ۴۲۴۳ میٹر بلند ہیں - آذربائیجان میں نباتات کی ۴۲۰۰ انواع اور حیوانات کی ۱۲۰۰۰ انواع پائی جاتی ہیں - یہاں پر گیارہ سرکاری رکھ (محفوظ جنگل) ۱۷۰،۰۰۰ ہیکٹیئر کے رقبے پر واقع ہیں -

چوں کہ آذربائیجان کے پہاڑ شمال کی سرد ہوا کو روک لیتے ہیں لہٰذا اس کی آب و ہوا شدید نہیں، اس لیے یہاں سالانہ ۵ لاکھ سے زیادہ سیاح آتے ہیں - بے شمار معدنی چشمے ہیں جن کے پانی کو صحت بخش سمجھا جاتا ہے -

یہاں کے باشندوں کی اکثریت ترک ہے جو آذری ترکی بولتے ہیں، لیکن روسی، جارجیائی اور آرمنی لوگ بھی رہتے ہیں - یہ آذری زبان روسی حروف تہجی (سریلیک) میں لکھی جاتی ہے -

قصبہ فزولی کے قریب آزیخ غار میں قدیم دور کی بستی دریافت ہوئی ہے - اپشیرون میں ۱۲۰۰ برس پہلے کی آبادی کے نشان ملتے ہیں - ہندستان کے کچھ زائرین (غالباً وہ پارسی ہوں گے) ایک گاؤں سوراخانی میں آکر اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کرتے ہیں - وہاں آتش کدے کے ساتھ کچھ پتھر کے کمرے بنے ہوئے ہیں جہاں وہ رہتے ہیں -

عرب آذربائیجان کو اران کہتے تھے - اس زمانے میں شہر بردہ کو ام البلاد کہا جاتا تھا - گنجہ بھی یہیں ہے جہاں نظامی گنجوی پیدا ہوئے تھے جن کی پانچ مثنویاں فارسی ادب کا انمول سرمایہ سمجھی جاتی ہیں - پرانے شہروں میں ایک اور شہر شیکی ریشم کی وجہ سے مشہور تھا -

پہلی صدی میں یہاں ہن اور خزر لوگ آئے اور یہاں کی اصلی آبادی میں جذب ہوگئے - کہا جاتا ہے کہ لفظ آذربائیجان' آذر بادگان کی ایک صورت ہے جس کے معنی ہیں آگ کا ملک - ساتویں سے ۱۰ویں صدی تک یہ علاقہ خلافت اسلامیہ میں شامل رہا - بابک جو ایک عوامی لیڈر تھا اس نے عربوں کے خلاف بیس برس تک بغاوت کی بالآخر وہ پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا -

۱۱ویں صدی میں یہ علاقہ سلجوقیوں کی عمل داری میں آیا۔ ۱۲ویں صدی میں یہاں شیروانی خاندان کی حکومت رہی۔ مشہور فارسی شاعر خاقانی شیروانی قابل ذکر ہے۔ ۱۴ویں صدی میں امیر تیمور نے اسے فتح کیا۔ ۱۵ویں صدی میں پھر شیروانی اقتدار میں آئے جن میں قراقویون لو اور اک قویون لو مشہور ہیں۔ ۱۶ویں صدی میں صفوی حکومت قائم ہوئی۔ صفوی بادشاہ کے امرا زیادہ تر آذر بائیجانی تھے۔ اس کے باڈی گارڈ بھی اسی علاقے کے تھے۔

۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی میں صفوی حکومت کے خلاف بغاوتیں ہوئیں اور خواتین کی کئی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ۱۸ویں صدی میں یہاں ترکی اور ایران کا اقتدار قائم ہوا۔ اوائل ۱۹ویں صدی میں شمالی آذر بائیجان پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ انقلاب روس کے بعد آذر بائیجان نے آزادی کا اعلان کیا، لیکن روسی افواج نے اسے فتح کرکے روس کی حکومت قائم کردی (۲۸ اپریل ۱۹۲۰ء)۔ ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو یہ علاقہ سوویت سوشلسٹ ریپبلک بن گیا۔

باکو میں تیل کے چشمے ہیں اور کئی صنعتی کارخانے۔ کئی دوسری جگہوں مثلاً داش کیسان، علی بیراملی، اشپانا کرٹ، سوم گیٹ وغیرہ میں بھی صنعتیں قائم کی گئی ہیں۔ دریائے کورا پر پن بجلی گھر بنایا گیا ہے۔

آذر بائیجان سے تیل، گیس، لوہا اور بکسائٹ نکلتا ہے۔ اس میں مویشی اور بھیڑوں کے فارم ہیں۔ فصلوں میں سبزیاں اور کپاس مشہور ہیں۔ ہر قسم کے پھل، مکئی، چاول اور تمباکو بھی پیدا ہوتا ہے۔ ریشم کے کیڑے بھی پالے جاتے ہیں۔ لوہے اور اسٹیل، ایلومینم، تیل کی صفائی، کیمیکل، لکڑی کے کام، عمارتی سامان، انجینئرنگ اور دھات، دھاگے اور کپڑے کے کارخانے ہیں۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۹ء - پیر

باکو - آذربائیجان

صبح نماز فجر ادا کی اور پھر ذرا دیر کے لیے آذربائیجان ہوٹل کمرا ۱۰۷ کی بالکنی میں بیٹھ گیا - میرے سامنے کسپین سی ہے - اس میں ماحول کی پرچھائیاں جھلک رہی ہیں - پانی میں موجیں بلک رہی ہیں - روشنیاں تھرک رہی ہیں اترا رہی ہیں - بڑی دیر تک میں اس حسین و جمیل منظر کو بیٹھا دیکھتا رہا - تصورات کی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی جب میں کسپین سی کے راستے ایران تک پہنچ گیا جہاں شاید دو ملیون آذربائیجانی رہتے ہیں - یہاں باکو میں کم ایرانی نہیں - شاید یہ وہ ایرانی ہیں جو ایران میں "انقلاب اسلامی" کی تاب نہ لا سکے اور ایران سے دربدر ہو کر ویران ہوگئے - ایران سے لاتعداد اہل علم و حکمت پریشان ہو کر یا موت کے خوف سے دنیا بھر میں پھیل گئے اور اپنے پیارے وطن واپس جانے کے لیے بے چین ہیں کہ جہاں اب انقلاب ہے اور نہ اسلام ہے - نہ حضرت امام خمینیؒ ہیں اور نہ ان کے تصورات ہیں- ایران ایران نہ رہا - روس کے زیر نگیں پانچ مسلم ریاستوں کی صف میں خاموشی سے آکر کھڑا ہوگیا-

ابھی سورج طلوع ہونے میں دیر ہے - دل چاہتا تھا کہ سورج کی اولین کرنیں جب سمندر کی لہروں پر پڑیں تو ان کی بے چینیوں کو دیکھوں اور ان سے پوچھوں کہ کیا تم آذربائیجان کے ماضی کے لیے بے چین ہو ؟ مگر یہ داستان غم سننے کی تاب خود مجھ میں نہیں ہے - میں اپنی میز پر آکر بیٹھ گیا - سوچتا رہا کہ آج آذربائیجان کی تاریخ کس انداز سے رقم ہو رہی ہے - آذربائیجان کا باکو دارالحکومت ہے جہاں میں آج ہوں - میں یہاں دیکھ رہا ہوں کہ اقدار ماضی کے نقوش تدریج کے ساتھ مٹ رہے ہیں اور ایک نئی تہذیب جنم لے رہی ہے - باکو کی تعمیر نو پر عصری ذہانت کی چھاپ ہے - قدیم آبادیاں بتدریج روپوش ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ بلند و بالا عمارات اپنا سر بلند کر رہی

ہیں - باکو کی نئی تاریخ لکھی جارہی ہے!

میں ذہنی طور پر ایسے انقلابات کا حامی نہیں ہوں کہ جو تاریخ کا ہر نقش قدیم مٹا کر رکھ دے - نقوش کہن کو تاریخ کے تسلسل کا عنوان ہونا اور رہنا چاہیے - باکو شہر میں یا کسی بھی اور شہرو قریہ میں نقوش کہن ہیں تو ان کی حفاظت عین اخلاق ہے اور تاریخی ذہانت ہے - شب گزشتہ باکو کا جو حصہ قدیم میں نے دیکھا ہے دیانت تاریخی اس کی متقاضی ہے کہ اس کی حفاظت کا سامان کیا جائے - اگر عبادت کے لیے عیسائی نہیں ہیں تو یہاں موجود چرچ کو میخانہ نہیں بنا دینا چاہیے - اگر عبادت کے لیے مسلمان نہیں ہیں تو مسجد کو قالین کا میوزیم بنا دینا تاریخی ثقافت نہیں ہو سکتی - اگر فکر کا انداز بدل لیا جائے تو یہ ویران کلیسا اور یہ غیر آباد مسجد بجائے خود داستان عبرت ہے - کاروان سرائے اگر ریستوراں بنادی گئی تو تاریخ کہاں رہی!

وسط ایشیا کی مسلم آبادی

جناب گورباچوف کے اقتدار میں آنے کے بعد روس کی کل پندرہ ریپبلکوں (صوبوں) میں سے نو صوبوں (لتھوانیا' اسٹونیا' لیٹ ویا' آذربائیجان' کازخستان' ازبکستان' ترکمانستان' کرغیزیا اور تاجکستان) میں ثقافتی' تہذیبی اور معاشی حقوق کے لیے مطالبات کا اظہار شروع ہوچکا ہے' اور بعض مقامات پر زبردست مظاہرے بھی ہورہے ہیں -

یہ مطالبات روس کے باہر سے کسی کے پٹی پڑھانے سے نہیں ہورہے بلکہ ان صوبوں کے یہ مقامی اور موروثی مسائل ہیں - سخت دباؤ کے زمانے میں ان کی آواز دبی ہوئی تھی - اب جبکہ کشادگی اور آزادی رائے کا زمانہ آیا تو یہ لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر اٹھے ہیں اور اپنی آواز بلند کررہے ہیں -

جہاں تک وسط ایشیا کی پانچ مسلم ریاستوں کا تعلق ہے' ان کا کیس دوسروں سے بالکل مختلف ہے - یہ وہ علاقہ ہے جہاں اسلام ساتویں صدی میں پہنچ گیا تھا اور ساتویں سے گیارھویں صدی تک یہ علاقہ (بخارا' سمرقند' خیوہ وغیرہ) تہذیب وترقی کے اعلا

مقام پر پہنچ گیا تھا - پھر چنگیز کے زمانے میں یہاں اتھل پتھل ہوئی لیکن ۱۴ ویں صدی میں پھر ترک باشندوں نے طاقت اور عروج حاصل کیا یہاں تک خود روس کے کئی علاقے ان کے باجگزار بن گئے - علمی اور ثقافتی لحاظ سے بھی بخارا' سمرقند' خیوہ وغیرہ موسکو تو کیا یورپ کے علمی مراکز سے بڑھ گئے تھے - ۱۶ ویں صدی اور ۱۷ ویں صدی میں یہاں امن وسکون رہا - پھر ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں روس میں توسیع سلطنت کا دور شروع ہوا اور ان پر رفتہ رفتہ روسی اقتدار قائم ہوگیا - ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے لے کر ۱۹۲۸ء تک ان میں آزادی کی جدوجہد جاری رہی بالاخر انھیں یونین میں شامل ہونا پڑا -

روس میں پہلے جو کچھ ہوا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں - لیکن جناب گورباچوف نے تو روس کی کایا ہی پلٹ دی ہے - ۱۹۸۵ء میں پیرسترائیکا' گلاس نوسٹ اور ڈیموکریٹائزیشن ایک خواب کی طرح ابھرے تھے - کسی کو یقین نہیں تھا کہ اختلاف رائے کے اظہار کا موقع بھی ملے گا - مگر اب وہ ملا ہے - کسی کو یقین نہ تھا کہ سیاسی قیدی رہا کردیے جائیں گے اور روس میں جہاں کمیونسٹ پارٹی کی زبردست حکمرانی ہے' دبدبہ اور خوف ہے' وہاں جنرل الیکشن ہوں گے' نجی املاک کی اجازت دی جائے گی اور مذہبی آزادی ملے گی - یہ سب کچھ وہاں ہوچکا ہے - روس میں عیسائیت کی ہزار سالہ تقریب منائی جاچکی ہے - یہ کام باہر کے کسی فرد یا جماعت نے نہیں کیا خود کمیونسٹ پارٹی کے روشن خیال ارکان نے کیا ہے -

اب تو جناب گورباچوف کھلم کھلا کہہ چکے ہیں کہ وہ عوام کی روحانی اقدار کا احترام کریں گے - اس صورت میں ہمیں توقع رکھنی چاہیے کہ سوویت روس کے عیسائیوں کو جتنی آزادی ملی ہے' اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آزادی وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کو ضرور ملے گی -

خود روس کے مجموعی حالات روسی مسلمانوں کے حق میں جارہے ہیں - روس میں سلاف اور دوسری نسلوں کی آبادی میں ۲ فی صد کی واقع ہوئی ہے جبکہ مسلم آبادی ۴۴ ملیون سے بڑھ کر ۶۰ - ۶۵ ملیون تک پہنچ گئی ہے - آبادی ایک بہت بڑی طاقت

ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عیسائیوں کے بارے میں روس پر یورپ اور امریکا کا خاصا دباؤ رہا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کی ثقافتی و تہذیبی آزادی کے حق میں نہ صرف مشرق وسطیٰ کے ممالک ہیں بلکہ دنیا کے ۴۲ مسلم ممالک ہیں۔ میری رائے میں روس کو ان تمام باتوں کا پورا پورا علم ہے۔ یورپ کے صرف دو تین ملک اس کے پڑوسی ہیں اور ان سب کی آبادی بھی کوئی زیادہ نہیں جبکہ ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان، کسی حد تک عراق اور ہندستان کے مسلمانوں کو ملا کر ۳۵-۴۰ کروڑ آبادی ہے۔ ان تمام ملکوں کے مسلمان عوام سے وسط ایشیا کے مسلمانوں کے تہذیبی، نسلی، ثقافتی اور تاریخی رشتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے مسلمان ملکوں سے روس کے خوش گوار تعلقات اس کی تقویت کا باعث ہوں گے۔ اس حقیقت کو دنیا کا کوئی ملک نظرانداز نہیں کرسکتا۔

خلیج سے روس کی دلچسپی

خلیج کا علاقہ ماضی میں یورپ اور امریکا کے اقتدار کے تحت رہا ہے اور جنگ عالم گیر دوم سے لے کر اب تک یورپ اور امریکا نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ روس کو خلیج میں عمل دخل حاصل ہو، لیکن جب موسکو کے ایک حالیہ اعلان میں یہ کہا گیا ہے کہ روس عراق اور ایران کے درمیان طویل متنازعہ امور کا اپنی سرپرستی میں تصفیہ کرانا چاہتا ہے تو حیرت اس بات پر ہے کہ امریکا اور یورپ نے کوئی ناخوش گوار رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

عشرہ ۱۹۶۰ء میں بھی روس ہندستان اور پاکستان کے درمیان اس قسم کی کامیاب ثالثی کراچکا ہے۔ اب روس کی پالیسی اور بین الاقوامی برادری میں اس کی تصویر خاصی بدل چکی ہے اور غالباً اسی وجہ سے اس نے یہ اقدام کیا ہے۔

عراق پہلے ہی سے روس کی طرف مائل تھا۔ ایران عراق جنگ کے زمانے میں روس سے اس کو اسلحہ اور گولہ بارود اور قرضہ جات ملتے رہے ہیں۔ ایران روس کو

شیطان کہتا رہا ہے، مگر حقیقت کا اس سے دور کوئی واسطہ نہیں۔ بارے اس طویل جنگ کے بعد روس اور ایران دوستی کی آزاد فضا قائم ہوئی ہے اور اب روس ایران میں حامی و مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

عراق اور ایران کا مسئلہ شط العرب پر الجھا ہوا ہے۔ عراق اس علاقے میں اپنا غلبہ چاہتا ہے جبکہ ایران مصر ہے کہ جنگ سے پہلے کی سرحدوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ یو این نے ان دونوں سے وقتی طور پر مختلف موقف اختیار کیا۔ یو این چاہتی ہے کہ دریائی گزرگاہ کو فوری طور پر کھول دیا جائے اور ایک لاکھ قیدیوں کا بھی فوری تبادلہ کیا جائے۔ اس کے بعد ان امور کے تصفیے پر بات چیت کی جائے۔

مشرق وسطیٰ کی بین الاقوامی سیاست اور ڈپلومیسی کے لحاظ سے بھی یہ ایک ناخوشگوار صورت حال ہے۔ کوئی ملک کھل کر نہ عراق اور نہ ایران کی تائید یا مدد کرسکتا ہے حالانکہ مشرق وسطیٰ کے تمام ملکوں کے ایران و عراق سے گہرے روابط رہے ہیں اور تمام ممالک یہ چاہتے ہیں کہ دونوں ملک سیاسی اور معاشی طور پر مستحکم ہوجائیں۔

روسی مسلمانوں پر پرسترائیکا کے اثرات

مملکت روس میں مسلمان زیادہ تر وسط ایشیائی ریپبلکوں یعنی ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، کرغیزیا اور کازخستان میں ہیں۔ اس کے علاوہ شمالی کوہ قاف، کوہ قاف پار (ماورائے قاف) اور روسی فیڈریشن یعنی یورپی حصے (تاتاریہ اور بشکیریا) اور دیگر علاقوں میں ہیں۔ دوسرے مذاہب کے پیرو کاروں کی طرح مسلمانوں کو بھی دستور کے مطابق آزادی ضمیر کا حق حاصل ہے۔

روس کے اکثر مسلمان اہل سنت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن آذربائیجان میں اہل شیعہ کی تعداد زیادہ ہے۔

روسی دستور اور مذہبی فرقوں کے بارے میں موجود قوانین کے مطابق سرکاری طور پر مذاہب کا اندراج نہیں ہوتا۔ تاہم مسلم تنظیموں کے اعداد وشمار کے مطابق

روس میں ۴۰ سے ۵۰ ملیون مسلمان ہیں اور ملک بھر میں کوئی ۱۲۰۰ مساجد ہیں - عام طور پر ہر مسجد کے لیے ۲ یا ۳ آدمیوں کا عملہ بھی ہوتا ہے -

مسلم انجمنوں اور مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا انتظام پانچ مسلم بورڈ کرتے ہیں :

(۱) وسطی ایشیا کا مسلم بورڈ' تاشقند (ازبکستان)

(۲) کازخستان کا مسلم بورڈ (الما اتا)

(۳) شمالی کوہ قاف کا مسلم بورڈ ماخاچ کالا

(۴) ماورائے قاف کا مسلم بورڈ' باکو (آذربائیجان) اور

(۵) روس کے یورپی حصے اور سائبیریا کا مسلم بورڈ' اوفا (بشکیریا)-

تمام مسلم بورڈوں کے سربراہ مفتی ہیں جنھیں مسلم برادری منتخب کرتی ہے لیکن ماورائے قاف کے سربراہ کو شیخ الاسلام کہا جاتا ہے - بورڈوں کی آئے دن کی سرگرمیوں میں قاضی شریک ہوتے ہیں -

مسلم بورڈوں کی ساخت اور شرائط قواعد کے مطابق مقرر ہیں - یہ قواعد مسلمانوں کی انجمنوں کے نمائندوں کی کنگرسوں میں بنائے اور منظور کیے جاتے ہیں - کنگرس میں مذہبی برادری کی سپریم باڈی ہوتی ہے - مسلم بورڈ عقائد سے متعلق مسائل کا فیصلہ قران کی روشنی میں کرتے ہیں - ان مسائل پر قاضیوں کی کونسل میں بحث و تمحیص ہوتی ہے - اماموں کی تربیت بھی بورڈوں کی ذمہ داری ہے جو درمیانہ اور اعلا مدارس میں ' اسلامک انسٹی ٹیوٹ تاشقند میں اور علاوہ ازیں غیر ملکی اسلامی یونیورسٹی میں دی جاتی ہے -

مسلم تعلیمی اداروں کے وسائل بھی بورڈ متعین کرتے ہیں - اسی طرح وہ ریٹائر ہونے والی دینی شخصیتوں کو پنشن دیتے ہیں اور اسلامی یادگاروں کی مرمت کا انتظام بھی کرتے ہیں -

مسلم بورڈ نشر و اشاعت کے بھی تمام کام کرتے ہیں - سب کے سب قرآن مجید چھپواتے ہیں - مثال کے طور پر ۱۹۸۹ء میں روس کے یورپی حصے کے مسلم بورڈ نے اپنی دو صد سالہ تقریب پر قرآن مجید کے پچاس ہزار نسخے چھاپے - اس کے علاوہ اس بورڈ

نے کیلنڈر اور نام ور علما کی دینی کتابیں اور مسلمانوں کی دیگر کتابیں اور مدارس اور اسلامی اسکولوں کی کتابیں چھپوائیں -

وسطی ایشیا کا مسلم بورڈ بھی خاصی تعداد میں قرآن مجید ' امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ کی کتابیں اور اسلامی کیلنڈر چھاپتا ہے - نصابی کتب اور مینوئل ' شریعت اور فقہ کی کتابیں تاشقند اور بخارا (ازبکستان) کے اسلامی تعلیمی اداروں میں چھاپی جاتی ہیں - انھی اداروں میں روس کے مختلف حصوں میں بیرونی ممالک کے طلبہ کو بھی تربیت دی جاتی ہے - وسط ایشیا کا مسلم بورڈ جرنل " مسلمز اوف دی سوویت ایسٹ " نکالتا ہے جو ازبک اور پانچ بیرونی زبانوں انگریزی ' فرانسیسی ' عربی ' دری اور فارسی میں پچاس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا ہے - یہ جرنل ۸۰ ملکوں میں بھیجا جاتا ہے - جہاں اس کی بڑی مانگ ہے - مسلم بورڈ ۱۹۹۰ء کے موسم خزاں میں امام ترمذیؒ کی ۱۲۰۰ ویں سال گرہ منانے کا اہتمام کر رہا ہے - اس موقع پر امام ترمذیؒ اور امام بخاریؒ کی تصانیف ' قران مجید کا ایک ایڈیشن اور دیگر اسلامی لٹریچر شائع کیا جائے گا -

ماورائے قاف (آذربائیجان) کا مسلم بورڈ بھی اشاعت کے وسیع پروگرام مرتب کرتا ہے چوں کہ آذربائیجان کے بیش تر مسلمان شیعہ ہیں اس لیے یہ بورڈ ان کے لیے دینی لٹریچر شائع کرتا ہے - جب سے باکو میں ایک مدرسہ قائم ہوا ہے جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ' اس وقت سے مسلم بورڈ نے اسلامی شریعت وغیرہ کے لیے معاون اشیا بھی طبع کی ہیں -

تمام مسلم بورڈوں کے بین الاقوامی تعلقات کے خود اپنے شعبے ہیں - ان کی مدد سے وہ ۶۰ سے بھی زیادہ ملکوں کے اسلامی مراکز اور تنظیموں سے وسیع تعلقات قائم کرتے ہیں - یہ شعبے سعودی عرب میں حج اور عراق اور ایران میں سالانہ سنی اور شیعہ مسلمانوں کی زیارت کا انتظام کرتے ہیں - حج اور زیارتوں کے دوران روسی مسلمانوں کے یہ نمائندے دوسرے ملکوں میں اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ پہلے سے قائم شدہ تعلقات میں اضافہ کرتے ہیں اور نئے روابط بھی قائم کرتے ہیں -

روس کی مسلم تنظیمیں بین الاقوامی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں جن

میں وفود اور لٹریچر کا تبادل اور غیر ملکی ہم مذہب لوگوں کو ہر قسم کی مدد دینا شامل ہے۔ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں بین الاقوامی، قومی اور علاقائی کانفرنسوں میں روسی مسلمانوں کے نمائندے سرگرم حصہ لیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی ممتاز تنظیموں مثلاً رابطہ عالم اسلامی سعودی عرب، رائل اکیڈمی برائے تحقیق تہذیب اسلامی اردن اور معتمر عالم اسلامی پاکستان کے کام میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ روسی مسلمانوں کے ممتاز لیڈر ان تنظیموں کے رکن ہیں۔ ان تمام باتوں سے روس کے مسلمانوں کے وقار میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۸۹ء میں روسی مسلمانوں نے بیرونی تحقیقی مراکز کی دعوت پر عراق اور لبیا کے دورے کیے جہاں انھوں نے دینی معاملات پر منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ مراکو، افغانستان اور ہندستان میں تفسیر کے روسی علما نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے اور پھر ملائشیا نے پہلی بار روس کے قاریوں کو مدعو کیا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں روس کی مسلم تنظیموں نے روس میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۹ء میں "روس میں اسلام" کے فوٹو میلے منعقد کیے گئے ہیں۔ اس قسم کی نمائشیں جن میں فوٹوؤں کے ساتھ اسلام پر روسی مطبوعات بھی رکھی گئیں مصر، شام، الجزائر، ایران، عراق، ترکی اور ہندستان میں منعقد ہوئیں۔

روس کے مسلم بورڈ باقاعدہ طور پر اسلامی کانفرنسیں منعقد کرتے رہتے ہیں جن میں وہ دوسرے ملکوں کے ممتاز اسکالروں کو مدعو کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۹ء میں روس کی یورپی ریپبلک کے مسلم بورڈ نے تاتاریہ اور بشکیریا میں دو صد سالہ تقریب کے موقع پر تقریبات میں اسلامی ممالک کے ممتاز شخصیتوں کو مدعو کیا تھا۔ ان کے علاوہ اسلامک لیگ، ورلڈ مسلم کنگرس، انٹرنیشنل اسلامک دعوہ سوسائٹی اور دیگر بڑی بڑی اسلامی تنظیموں اور اسلامک کانفرنس کو بھی مدعو کیا تھا۔ غیر ملکی مہمانوں میں اسلامی امور کے وزرا، کئی ملکوں کے مفتی اعظم اور شام، مصر، یمن عرب ریپبلک، پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک اوف یمن، افغانسان، کویت، لبیا، بلغاریہ، عراق، ترکی،

بنگلہ دیش، ہندستان، سعودی عرب اور دیگر ممالک کے اسلامی مراکز کی ممتاز شخصیتوں نے حصہ لیا تھا۔

روس کی مسلم تنظیمیں اسلامی دنیا کے لیے ۱۹۹۰ء میں ایک اور ممتاز تقریب منعقد کررہی ہے۔ یہ امام ترمذیؒ کی ۱۲۰۰ ویں سال گرہ ہے۔ امام ترمذیؒ نے جہاں زندگی بسر کی وہ جگہ موجودہ روسی وسط ایشیا میں واقع ہے۔ تمام دنیا کی مسلمان شخصیتوں، بین الاقوامی اسلامی تنظیموں اور قومی اسلامی تنظیموں کے قائدین کو اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی جا چکی ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے روس کی اسلامی تنظیمیں عالمی امن کے قیام میں سرگرم حصہ لے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ روسی مسلمان پبلک تنظیموں مثلاً دوستی اور ثقافتی تعلقات کی انجمنوں، سوویت امن کمیٹی اور سوویت ایفرو ایشین سالیڈیریٹی کمیٹی اور دیگر سوسائٹیوں کے ذریعہ سے قیام امن کے فروغ کے لیے کام کررہی ہیں۔

مسلم بورڈوں کے بعض ارکان سوویت فنڈ برائے امن، سوویت امن کمیٹی اور دیگر روسی تنظیموں کے بھی ممبر ہیں۔ یہ تمام ادارے کار خیر کے لیے خاصی رقوم تقسیم کرتے ہیں۔

روس کی معاشرتی زندگی کی تعمیر نو کا جو کام ہورہا ہے اس کے مذاہب اور مملکت کے تعلقات پر براہ راست اثرات مرتب ہورہے ہیں جس سے ان میں زیادہ لچک اور جمہوریت آرہی ہے۔ ملک کی مذہبی تنظیمیں اپنی مذہبی زندگی میں پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھا رہی ہیں، عبادت گاہوں کی تعداد بڑھ گئی ہے جن میں مساجد بھی شامل ہیں۔

ان حالات میں مسلم بورڈوں نے ملک کے اندر اور بین الاقوامی سطح پر اپنی سرگرمی میں اضافہ کردیا ہے۔ خاص طور پر مسلم تنظیمیں ایک ہفتہ وار جرنل نکالنے کا منصوبہ بنا رہی ہیں جس میں مذہبی برادریوں کی تازہ خبریں ہوں گی اور دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ اطلاعات کے تبادل کو فروغ حاصل ہوگا۔

مساجد اور مدارس کی واپسی

روس میں پیرسترائیکا کا آغاز ۱۹۸۵ء میں ہوا۔ اس وقت سے لے کر اب تک آہستہ آہستہ روسی مسلمانوں کی ثقافتی آزادی کے کئی اقدامات ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں کازخستان، آذربائیجان، اشخاباد، تاشقند، سمرقند، اورا تیوب اور الما اتا میں ۲۰۰ نئی مساجد آباد ہو چکی ہیں۔ زیزل کے مسلمانوں کو ایک سابقہ ضبط شدہ مسجد ستمبر ۱۹۸۸ء میں واپس دی گئی تھی۔ چنانچہ وہاں بھی نظام صلوٰۃ قائم ہو چکا ہے۔

۱۹۸۳ء میں روس کے یورپی سائبیری مسلم بورڈ کے چارج میں ۱۸۲ مساجد تھیں پیرسترائیکا کے بعد ان کی تعداد ۲۱۱ ہو گئی ہے۔ اس علاقے کے روایتی مسلم علاقوں (تاتاریہ، بشکیریہ، داغستان، کبر دینو۔ بلکیریہ) کے علاوہ موسکو، لینن گراڈ، وولگو گراڈ، کیوبی شیف، گورگی، اولیا نووسک، اور روستوف آن دا ڈان میں بھی مساجد آباد ہو گئی ہیں۔

سوویت حکومت اب مساجد، مدارس اور یادگار قسم کی اسلامی عمارتوں کی مرمت اور بحالی کے لیے فنڈ بھی مختص کر رہی ہے۔ مثلاً باکو میں بی بی ایبت کی مسجد حال ہی میں مسلمانوں کو واپس دی گئی ہے۔ اس کمپلیکس میں حضرت امام رضاؒ کی ہمشیرہ کا مزار واقع ہے۔ حال ہی میں کازخ قصبہ میں واقع حضرت احمد یسوی کا مقبرہ ترکستان کو واپس کیا گیا۔ یہ بارھویں صدی کی ایک بڑی تاریخی یادگار ہے۔

اسمبلیوں کے مسلمان نمائندے

پیرسترائیکا کے نافذ ہونے کے بعد سے روسی اسمبلیوں میں مسلمان مذہبی رہنما بھی بطور نمائندہ ارکان منتخب ہوئے ہیں جنہیں روس میں پیپلز ڈپٹیز (Peoples Deputies) کہا جاتا ہے۔

مسلمان انجمنیں

ایک اندازے کے مطابق اب مسلمان انجمنوں کی تعداد ۷۵۱ ہے۔ روسی راسخ

العقیدہ عیسائی انجمنوں کے بعد مسلمان انجمنوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

مذہبی رہ نماؤں کی تربیت

مسلمان مذہبی رہ نماؤں کی تربیت کے لیے دو ادارے ہیں :

(۱) اعلا مذہبی تعلیم کے لیے تاشقند میں امام بخاریؒ انسٹی ٹیوٹ موجود ہے۔

(۲) سکنڈری درجے کی مذہبی تعلیم کے لیے بخارا میں میر عرب مدرسہ ہے۔

پیرسترائیکا کے نفاذ سے پہلے ان مدارس کے طلبہ کی تعداد پر پابندی عائد تھی۔ اب یہ پابندی اٹھالی گئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میر عرب مدرسے کے لیے ایک نیا ہوسٹل بھی زیر تعمیر ہے۔

حالیہ تجاویز کے مطابق یورپی اور سائبیریا کی سوویت جمہوریت کا مسلم بورڈ (صدر مقام اوفا) ایک اور دینی مدرسہ اوفا میں کھولنے والا ہے۔ اسی طرح حال ہی میں قفقاز مسلم بورڈ نے باکو میں ایک نیا مدرسہ قائم کیا ہے۔

قران مجید اور تفاسیر

سوویت جمہوریہ ازبیکستان نے مارچ ۱۹۸۸ء میں قران مجید کا وہ نادر نسخہ مسلم برادری کو پیش کر دیا ہے جو حضرت عثمانؓ کا تھا اور جو کمیونسٹ دور میں ازبیکستان کے ایک میوزیم (تاشقند) میں رکھ دیا گیا تھا۔

حکومت سعودی عرب نے روسی مسلمانوں کے لیے دس لاکھ قران مجید کا عطیہ دیا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے توسط سے اس کی ایک کھیپ روس میں پہنچ چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے لیے چار ہوائی جہاز چارٹر کیے گئے۔ مزید نسخوں کو پہنچانے کے لیے ہوائی جہازوں کو مزید ۲۵ پروازیں کرنی پڑیں گی۔

حضرت امام ترمذیؒ کی ۱۲۰۰ ویں سالگرہ کے موقع پر جو اگلی گرمیوں میں وسط ایشیا میں منعقد ہوگی، قرآن مجید اور تفسیر خود روس ہی میں شائع کی جائے گی۔

روس کے یورپی اور سائبیریا حصے میں جس کا صدر مقام موسکو ہے، اسلام کی آمد

کی ۱۱۰۰ویں سالگرہ اور اسی حصے میں مسلم بورڈ کے قیام کی ۲۰۰ ویں سالگرہ ۱۹۸۹ء میں منائی گی۔

روسی مسلمانوں میں جمہوری اقدار کا احیا

۳ فروری ۱۹۸۹ء کو بروز جمعہ تلاشیخ جامع مسجد تاشقند میں مسلمانوں کی ایک جماعت نے مطالبہ کیا کہ جناب مفتی شمس الدین خان ابن باب خان چیرمین وسط ایشیا مسلم بورڈ اپنے عہدے سے مستعفی ہوجائیں کیوں کہ انھوں نے اپنے فرائض تسلی بخش طریقے سے سرانجام نہیں دیے۔ ۶۔ فروری ۱۹۸۹ کو جناب مفتی صاحب نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔

۱۹۸۶ء میں باکو میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کا عنوان تھا "امن کے لیے مسلمانوں کی جدو جہد" اس میں مدعوئین میں سے ۹۰ فی صد ارباب علم و دانش نے شرکت کی۔

اس سے پہلے ۱۹۸۲ء میں موسکو میں "ایٹمی ہلاکت سے انسانی زندگی محفوظ کرنے کے لیے "مذہبی کارکنوں کی مساعی" منعقد ہوچکی تھی۔ ۱۹۸۷ء میں "ایٹمی طاقت سے پاک دنیا" کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔

ان عالمی موضوعات میں اقدام کرنے کے علاوہ، روسی مسلمانوں نے عراق۔ ایران جنگ میں فریقین کو جنگ بند کرنے کا بار بار مشورہ دیا۔

ترکستان میں اسلامک ڈیموکریٹک پارٹی کا قیام

پیرسترائیکا کے طفیل روس میں سیاسی طورپر آزادی اظہار اور مذہبی طور پر آزادی عقیدہ اور شناخت کا دستوری اور قانونی عمل مکمل ہوچکا ہے۔ ترکمان کی مسلم جمہوریتوں میں کھوئی ہوئی شناخت کی بازیافت کی زبردست لہر آئی ہوئی ہے۔ اگست ۱۹۹۰ء میں ایک ایسا اقدام ہوا جس کی روس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ تاشقند سے ۱۴۰ میل مشرق میں شہر نامان گان میں پانچوں مسلم روسی جمہوریتوں (کازخستان، تاجکستان،

کرغیزیا، ترکمانیہ اور ازبیکستان) کے ۳۰۰۰ نمائندوں نے ایک کنونشن میں شرکت کی اور اسلامک ڈیموکریٹک پارٹی قائم کرنے کا اعلان ہوا۔ مقامی حکام نے اس میں حیرت انگیز طور پر کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ مقامی ریڈیو پر اس اجلاس کی روداد بھی سنائی گی۔

اس نئی پارٹی کے چیرمین ازبک موسیقار وادا خان حسنوف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایرانی انقلاب نے ہمارے لیے راستہ کھولا ہے۔ اس سے پہلے ایک اور جانب سے یہ بیان بھی آچکا ہے کہ صدر پاکستان محمد ضیاء الحق نے ہمارے لیے راستہ کھولا ہے۔ اس پارٹی کا مطالبہ ہے کہ مسلم جمہوریتوں میں اسلامی قانون رائج کیا جائے۔ ۵۰ سالہ حسنوف نے کہا ہم آزادی اور اسلام چاہتے ہیں۔ آزادی سے ہماری مراد سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر ایک مکمل طور پر آزاد مملکت ہے۔ وہ تشدد کے حامی نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان پانچ روسی اسلامی جمہوریتوں کو روایتی نام "ترکستان" دیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے سامنے دو اہم اور مشکل مسائل ہیں: اول تمام مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنا اور اس کے لیے ہم طاقت کے ذریعہ سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے حق میں نہیں۔ دوسرے ہم اپنی نئی نسل کو اسلامی روح کے مطابق تعلیم دینا چاہتے ہیں۔

جناب حسنوف نے کہا کہ پارٹی ایسے امیدواروں کو نامزد کر کے پلیٹ فارم مہیا کرے گی جو روسی قانون کے بجائے اسلامی قانون لائیں گے۔ روسی شراب ووڈ کا اور دیگر نشی مشروبات کو ممنوع قرار دیں گے۔

ترکستان کی پانچ مسلم جمہوریتوں کو گزشتہ ۷۰ برس میں رفتہ رفتہ روسی کالونیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دس فی صد یا اس سے کم و بیش روسیوں کو ان علاقوں میں بسایا گیا۔ انھیں دوسروں سے بہتر مراعات دی گئیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ روسی ترکستان کے مسلمانوں کو دنیائے اسلام سے منقطع کرنے کے لیے ان پر روسی زبان ٹھونس دی گئی۔ اس طرح وہ نصف صدی کے اندر دنیائے اسلام سے کٹ کر رہ گئے۔ کالونیاں قائم کرنے اور روسی زبان ٹھونسنے

کے خلاف اگرچہ روسی مسلموں کے اندر رنج اور غصے کے جذبات موجود رہے ہیں لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرسکتے تھے۔ اب حالات بدل رہے ہیں۔ روسی نوآباد کاروں نے یہ محسوس کرلیا ہے کہ اب وہ معاشرے سے کٹ گئے ہیں۔ موسکو کے لیبر اخبار ترود نے تو یہ رپورٹ دی ہے کہ ۲۳۰۰۰ روسی دوشنبہ کو چھوڑ چکے ہیں اور یہ تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے۔

ستر سالہ جبرو تشدد کے دور میں بھی جب کہ حکومت کی یہ پالیسی تھی کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ مسلمان اسلام کو بھول جائیں' یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ان لوگوں نے خفیہ طور پر اپنے عقیدے اور اسلامی رسم و رواج کو زندہ رکھا۔ خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ روسیوں سے بالکل خلط ملط نہیں ہوئے اور نہ ان سے ازدواجی رشتے کیے۔ یورپ میں مذہبی آزادی ہوتے ہوئے لوگ اپنے عقیدے سے منحرف ہوچکے ہیں جب کہ مسلمانوں نے غلامی میں بھی اسلام سے اپنا رشتہ نہیں چھوڑا۔

مہمان داری

انجمن دوستی کی مہمان داری اپنی معراج پر ہے۔ قدم قدم پر احترام و تواضع کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ موسکو ہو یا تاشقند اور اب باکو' ہر جگہ کارکنان کا مزاج یکساں ہے۔ ہر ایک انسان دوست ہے۔ خلوص کے ساتھ سلوک ہو رہا ہے۔ ناشتہ' ظہرانہ' عشائیہ تو اپنی جگہ ہیں' جہاں جہاں گئے ہیں تواضع دل کھول کر ہوئی ہے۔ مجھے خاص طور پر اپنے نظام ہضم کا استوار رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ لذائذ تو خیر میری کم زوری نہیں' مگر پاس خاطر میری ادا ہے۔ میں محبت کا جواب محبت سے دینا چاہتا ہوں۔ تواضع کی یہ فراوانیاں اپنے اندر خلوص رکھتی ہیں۔ اگر میں اکل و شرب سے گریزاں رہوں تو میزبان کی دل شکنی ہوگی۔ اگر ایسا انتظام ہو جاتا تو اچھا ہوتا کہ دکھانے کو منھ چلاتے رہے اور کھانا جھولی میں ڈالتے رہے اور گھر لے آئے!

ناشتے کی میز پر سعدیہ چائے نوش جاں کر رہی تھیں' میں آلوچوں کا جوس نذر

معدہ کر رہا تھا اور ہمارے آذر بائیجانی موسکوی نگہ بان بھرپور ناشتے سے مستفید ہو رہے تھے کہ اطلاع آئی کہ سربراہ آذر بائیجان ۱۱ بجے ہمارا انتظار کریں گے۔ پروگرام سب کے سب بدل گئے۔ میرے میزبانوں کو توقع نہ تھی کہ مجھے قصر بلند میں یاد فرمایا جائے گا!

جناب محترم عبدالرحمان وزیروف

جناب وزیروف پاکستان میں روس کے نہایت مستعد' متحرک اور کام یاب سفیر رہے ہیں۔ میں ان کو مسکراتا سفیر کہا کرتا تھا۔ فطری طور پر ان میں بے تکلفی ہے' دل صاف رکھتے ہیں' کپٹ کا دور دور کوئی وجود نہیں۔ ان کو منافقت نہیں آتی۔ جو بات کہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ جب تک پاکستان میں رہے تکلفات سے بے نیاز رہے۔ جو دل میں آیا اسے صاف کہہ دیا۔ ان کی سفارت سیاست حسنہ کی آئینہ دار رہی ہے۔ وزیروف صاحب کی بے تکلفی کو بر بنائے طاقت کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ وہ اپنے ملک کے مفادات کو ضرور اولیت دیتے رہے ہیں۔ مگر ان کی نگاہ سے پاکستان کے مفادات بھی اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ اس قدر ان کا کردار ضرور ہے کہ وہ صاف گو رہے ہیں۔ یہ وزیروف صاحب کی خوبی ہے کہ پاکستان کا صدر اور وزیراعظم ان کے گھر جاتا تھا اور استمزاج کرتا تھا۔ اور یہ وزیروف صاحب کا مزاج ہے کہ انھوں نے کبھی مجھے اپنے پاس نہ بلایا' ہمدرد منزل مجھ سے ملنے آتے رہے اور پاکستان کی خفیہ پولیس اور امریکا کی نگراں جماعت کے لیے مسائل پیدا کرتے رہے۔ وہ ہمدرد منزل آئے تو پاکستانی اور امریکی خفیہ پولیس نے ہمدرد منزل کو گھیر لیا!

میں نے جناب عبدالرحمان وزیروف صاحب سے کبھی کوئی سیاسی گفتگو نہیں کی۔ ہم دونوں اس حقیقت کو اہمیت دیتے تھے کہ روس اور پاکستان کے روابط علمی سطح پر ہونے چاہیں اور سیاست کی اکھاڑ پچھاڑ کو کمزور پاکستان کے لیے ذریعہ ملاقات نہیں بنانا چاہیے۔ وزیروف صاحب میرے مزاج سے آشنا تھے' اس لیے میرے ان کے مابین علمی گفت گو ہی ہوتی تھی' گو وہ بڑے گہرے سیاست داں ہیں۔

اسلام آباد میں وزیروف صاحب نے روس پاکستان سفارتی تعلقات کے قیام کا جشن منایا ۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا ۔ میں پشاور میں تھا ۔ جناب وزیروف صاحب نے ٹیلے فون کیا کہ مجھے اس تقریب میں ضرور شریک ہونا چاہیے ۔ انھوں ہی نے بتایا کہ صدر پاکستان عالی مرتبت جنرل محمد ضیاء الحق بھی شرکت کریں گے اور یہ بھی بتایا کہ سفارت خانہ روس میں مغرب کی نماز بھی ہوگی ۔ ضیاء الحق صاحب اسی شرط پر آرہے ہیں کہ روزہ افطار کرنے کے بعد نماز مغرب کا اہتمام کیا جائے ۔ میں نے اس تقریب میں شرکت کی تھی ۔ میں نے محسوس کیا کہ جنرل صاحب کو یہاں میری موجودگی پر حیرت سی ہوئی تھی ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وزیروف صاحب کا ہمدرد منزل آنا ان کے علم میں نہیں لایا گیا تھا بلکہ خفیہ پولیس اپنے طور پر میرے خلاف کیس تیار کر رہی ہوگی ۔ اس تقریب میں خان عبدالولی خاں اور بیگم نسیم ولی خاں صاحبہ بھی شریک ہوئی تھیں ۔ میں ان دونوں سے قریب ہوگیا جسے جنرل صاحب نے غور سے نوٹ کیا۔

جناب محترم ولی خاں صاحب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے دوست نہیں ہیں ۔ ان کا رجحان روس دوستی کی طرف ہے ' اور وہ روس کے دوست ہیں اور پاکستان روس تعلقات کے حامی ہیں ۔ میں اس موضوع پر بات کرنے کا اہل نہیں ہوں مگر میرے دل میں ولی خاں صاحب کی قدر و منزلت اس لیے ہے کہ وہ منافق نہیں ہیں ۔ انھوں نے اقتدار کے لیے اپنے فکر و نظر میں کبھی تبدیلی نہیں کی ہے ۔ اس طرح ان کی دیانت داری شبہ سے بالاتر رہی ہے ۔ میرے اور ان کے مابین دوستانہ روابط ہیں ۔ ایک زمانہ تھا کہ میں نے شہید جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جناب ولی خاں صاحب سے تبادل خیال کریں اور ان کے انداز فکر اور ان کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کو پاکستان دوست بنانے کی کوشش فرمائیں ۔ اس باب میں اپنی خدمات میں نے پیش کی تھیں ۔ جنرل صاحب نے اصولاً میری بات مانی تھی ۔ ایوان صدر میں وہ احترام کے ساتھ جناب ولی خاں صاحب کو مدعو فرماتے تھے اور ولی خاں صاحب محترم شرکت فرماتے تھے ۔

ایک بار سردار داؤد خاں صاحب صدر اور وزیر اعظم افغانستان ایوان صدر

پاکستان میں مدعو تھے ۔ میں بھی تھا ۔ جناب محترم ولی خاں صاحب نے بھی شرکت فرمائی تھی ۔ جب پروٹوکول نے سردار داؤد خاں صاحب سے میرا تعارف کرایا تو سردار داؤد خاں صاحب نے فرمایا ' " میں حکیم صاحب کو جانتا ہوں ' ان کا مجھ سے تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے " ۔ ولی خاں صاحب اور میں جب بھی قریب رہے ۔ مجھے بعد میں یہ معلوم ہوا کہ جناب جنرل صاحب نے جناب ولی خاں صاحب سے گفت گو کے لیے جناب محترم محمد علی صاحب کو بھیجا ۔ وہ بے چارے ولی باغ تک پہنچ ہی نہ سکے ۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ گیارہ بجنے میں ابھی دس منٹ تھے کہ ہم ایوان صدر پہنچ گئے اور پروٹوکول نے پورے احترامات کے ساتھ مجھے اور سعدیہ کو جناب محترم عبدالرحمان وزیروف صاحب کے دفتر میں پہنچا دیا ۔ وہ میرے منتظر تھے ۔ بڑی بے تکلفی کے ساتھ بغل گیر ہوئے ۔ وہ آذر بائیجان اور آرمینیا کے سربراہ کل ہیں ۔ ان کا اقتدار معزز ہے ۔ ان کا مرتبہ بلند تر ہے ۔ وہ اب اقتدار روس میں شریک ہیں ۔ مگر ان کی میری ملاقات آج حسب سابق ہی ہوئی کہ ان کو اپنی برتری کا کوئی احساس تھا نہ مزاج میں کوئی طمطراق ۔ وہ سیدھے سادے عبدالرحمان وزیروف ہی تھے ۔

میں ان کے ساتھ پندرہ بیس منٹ رہا ۔ یاجوج ماجوج بھی ساتھ تھے اور کاغذ و قلم نکالے تیار بیٹھے تھے ۔ دوران ملاقات جناب نبی خضری صاحب بھی آکر شریک ہوگئے ۔ نبی خضری آذر بائیجان انجمن دوستی کے صدر ہیں ۔ آذربائیجان سوشلسٹ ری پبلک کے نائب ہیں ۔ اچھے شاعر ہیں اور روس کے انعام یافتہ ہیں ۔

میں نے جناب وزیروف صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ ابن سینا انعام کی تحریک ان کے زمانے میں ہوئی تھی اور اس لیے موخر ہوئی کہ حکیم عبدالحمید ابن سینا انعام لے چکے تھے ۔ اب فوراً ہی ان کے بھائی کو یہ انعام دینا قبل از وقت تھا ۔ خیر یہ اب مجھے مل گیا ہے ۔ وزیروف صاحب نے مجھے مبارک باد دی ۔ میں نے ان کو پاکستان آنے اور اپنے بے اندازہ دوستوں سے ملنے کی دعوت دی ۔ کہتے تھے کہ دل بہت چاہتا

ہے۔ وزیروف صاحب نے بتایا کہ تابانی صاحب کا پیغام آیا ہے کہ وہ باکو آنا چاہتے ہیں ۔ وزیروف صاحب نے ان کے لیے انتظامات کر دیے ہیں ۔ میں نے ان کا مزید شکریہ ادا کیا کہ روس میں ہر جگہ میرا شاہانہ استقبال ہو رہا ہے ' حالانکہ میں اچھا خاصا سادہ سودا انسان ہوں ۔ غالباً ان کو یہ معلوم تھا کہ میں نے ہر جگہ دو کمرے لینے سے انکار کیا ہے اور ہم بیٹی باپ نے ایک کمرا لینے اور اس میں رہنے کا فیصلہ کیا ' "

ہاں میں جانتا ہوں ' مگر ہمارے فرائض بھی ہیں ! "

ہاں یہ تو بتائیے سندھ کا گورنر کون ہے ؟

ان دنوں فخرالدین جی ابراہیم سابق جج سپریم کورٹ ہیں ۔

وزیروف ہنسے ۔ میں نے اضافہ کیا ' مجھے بھی دو بار یہ عہدہ جلیلہ پیش کیا گیا ۔ مگر میں اب **مدینتہ الحکمتہ** بنا رہا ہوں ۔ ان فضول کاموں کے لیے میرے پاس اب وقت نہیں ہے ۔

میں نے ملاقات کے اختتام پر جناب وزیروف صاحب کو ایک طرف لے جا کر کان میں ایک بات کی ۔ انھوں نے میری بات کی تائید کی مگر مصروفیتوں کی مشکلات بتائیں ۔ پھر بھی کہا کہ میں اس کی اہمیت کو جانتا ہوں ' اپنے ذہن میں رکھوں گا ۔

آپ موسکو پہنچ ہی رہے ہیں !

میری کانا پھوسی یاجوجوں ' ماجوجوں کو شاید ہی بھائی ہو ! آخر میں میں نے ہدیہ کے طور پر کچھ کتابیں جناب عبدالرحمان وزیروف صاحب کی خدمت میں پیش کیں ۔ بنارسی اور اونی اسٹول بھی دیے ۔ **مدینتہ الحکمتہ** کا کرسٹ (نشان) مرتب کر کے ان کی میز پر رکھ دیا اور ان سے کہہ دیا کہ اسے یہاں رکھا رہنے دیجیے گا ۔

کیمرے کی مرمت

افشانہ ' بخارا ' میں مولد ابن سینا میں کیمرا خراب ہو گیا اور بڑی ذہنی کوفت اور کلفت ہوئی ۔ آج بھی صبح جناب وزیروف صاحب کے پاس جانے کے وقت تک اس کا مرض معلوم نہ ہو سکا ۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں ایک ماہر کے پاس بغرض علاج اپنا

کیمرا لے گیا ۔ اس نے نہایت مہارت سے اسے دیکھا اور دو منٹ بعد میرے حوالے کر دیا ۔

"۔۔ اس کے سیل (بیٹری) خراب ہیں ۔ کیمرا بالکل درست ہے ۔ روسی سیل اس میں کارآمد نہیں ہوں گے ۔ وہ نہ ڈالیے گا ۔۔ "

یاد آیا میں سال گزشتہ ویانا (اوسٹریا) میں تھا ۔ وہاں بھی اسی کیمرے کے سیل خریدنے گیا ۔ دکان دار نے نئے سیل نکالے ۔ مگر مجھے دینے سے قبل اپنی ایک مشین پر ان کی طاقت کو جانچا اور پھر یہ سیل میرے کیمرے میں ڈالے ۔ میں نئے امریکی سیل کراچی سے لایا ہوں ۔ فروخت کنندہ نے بغیر چیک کیے مجھے یہ دیدیے ۔ یہاں معلوم ہوا کہ وہ کمزور ہیں ۔ اگر پاکستان کا دکان دار ویانا کے دکان دار کی طرح محتاط ہوتا تو مجھے ابن سینا میوزیم کی تصاویر نہ لے سکنے کا غم نہ ہوتا ۔ نئے توشیبا سیل باکو کی مارکیٹ میں بہ مشکل ملے ۔ وہ تو میرے ساتھ جو کار ڈرائیور ہے اس نے بتایا کہ فلاں روڈ پر فلاں اسٹور میں دوسری منزل میں جاپانی سیل ہیں ۔ جوڑا ہے ۔ قیمت دس روبل ہے ۔ ہم اس کی نشان دہی پر گئے ۔ توشیبا سیل دس روبل کے مل گئے !

آذربائیجان سوویت سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں ۔ انجمن دوستی ۔۔ پاکستان روس مشاعرہ

یہاں جناب محترم نبی خضری صاحب سے میں نے تفصیلی بات چیت کی ۔ ان کی میزبانی کا شکریہ ادا کیا ۔ یہاں تبادل خیال میں میں نے بتایا کہ ۴ ر نومبر ۱۹۸۹ء کو میں نے کراچی میں ایوان دوستی میں اپنی تقریر کے دوران یہ تجویز رکھی ہے کہ کراچی میں ایک " پاکستان روس مشاعرہ " ہونا چاہیے ۔ جناب نبی خضری دین اسلام پر ہنوز قائم ہیں ' خود بھی بلند مرتبہ شاعر ہیں ۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ آذربائیجان سے شعرا کو مدعو کیا جائے ۔ میں نے مشورہ دیا کہ آذربائیجان ' ازبکستان اور تاجیکستان سے تین تین شعرا لیے جائیں ۔ نو دس ہوئے ۔ اسی قدر پاکستان سے بھی ہوں ۔ مشاعرے کے ساتھ ہی اگر ایک آدھ کانفرنس ادبیات روس پر ہوجائے تو اچھا ہے ۔ روس اور

پاکستان کو ادبی میدان میں تعاون کی راہ اختیار کرنی چاہیے ۔ اصولی طور پر اس تجویز سے اتفاق رائے ہوگیا ہے ۔

کاروان سرائے

باکو میں دور ماضی میں مساجد کے ساتھ کاروان سرائے قائم کرنے کا رواج تھا۔ جہاں جہاں مساجد ہیں وہاں کاروان سرائے موجود ہیں ۔ ان کاروان سرائے میں اب ریستوراں وغیرہ قائم ہوگئے ہیں ۔ آج آذربائیجان انجمن دوستی نے ایک کاروان سرائے میں ہمارے لیے ظہرانے کا انتظام کیا تھا۔ نہایت پر تکلف کھانا تھا۔ یہاں بسم اللہ سے کھانا شروع ہوا۔ گفت گو میں انشاء اللہ وغیرہ بھی استعمال ہوئے ۔ باکو میں خدا حافظ کا استعمال جاری ہے۔ جناب نبی خضری صاحب کا میں نے تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

وزیر صحت آذربائیجان

تین بجے جناب محترم طلعت قاسموف ہمارے منتظر تھے ۔ ان کے دفتر میں ان سے سوا گھنٹے تبادل خیال ہوا ۔

چند نکات :

☆ سب سے پہلے آذربائیجان میں ملنے والی نباتات کا سروے کرانا چاہیے ۔ یہاں جو بڑی بوڑھیاں ہیں ان کو تحقیق اور پہچان میں شریک کرنا چاہیے ۔

☆ نباتات جو مل جائیں ان سے ایک کتاب مرتب کرنی چاہیے ۔

☆ سائنس داں کو کیمیائی تجزیے کے لیے تیار کرنا چاہیے ۔

☆ بالآخر فارماکولوجی کا اہتمام کرنا چاہیے ۔

☆ ہمدرد پاکستان نے مرکبات وغیرہ کی فہرست فراہم کرے گا۔ نیز کویت اور سعودی عرب کے نباتات کی کتابیں نمونے کے طور پر فراہم کرے گا۔

☆ دواسازی میں ہمدرد پوری "نو ہاؤ" دے گا' نیز حسب ضرورت مشینری پاکستان

سے فراہم کی جا سکے گی ۔

☆ ہمدرد اور وزارت صحت آذربائیجان کے مابین تعاون پر غور ہوگا ۔

☆ وزارت صحت آذربائیجان اپنے ہاں کی نباتات کے نمونے ہمدرد کو فراہم کرے گا ۔ ہوسکتا ہے کہ ہمدرد ان کی درآمد پر غور کرے ۔ مگر مشورہ یہ ہے کہ ان مفردات کو آذربائیجان کے لیے استعمال کیا جائے ۔

☆ وزارت صحت آذربائیجان کو ہمدرد کی طرف سے لیبورٹریوں وغیرہ کے قیام کے لیے مہارت فراہم کی جا سکے گی ۔

کیمیائی دواؤں سے فرار

یہ ایک نہایت دل چسپ بات ہے کہ تاشقند اور باکو میں تبادل خیال میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ ان علاقوں میں کیمیائی دواؤں سے فرار بہ شدت موجود ہے ' اور یہاں نباتات پر زیادہ سے زیادہ توجہ ہے ۔ وزیر صحت ازبکستان اور وزیر صحت آذربائیجان سے ملاقاتوں میں اس انداز فکر کی پوری تائید ہوئی ہے ۔ مجھے اندازہ نہیں ہے "یورپی روس" میں فکر کا انداز کیا ہے ' مگر "مسلمان روس" نباتات کی حمایت میں پیش پیش ہے ۔ میں نے اس صورت حال کو دل چسپی کے ساتھ دیکھا ہے اور اس پر بھی غور کیا ہے کہ جب تک یہاں حالات پیدا ہوں پاکستان سے "جوشینا" قسم کی دواؤں کی برآمد پر غور کیا جائے ۔

روس سے پاکستان کی تجارت اکثر و بیشتر صورتوں میں مال کے بدلے مال پر ہے ۔ ہمدرد "جوشینا" وغیرہ فراہم کرکے روس سے مشینری وغیرہ لے سکتا ہے ۔ اس صورت حال پر احتیاط سے غور کیا جائے گا ۔ سب سے پہلے مناسب ہوگا کہ وزیر صحت کو جوشینا پورے لٹریچر کے ساتھ بہ کثرت فراہم کردی جائے ۔

ڈایاگونوسٹک سنٹر

آج کے میرے پروگرام میں باکو مرکز تشخیص میں حاضری ہے اور یہاں طریق کار

کو دیکھنا اور سمجھنا ہے ۔ اس حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں ہے کہ تشخیص امراض کے لیے اب عقل و شعور کے بجائے آلات حساس سے کام لیا جانے لگا ہے ۔ پاکستان میں ان آلات کی بھرمار ہوئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جن معالجین نے یہ آلات منگوا لیے ہیں اور تشخیص کے لیے انھیں استعمال کر رہے ہیں ان کے ساتھ دو شدید حوادث پیش آ رہے ہیں ۔

الف) ان معالجین کو ان کا صحیح استعمال اب تک نہیں آرہا ہے اور ان کی رپورٹ پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا ۔

ب) آلات حساس کے ذریعہ سے تشخیص کے معاوضے بے گراں ہیں ۔ پاکستان کے یہ معالجین درحقیقت بے انصاف ہو گئے ہیں اور کسب مال اور ہوس دولت کے اسیر ہوئے ہیں ۔

میرا اپنا واقعہ ہے ۔ میری ایک عزیزہ ہیں ۔ سونو گرافی کی تربیت واشنگٹن سے لے کر آئی ہیں اور اپنے ہسپتال میں رات دن سونو گرافی کر رہی ہیں ۔ میں نے ان سے اپنے شکم کا معائنہ کرایا ۔ ان کی رپورٹ کے مطابق میرے شکم میں ہر چیز درست ہے ۔ سوال کرنے پر انھوں نے بتایا کہ طحال بھی بالکل نارمل ہے ! حال آں کہ میرے شکم میں طحال موجود نہیں ہے ! پاکستان میں سونو گرافی کا مرتبہ و معیار یہ ہے !

بات اس پر ختم نہیں ہوئی ہے ۔ واشنگٹن سے سالانہ میرے معائنے کی رپورٹ آتی ہے ۔ ایک میں لکھا ہے کہ "لیور اینڈ اسپلین آر نارمل" ۔ حال آں کہ اسی ہسپتال میں میرا تلی کا آپریشن ہو چکا ہے جہاں سے یہ رپورٹ آئی ہے !

اس وقت پاکستان میں حالات یہ ہیں کہ سونو گرافی دھڑلے سے ہو رہی ہے ، مگر ، بے اعتمادی کا حال یہ ہے کہ سونو گرافی کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ایکسریز بھی کرا لیے جائیں ۔ ایک طرف یہ بے اعتمادی ہے اور دوسری طرف یہ لالچ ہے کہ مریض سے زیادہ سے زیادہ بٹور لیا جائے ۔ میرا یہ تجزیہ حقائق پر مبنی ہے اور کراچی کے سب سے بڑے ایک ہسپتال کا یہ واقعہ ہے جو میرے پاس محفوظ ہے ! کراچی کا یہ ہسپتال اب عظمت کا نشان بن گیا ہے ۔ پیسے والے لوگ اس ہسپتال میں علاج کو اپنی عظمت کا

نشان سمجھنے لگے ہیں ۔ ایک زمانہ قریب یہ تھا کہ اوپن ہارٹ سرجری دولت کا عنوان بنی تھی ۔ جو ہے اوپن ہارٹ سرجری کی طرف لپک رہا ہے ۔ پاکستان کے بیوروکریٹوں نے بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے ۔ درجنوں بیوروکریٹ اوپن ہارٹ سرجری کا طرہ امتیاز رکھتے ہیں ۔ امریکا اور برطانیہ میں بھی ان پاکستانی بے وقوفوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ۔ پھر چشم گنہ گار نے وہ معاہدے بھی دیکھے کہ جو پاکستان کے ڈاکٹر اور امریکا کے سرجن کے مابین ہوئے ۔ پاکستان سے اوپن ہارٹ سرجری کی تائید ہوئی ۔ امریکا برطانیہ میں اوپن ہارٹ سرجری ہوئی ۔ رقم تقسیم ہو گئی ۔

عرصہ دراز تک یہ مذاق و استہزا جاری رہا ۔ اب خود ہی امریکا میں مرض اور لا مرض کی تمیز پیدا ہو گئی ہے اور غیر ضروری اوپن ہارٹ کا سلسلہ ماند پڑ گیا ہے ۔

لاہور کی بات ہے ۔ ایک مریض آیا ' جواں سال ۔ اس کے پاس معدے کی سونو گرافی کی پانچ رپورٹیں تھیں ۔ جس معالج کے پاس گیا اس نے سونو گرافی کی اور ہزاروں بٹور لیے ۔ اس مریض کا زخم معدہ کا علاج ہوتا رہا ۔ وہ جب میرے پاس آیا تو معلوم ہوا کہ سرے سے زخم معدہ ہے ہی نہیں ۔

ہاں تو بات باکو کے ڈایا گونسٹک سنٹر کی شروع ہوئی تھی ' میں **مدینتہ الحکمتہ** میں ایک مرکز تشخیص قائم کرنا چاہتا ہوں اور پاکستان کے مریضوں کو لوٹ کھسوٹ سے بچانا چاہتا ہوں ۔ اسی لیے باکو کا یہ مرکز دیکھنے آیا ہوں ۔ یہاں جناب ڈاکٹر شیر علیوف اکنائی کاظم اوغلو صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ یہ اس مرکز تشخیص کے ڈائریکٹر ہیں اور سنٹر کے باہر ہمارے منتظر تھے ۔ باہر سے اس مرکز کے اندرون کا حال جاننا ممکن نہیں ہے ۔ اندر جا کر دیکھا تو میری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ باکو جیسے کوردہ میں دنیا کا یہ عظیم مرکز تحقیق ۔ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا ' مگر حقائق تو سامنے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس انداز کا مرکز تحقیق و تشخیص اب تک کہیں اور نہیں دیکھا ۔ دنیا بھر سے برآمدہ اور خود روس ساختہ تشخیص کا ہر معلوم آلہ یہاں موجود ہے اور ہر مرض کی تشخیص کا انتظام ہے ۔ یہ ہسپتال نہیں ہے ' فقط مرکز تشخیص امراض ہے ! اب **مدینتہ الحکمتہ** کے لیے یہ نمونہ مل گیا ہے ۔ اس کو سامنے رکھ کر کام

کرتا ہے ۔ ڈاکٹر اوغلو پاکستان آنے کو تیار ہیں !

موسکو ہوٹل باکو

آج وزارت صحت کی طرف سے جناب پروفیسر علیوف ماجد صاحب نے موسکو ہوٹل باکو میں میرے اعزاز میں ایک عشائیہ مرتب کیا ۔ میں نے لاکھ منع کیا تھا کہ وہ کوئی تکلف نہ کریں ۔ دن کو ہم اپنے شکم کو مرغ و ماہی سے اس قدر بھر چکے ہیں ' یا ہمارے پیٹوں کو اس قدر بھر دیا گیا ہے کہ رات کا کھانا قطعی ناممکن ہے ۔ مگر وزارت صحت نہ مانی اور اس نے درحقیقت انتہائی پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا ۔ اس میں وزارت ثقافت کے ڈائریکٹر بھی آئے تھے اور انجمن دوستی باکو کی نمائندگی جناب قریا توف کر رہے تھے ۔ میں نے تو ساگ پات پر قناعت کر لی ۔ ٹماٹر ' سوئے ' ساگ ' کھیرا کھاتا رہا ۔ جس قدر کھانا میز پر چنا ہوا تھا اسے پندرہ بیس آدمی کھا سکتے تھے !

ترکش ائرلائنز اور ایرو فلوٹ کا معاہدہ

آج ہماری موجودگی میں یہ خبر ملی کہ آج سے ترکی اور باکو کے مابین ترکش ائرلائنز اور ایروفلوٹ کی پروازیں شروع ہو رہی ہیں ۔ آذربائیجان میں ترکی النسل لوگ بکثرت ہیں ۔ ترکی اور آذربائیجان کے مابین ہوائی تعلق زبردست اہمیت کا حامل ہے ۔ اس آغاز پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے نتائج اور عواقب کا جائزہ لینا غیر ضروری نہیں ہوگا ۔

جواہرلال نہرو

روس میں جناب محترم جواہرلال نہرو کا مرتبہ بلند ہے ۔ انھوں نے روس پر نہایت اچھے اثرات قائم کیے ہیں ۔ ان کے بعد مسز گاندھی نے بھی روس سے اچھا رابطہ رکھا ہے اور اب راجیو گاندھی بھی دوست ہیں ۔

آج کے اخبار " پراودا " میں صدر روس میخائل گورباچوف صاحب کا ایک

مضمون جواہرلال نہرو پر شائع ہوا ہے ۔ روس میں جواہرلال نہرو پر ایک کتاب لکھی گئی ہے جس کا پیش لفظ گورباچوف صاحب نے لکھا ہے ۔ یہ پیش لفظ آج کے پراودا میں مضمون کی صورت میں شائع ہوا ہے ۔

میں نے ٹیلے ویژن پر جواہرلال نہرو پر ایک پروگرام دیکھا ہے ۔ زبان آذربائیجانی تھی ۔ سمجھ میں نہیں آئی ۔ اس میں مناظر ایسے تھے جن سے اندازہ ہوا کہ پاکستان سے ہندوؤں کی ہجرت کی منظر کشی ہوئی ہے ۔ پروگرام میں کشمیر کا ذکر خوب رہا ۔

آج ہی انجمن دوستی ' آذربائیجان ' باکو کے صدر دفتر میں جواہرلال نہرو پر ایک کانفرنس ہوئی ہے جس میں میں شرکت نہ کر سکا ۔

آذربائیجان میں ہنگامے

میں جب ایوان دوستی کراچی میں باکو (آذربائیجان) جانے کا پروگرام بنا رہا تھا تو مجھے ڈاکٹر زیتوف صاحب نے اشارہ دیدیا تھا کہ وہاں ان دنوں ہنگامے ہو رہے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ موسکو پہنچ کر پروگرام میں تبدیلی کرنی پڑے ۔ سوال تھا کہ ایسی صورت میں آپ کیا پسند کریں گے ؟ میں نے کہا کہ میں پھر سائبیریا چلا جاؤں گا ! بارے پروگرام میں تبدیلی تو نہیں ہوئی اور میں باکو تک آسکا اور اپنے دوست جناب وزیروف صاحب سے مل سکا جن کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ فسادات اور ہنگامے وزیروف پاکستان سے اپنے ساتھ لائے ہیں ! یہاں اخبارات نے وزیروف صاحب پر یہ پھبتی کسی ہے !

درحقیقت آذربائیجان فسادات کی زد میں ہے ۔ روس سے واپس آکر روس نامہ مرتب کر رہا تھا کہ ایک ماہ بعد ہی آذربائیجان میں ہنگاموں میں شدت آگئی اور رائٹر نے اس کا حال اس طرح بیان کیا ہے :

(موسکو ۵ ر جنوری)

ایران کے سرحد کے قریب روس کے سرحدی گارڈز کے ساتھ آذربائیجانی مظاہرین کے متعدد تصادم ہوئے ہیں جن میں ایک آذربائیجانی ہلاک ہوگیا ۔ مزید فوجی کمک علاقہ میں پہنچادی گئی ہے ۔ (کے جی بی)

ہنگامہ روسی آذر بائیجان کے علاقہ نخشیوان سے شروع ہو کر پورے روس ایران سرحدی علاقے میں پھیل گیا ہے۔ صورت حال مزید سنگین ہو سکتی ہے۔ چار ہزار مظاہرین نے سرحدی گارڈز کے ٹاور میں بری طرح توڑ پھوڑ مچادی اور سرحدوں کے ساتھ جو الیکٹرانک نظام تھا اسے تباہ کر دیا۔ (اخبار ازوستیا)

روس ایران سرحد کھولنے کا مطالبہ کرنے والے آذری قوم پرستوں کے سرحدی تنصیبات پر حملوں کے بعد اب مزید فوجی کمک پہنچادی گئی ہے۔ کوئی فوجی زخمی نہیں ہوا اور نہ کسی فوجی کو اپنے ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت پڑی (یہ تفصیل نہیں بتائی گئی کہ مظاہرین میں سے ایک شخص کہاں اور کیسے ہلاک ہوا ہے)۔ آذری عوامی محاذ کے رہنماؤں نے گزشتہ نومبر میں مطالبہ کیا تھا کہ سرحد کھول دی جائے اور ایران و روس کے آذری باشندوں کی از سر نو گروپنگ کرکے عظیم تر آذر بائیجان کو وجود میں لایا جائے۔ بعد ازاں دسمبر میں ان رہنماؤں نے الٹی میٹم دیا کہ سرحد پر واقع تنصیبات توڑ دی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے جنوری میں سرحد پر اپنے ہفتہ مہم کے آغاز کا بھی اعلان کیا۔ تصادم کا آغاز نخشیوان میں جو ایرانی سرحد پر واقع ہے اور درمیان میں ایک آرمینائی علاقہ ہونے کے باوجود آذر بائیجان ہی کا حصہ ہے' اس وقت ہوا جب اتوار کو مظاہرین نے ٹیلیفون لائنیں کاٹنی شروع کر دیں۔ (لیفٹنٹ جنرل نکولائی بریڈین)

ہنگاموں کو آذر بائیجان قوم پرستی نے ہوا دی ہے۔ ان انتہا پسندوں کا کہنا ہے کہ ایران کے ساتھ کسی سرحد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ (وزارت خارجہ روس)

ہنگاموں سے متعلق اپنی پہلی رپورٹ میں تاس نے بتایا تھا کہ ہنگامہ کرنے والے منشیات کے زیر اثر تھے۔ اس نے مظاہرین کے کسی سیاسی مقصد کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ (تاس)

کے جی بی کاکیشیا ڈسٹرکٹ کے سربراہ آئی۔ پیٹروویس کے حوالے سے ازوستیا نے اپنی رپورٹ میں صرف سیاسی مقاصد ہی کا ذکر کیا اور کہا ہے کہ مظاہرین نے ہنگاموں اور تباہ کاریوں کا ہفتوں طویل منصوبہ بنا رکھا ہے۔ یہ کاکیشیا کے تازہ ہنگامے ہیں۔

یہاں گزشتہ دو سال سے آذر بائیجان' آرمنی' جارجیائی اور دوسرے نسلی گروپوں کے درمیان جھگڑے جاری ہیں۔ مزید فوجی کمک پہنچانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرحد پر متعین فوجی ان ہنگاموں پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ ایران نے الزام لگایا ہے کہ روس سرحدی معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

تاس کی یہ رپورٹ کہ مظاہرین منشیات کے زیر اثر بری طرح بدمست تھے موسکو میں گھڑا جانے والا جھوٹ ہے۔ در اصل روسی آذر بائیجان کے باشندوں نے تقریباً ایک ماہ سے اس امید پر سرحدوں کے ساتھ ڈیرے ڈال رکھے ہیں کہ سرحد کی دوسری جانب مقیم اپنے اعزہ و اقربا اور دوستوں سے ان کی ملاقات ہوجائے۔ بیشتر آذر بائیجانی شیعہ ہیں۔ تقریباً چالیس لاکھ نسلی آذر بائیجانی تو صرف ملحقہ ایرانی آذر بائیجان میں رہتے ہیں۔ روس میں مقیم ان کے عزیز رشتہ دار چاہتے ہیں کہ سرحدیں کھول دی جائیں اور انھیں سرحد عبور کرنے اور باہم تجارت کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ ان پر پہلے عمل ہوتا تھا مگر روس کے آمر اسٹالن نے پابندی لگادی تھی۔ (رائٹر)

۱۴ نومبر ۱۹۸۹ء

باکو۔ لینن گراد

باکو میں صبح بعد نماز فجر یہ خیال آیا کہ مجھے کراچی ایک تار اپنی سرگرمیوں سے متعلق دیدینا چاہیے تاکہ پاکستان میں میرے دوستوں کو میری جد و جہد کا علم ہوجائے کہ یہاں میں رات دن کام کر رہا ہوں اور یہ کہ میرا ہر لحہ فکر و تبادل خیال سے خالی نہیں ہے۔ میں نے تار کا مضمون تیار کیا۔ گو وزارت صحت کی طرف سے یہ آفر تھا کہ ہم بذریعہ ٹیلیکس کراچی پیغام دیدیں گے' مگر میں نے ان کو زحمت دینے سے گریز کیا۔ صبح دونوں میزبان بلکہ نگہ بان آگئے۔ ان سے میں نے کہا کہ فارن ٹیلے گراف آفس جانا ہے اور تار یا ٹیلیکس کراچی دینا ہے۔ ناشتہ میں تو کرتا ہی 'نہیں ہوں' سعدیہ بیٹی بھی اب ناشتے میں چائے پر آگئی ہیں۔ ان کے والد بزرگوار نے تو آج تک چائے چکھی تک نہیں ہے' یہ بیٹی چائے کے بغیر اونگھتی ہیں۔ توبہ! کیا زمانہ آگیا ہے!

ہمارے دونوں نگہ بانوں نے نہایت اطمینان سے ناشتہ کیا اور خوب کیا۔ اکل و شرب کی کثرت انسان کو فرائض سے غافل کردیتی ہے' اور غبی تو بنا ہی دیتی ہے۔ یہ دونوں ایک بار پھر بھول گئے کہ تار دینے کے لیے فارن ٹیلے گراف آفس جانا ہے۔ اب پونے دس بج رہے تھے' دس بجے جناب وزیر ثقافت سے ان کے دفتر میں تبادل خیال تھا۔ میں نے پوری قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ ہر حال میں پہلے تار دینا ہے۔ دونوں نگہ بان خاصے ڈسٹرب ہوئے۔ میں ان کے ساتھ ٹیلے گراف آفس گیا۔ وہاں دیکھا تو عجیب خاموشی کا عالم تھا۔ خریدار ایک نہ تھا۔ خاتون کہ جو گدی پر بیٹھی تھیں بڑی نک چڑھی تھیں۔ انھوں نے نہایت خشکی کے ساتھ جواب دیا کہ ٹیلیکس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ محترمہ پھر تار دیدیجئے۔ تار کا مضمون ان کے ہاتھ میں پکڑایا۔ وہ اتنا طویل تار دیکھ کر زیادہ خوش نہیں ہوئیں اور بیزاری میں تار کے تین فارم میرے حوالے کیے کہ تار ان پر لکھ کر دو۔ سعدیہ مدد کے لیے تیار رہتی

ہیں۔ انھوں نے فوراً تار ان تین فارموں پر لکھدیے۔ محترمہ نے ان کو چپکایا۔ پھر الفاظ گننے شروع کیے۔ دوسری چلبلی خاتون آئیں۔ انھوں نے تار خود لے لیا اور ازسرنو الفاظ گننے شروع کیے۔ پھر جو الفاظ سات حروف سے بڑے تھے ان کو گنا۔ بالآخر تار تیار ہوا۔ مطالبہ تھا ۸۵ روبل! یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ اتنی تو یہاں ایک مزدور کی ماہانہ تن خواہ ہے۔ حالات متقاضی تھے کہ میں ہر قیمت پر یہ تار دوں۔ ایک یہ کہ میں نے وزیر ثقافت سے دس بجے کی ملاقات کی پروا نہیں کی تھی' دوسرے تار پر اصرار کیا تھا۔ اگر تار نہ دیتا تو خاصی مشکل ہوتی۔ رقم سن کر نگہ بان بھی حیران ہوئے۔ میں نے ۸۵ روبل ادا کردیے اور تار دیدیا!

وزارت ثقافت آذربائیجان میں

پرانے زمانے کا کوئی محل ہے جو اب وزارت ثقافت کے عالی شان دفتر کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ ہم یہاں ۱۵ منٹ تاخیر سے آئے تھے۔ بارے وزیر ثقافت منتظر تھے۔ ممکن ہے کہ ہمارے دوستوں نے معذرت پیش کی ہو مگر میں نے کوئی معذرت نہیں پیش کی' کیوں کہ تاخیر کا ذمہ دار میں نہ تھا' زور دار ناشتہ تھا!

جناب وزیر ثقافت محترم پولاد بوئیل بوئیل نہایت دل چسپ انسان ہیں۔ عمر کوئی ہوگی ۴۵۔۴۶ برس۔ دبلے پتلے' مگر پھرتیلے۔ ہنس مکھ اور دل کے پاک۔ جیسے اندر ویسے باہر۔ انسانوں کے چہروں پر صداقتیں تحریر ہوا کرتی ہیں جس کو پڑھنے کے لیے صداقت درکار ہوتی ہے! پاس کی نگاہ کم زور ہے' عینک لگا کر پڑھتے ہیں۔ ان سے بہت دل چسپ باتیں ہوئیں۔

☆ پاکستان اور روس کے مابین تعلقات کی استواری معرض خطر و التوا میں رہی ہے' مگر شاید (پاکستان سے آپ کی آمد پر) اس مزاج میں کوئی فرق آجائے۔

☆ میں نے کہا کہ روس اور پاکستان کے مابین ثقافتی معاہدہ موجود ہے جس کا اطلاق آذربائیجان پر بھی ہونا چاہیے۔ اس پر اظہار شبہ ہوا۔ خود میں بھی چہ می گنم میں پڑ گیا کہ ممکن ہے کہ یہ معاہدہ صرف روس کو محیط ہو اور چھے مسلم ریاستیں اس کے

دائرے سے باہر ہوں۔

☆ بارے میں نے کہا کہ میں ذاتی طور پر سیاسی انداز کے فکر و نظر سے گریز کرتا ہوں۔ میں علم و حکمت کی حدود میں رہ کر تعلقات کی استواری کو اہمیت دیتا ہوں۔

☆ میں نے بتایا کہ ۴ر نومبر ۱۹۸۹ء کی شام ایوان دوستی میں میں نے اپنی تقریر میں یہ رائے ظاہر کی کہ ایک "پاکستان روس" مشاعرہ ہوجانا چاہیے۔ پاکستان میں اس کی طرح ڈال دینے سے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ فارسی کے شعرا تاجیکستان، ازبکستان، اور آذربائیجان میں ہیں۔ ان تینوں ریاستوں سے دو دو یا تین تین شعرابے روس پاکستان مشاعرے میں شرکت کریں۔ اتنے ہی یا زیادہ شاعر پاکستان کے ہوں۔

☆ اس کا دائرہ ذرا بڑھایا جاسکتا ہے۔ مشاعرہ کراچی سے باہر لاہور اور اسلام آباد میں بھی ہو سکتا ہے۔

☆ اگر دائرے کو وسعت مزید دی جائے تو پھر روس میں اردو زبان پر ایک مجلس مقالات بھی ہوسکتی ہے۔

☆ اتفاق رائے ہوا ہے کہ روس اس کے لیے تیار ہے۔ مجھے پاکستان میں رسمی اجازتیں وغیرہ لینے کا بندوبست کرنا چاہیے۔

وزیر ثقافت نے فواکہات سے تواضع کی۔ معدنی پانی کا پورے روس میں زبردست رواج ہے۔ جہاں جایئے معدنی پانی (منرل واٹر) موجود ہوتا ہے۔ یہاں انگور، سیب بھی تھے، بادام، کشمش بھی تھی۔ چاکلیٹ بھی تھے۔ میں نے آج اس بے تکلف مجلس میں تکلف سے کام نہیں لیا۔ انگور یہاں کے نہایت نرم و لذیذ ہوتے ہیں، میں نے بہت سارے انگور نوش جاں کیے۔ ان کا رنگ وہی تھا کہ جو کابل کے انگور کا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ کیا شے ہے!

روانگی کی تیاری

وزارت ثقافت سے فارغ ہوکر ہم ہوٹل آگئے۔ یہاں اب تک کی جمع شدہ

کتابوں کو ایک کارٹن میں باندھا۔ یہ کتابیں جناب گنادی صاحب، جو موسکو سے یہاں تک ہمارے ساتھ رہے، اب موسکو لے جائیں گے۔ اور ہم ہلکے وزن کے ساتھ اب باکو سے لینن گراد روانہ ہوجائیں گے۔

ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ سعدیہ خاتون کا سوٹ کیس کا تالا "لاک" ہوگیا۔ شاید پٹی کی کساکسی سے اس کے نمبر بل گئے اور نمبر ان کو یاد نہ تھے۔ اب سامان اس میں اور سفر درپیش۔ ناچار اپنے نگہ بان سے ذکر کیا۔ ہم جتنی دیر لنچ پر رہے ایک تالہ شناس آچکا تھا اور اس نے تالہ کھول دیا تھا! بڑا اطمینان ہوا کہ ٹوٹ پھوٹ کے بغیر کام چل گیا۔ اس سوٹ کیس سے تحائف نکالے تاکہ جناب قربانوف صاحب اور جناب ایلیکپر کو دیے جاسکیں۔ قربانوف صاحب انجمن دوستی کے نائب ہیں۔ خدا حافظ لنچ ان ہی کی جانب سے تھا۔ ہم نے تحائف دیے، جناب قربانوف صاحب اور ان کے ذریعہ سے انجمن دوستی کا شکریہ ادا کیا۔ ان کی میزبانی اپنی رفعتوں پر رہی۔

ہوائی میدان پر

باکو کے ہوائی میدان پر ہمارے نگہ بان صاحب نے ٹیلے فون کردیا تھا کہ ہم ذرا تاخیر سے پہنچ سکیں گے۔ وہاں وی آئی پی میں اعلا انتظامات تھے۔ سامان بھی وی آئی پی روم میں لے لیا گیا اور جناب ایلیکپر صاحب نے خصوصی کار میں بٹھا کر ہمیں ہوائی جہاز تک پہنچادیا اور اندر ہمیں ہماری نشستوں پر بٹھا دیا۔ اب سعدیہ اور میں باکو سے لینن گراد تک تنہا سفر کررہے تھے۔ گنادی صاحب شام کو موسکو چلے جائیں گے۔ باکو سے لینن گراد کی مسافت کوئی ساڑھے تین گھنٹے کی تھی۔ میں نے قیلولہ کیا! یعنی ۱۰۔۲۰ منٹ سولیا۔ اور پھر اٹھ کر میں نے کاغذ اور قلم نکال لیے اور اب جو لکھنا شروع کیا تو لینن گراد تک لکھتا ہی رہا۔ ہوائی جہاز کی میزبان خاتون نے اشارے سے بتایا کہ اپنی گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے کرلیجئے۔ یہاں وقت کا فرق ہے۔ ہم نے اپنی گھڑیوں میں آٹھ کے بجائے سات بجالیے!

ہوائی جہاز رکا۔ میزبان خاتون نے ہم کو اٹھایا اور باقی خواتین وحضرات سے بیٹھے

رہنے کو کہا۔ جب ہم جہاز کے دروازے پر آگئے تو باقی مسافر بھی اٹھ گئے۔ اس احترام کے ساتھ ہم ائرپورٹ بس میں بیٹھ گئے۔ مگر یہاں بے چینی پائی۔ کوئی اتر رہا تھا کوئی چڑھ رہا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بارے لینن گراد کی عمارت کے اندر آگئے۔ مگر رہنمائی نہیں مل رہی تھی کہ سامان کہاں ملے گا۔

خیال تھا کہ انجمن دوستی لینن گراد کا کوئی نمائندہ ضرور ہوگا۔ محترمہ ڈاکٹر لدمیلا تو ہمارے استقبال اور ہمارے لیے اہتمام کے لیے موسکو سے لینن گراد آچکی ہیں۔ شاید وہی ہوائی میدان پر ہوں۔ مگر یہاں کوئی نہ تھا۔ زبان کا مسئلہ شدید ہوا۔ جس سے بات کروں وہ معذرت پیش کرے۔ اشارے بھی سمجھ میں نہیں آئے۔ ہوائی میدان کی عمارت کا ہر سائن بورڈ روسی زبان میں ہے۔ جس شہر میں ہزارہا غیر ملکی سیاح آتے ہوں اور سینکڑوں کمروں والے ہوٹلوں میں ان کے لیے جگہ ملنی مشکل ہو وہاں انگریزی زبان میں ایک بورڈ نہیں ہے۔ یہاں سعدیہ خاصی پریشان ہوئیں۔ پریشان تو میں بھی تھا۔ بارے میں نے سامان کے ٹیگ نکالے اور پھر اس جگہ گیا جہاں سامان کی چرخیاں چل رہی تھیں۔ کسی پر ہماری فلائٹ کا نمبر نہ تھا۔ مگر منظر یہ بھی تھا کہ سامان مختلف آرہا تھا۔ ٹیگ کا رنگ الگ الگ ہوتا ہے۔ چرخیوں پر سامان رنگ برنگ ٹیگوں کا اتر رہا تھا۔ میں نے اشارات سے پوچھا ایک فوجی سے۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ نمبر ۳ یا نمبر ۴ پر سامان اترے گا۔ وہاں جو خاتون تھیں ان کو ٹیگ دکھائے تو انھوں نے واقعی جھڑک دیا۔ عجیب حشر کا میدان تھا۔ ہزارہا مسافر تھے۔ ہزارہا قسم کا سامان اتر رہا تھا۔ میں اس تلاش میں سرگرداں ادھر سے ادھر پھر رہا تھا کہ کوئی مل جائے اور دوست کو پہچان لے۔ پہچاننا کون سا مشکل تھا! مگر کوئی راہ سجھائی نہ دی۔

ایک مسئلہ، جو مجھے معلوم تھا اور سعدیہ کو معلوم نہ تھا، یہ تھا کہ ہم روس میں کسی ہوٹل میں خود جاکر نہیں ٹھیر سکتے۔ ہوٹلوں میں جگہ پانے کے لیے کوئی نہ کوئی پروانہ ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں سامان اٹھاؤں، ٹیکسی کروں اور ہوٹل موسکو یا ہوٹل لینن گراد میں جاکر ٹھیر جاؤں۔ پروانے کے بغیر روس کے ہوٹلوں میں

قیام ممکن نہیں ہے۔ یہ پروانہ یا تو میزبان کا ہوتا ہے، کسی انجمن کا ہوتا ہے یا روس کی سرکاری سیاحت ایجنسی "این ٹور" جاری کرتی ہے۔ روس میں سیاحت کے لیے "این ٹور" ہی سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ اس ایجنسی کے دفاتر اور انتظامات روس کے ہر شہر میں ہیں۔ میں یہ غور کر رہا تھا کہ اگر حسن اتفاق سے، یا قسمت زور مارے اور سامان بھی مل جائے تو قیام کہاں اور کیسے ہوگا! میں نے سعدیہ کو یہ نکتہ نہیں بتایا۔ وہ حیران تو تھیں پریشاں بھی ہوجاتیں۔

میں دیوانہ وار سامان کا ٹیگ ہاتھ میں لیے ادھر سے ادھر چکر پر چکر لگا رہا تھا۔ کبھی ایک چرخی پر جاتا تو کبھی دوسری پر۔ سامان تھا کہ ابلے پڑ رہا تھا، لوگ تھے کہ اپنے اپنے سامان کے لیے ادھر سے ادھر آجارہے تھے۔ عجیب قیامت برپا تھی۔ بالآخر ایک فوجی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتہ آسمان سے اتارا اور وہ خود میرے قریب آیا۔ سوال کیا ٹورسٹ! یعنی کیا تم سیاح ہو؟ میں نے دل میں کہا کہ اے فرشتہ لینن گراد، تجھے میں اگر سیاح نظر نہیں آرہا ہوں تو کیا سعیدوف ہوں! میں نے جواب دیا کہ ہاں ٹورسٹ۔ وہ فرشتہ لینن گراد تھا یا فرشتہ رحمت، اس نے اشارہ کیا اور رہنمائی کی کہ آگے جاکر الٹے ہاتھ کو مڑ جاؤ۔ تمھارا سامان وہاں ملے گا! میں افتاں و خیزاں سعدیہ کو ساتھ لے کر ادھر چلا گیا جہاں مجھے اس فوج کے لباس میں ملبوس فرشتے نے اشارات دیے تھے۔

راز یہ افشا ہوا کہ ٹورسٹوں اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے الگ انتظامات ہیں اور ان کے سامان بالکل الگ اترتے ہیں۔ میں اس وسیع ہال میں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک جواں سال بھوری مونچھوں والا انسان آگے بڑھا اور بولا پاکستان؟ ڈاکٹر سعید؟

میں نے دل میں کہا: ہاں میری جان، میں ہی پاکستان کا سعید ہوں! زبان سے یس یس دوبار کہا۔ "آئی ایم فرام فرینڈشپ سوسائٹی۔ ایلکسی از مائی نیم!" میں نے دل میں تو اسے برا بھلا کہا مگر زبان سے کہا: یار، تم کہاں تھے؟ سعدیہ نے پوچھا: لدمیلا کہاں ہیں؟ وہ ہوٹل میں آپ کی منتظر ہیں۔ آپ کا جہاز بہت لیٹ آیا ہے۔ اور آپ اب تک کہاں تھے؟ میں تو مایوس ہو کر بس جانے کی ٹھان رہا تھا۔ جیسے ہی اس

نے یہ جملہ کہا میرا دل چاہا کہ میں اس سے لپٹ جاؤں۔ میرے یار، ایسا نہ کرنا۔ ہم سر چھپانے پھر کہاں جائیں گے!

معلوم ہوا کہ سامان ہنوز نہیں آیا ہے۔ الیکسی نے دونوں ٹیگ مجھ سے لیے۔ بارے سامان آگیا۔ جہاز سے اترے اور حیراں پریشاں دربدر پھرتے اور ایئر پورٹ عمارت کے گلی کوچوں میں تلاش لیلیٰ مقصود میں سرگرداں پھرتے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ بارے سامان اب برآمد ہوا۔

اب کامیابی تو ہوگئی تھی، مگر دل سے یہ خوف کافی دیر تک نہ نکلا کہ اگر وہ فرشتہ لینن گراد نہ رہنمائی کرتا اور ہم یہاں تک نہ پہنچ جاتے تو پھر کیا بیتتی!

ہوٹل موسکو پہنچے۔ اندر داخل ہوئے تو گرمی نے استقبال کیا۔ دوسرا استقبال محترمہ ڈاکٹر لدمیلا نے کیا۔ وہ بے چینی سے ہماری منتظر تھیں۔ بے حد سردیوں سے گزر کر اس گرمی اور گرم جوشی نے منٹوں کی منٹوں میں ساری کلفت دور کر دی۔ میں نے اور سعدیہ نے ذرا بھی ذکر نہ کیا کہ ہوائی میدان پر ہم کن شدائد سے گزر کر یہاں آئے ہیں۔

ہوٹل موسکو میں تین نہایت پاکیزہ کمرے موجود تھے۔ ایک میں نے سنبھالا، اور دوسرا سعدیہ نے، محترمہ ڈاکٹر لدمیلا کا کمرا ہم دونوں کے درمیان۔ سامان جمایا۔ اب دو دن یہاں کشمکش کرنی ہے۔ ڈنر کے لیے جگہ ریزرو تھی۔ ہم تینوں گئے۔ ہال میں داخل ہوئے تو غضب کا شور تھا۔ پاپ میوزک اور پاپی گانا۔ اس باجے گانے کی تانوں کے ساتھ متعدد نیم عریاں پریاں رقصاں تھیں۔ ڈاکٹر لدمیلا کو ہماری طبیعت کا حال معلوم ہوچکا ہے۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بولیں کہ اب روس میں ہوٹلوں میں یہ انداز رقص و سرود عام ہوا ہے۔ خاصا تکلیف دہ ہے۔

ایک اسٹیج سے کافی دور میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ خاصا اندھیرا تھا۔ ایسے اندھیرے ان لوگوں کے لیے باعث سکون و مسرت ہوتے ہیں کہ جو دعوتوں میں بغیر بلائے آتے ہیں اور تکلفاً بیک وقت کئی وقت کا کھانا کھا لینے کے بعد احتیاط سے چھری کانٹوں سمیت اٹھ جایا کرتے ہیں!

ہاں، ایک لطیفہ یاد آگیا۔ لطیفہ کیا اچھا خاصا واقعہ ہے۔ راجہ مہاراجہ کا کھانا تھا۔ وہاں نکتہ دانوں کے لیے صلائے عام تھی۔ خصوصیات سب کے لیے یکساں تھیں۔ بڑا ہو یا چھوٹا انتظامات ایک جیسے تھے۔ کھانے کی ایک میز پر نعمت ہائے غیر مترقبہ چنی ہوئی تھیں۔ بڑے شان دار سنہری برتن تھے۔ سونے چاندی کے کانٹے اور چھری چمچے تھے۔ اکل و شرب کا زبردست زور تھا۔ بن بلائے مہمان بھی تھے۔ ایک دست دراز نے کھانے کے بعد سونے کے چمچے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ کسی کو آنکھوں آنکھ خبر نہ ہوئی۔ مگر اسی میز پر ایک اور بھی کائیاں مصروف آہ و فغاں تھا۔ یعنی اس قدر کھا پی گیا تھا کہ سانس بہ مشکل لیا جارہا تھا۔ اس کی نگاہوں نے تاڑ لیا کہ سونے کے چمچے پار ہوگئے ہیں! اسے ایسا غنیمت موقع میسر نہیں آیا تھا۔ زندہ دل تھا اور صاحب کرامت بھی۔ فوراً کھڑا ہوگیا اور تقریر شروع کی:

"خواتین و حضرات! اب کھانا ختم ہوا۔ دل چاہتا ہے کہ دل پسند اکل و شرب کے بعد کوئی دل چسپی کا سامان بھی ہو۔ تو لیجے جادو کا کمال ملاحظہ ہو۔ میں یہ دو سونے کے چمچے اپنی جیب میں ڈالتا ہوں۔ آپ ان صاحب کی جیب سے نکال لیجے۔ محترمہ، آپ زحمت فرمایئے"۔ محترمہ نے دونوں چمچے ان کی جیب سے نکال لیے۔ جن صاحب نے اپنی جیب میں چمچے ڈالے تھے وہ خدا حافظ کہ کر سونے کے چمچے سمیت روانہ ہوگئے!

یہاں اندھیرے میں ایک حادثہ پیش آیا کہ محترمہ ڈاکٹر لدمیلا نے پانی کی بوتل کھولی اور اسے جوس سمجھ کر ہمارے اور اپنے گلاسوں میں انڈیل لیا۔ اندھیرے میں پیاسی سعدیہ نے بڑا سا گھونٹ لیا۔ ہائے یہ تو بیئر ہے!

لاحول ولاقوۃ۔ ادھر لدمیلا شرم سار، پریشان! ہم کٹر مسلمان ہیں۔ گوشت تک ترک کیا ہوا ہے۔ ہماری تواضع آج بیئر سے ہوئی ہے! یہ مسلم بیئر تو نہیں تھی! لدمیلا کی پریشانی اور شرم ساری دور کرنے کے لیے میں نے اس موقع پر اپنا ایک واقعہ سنایا:

میں تاجیکستان کے دارالحکومت دوشنبہ میں تھا۔ وہاں جناب پروفیسر محمد عاصوف

صاحب نے میرے اعزاز میں ایک عشائیہ مرتب فرمایا تھا۔ کافی لوگ تھے۔ ادیب بھی اور شاعر بھی شان دار ماحول میں شان دار میز پر شان دار کھانے چنے ہوئے تھے انواع تھیں اور اقسام۔ پانی بھی تھا اور جوس بھی تھا' رندوں کے لیے شراب ہمہ قسم بھی۔ دوران اکل و شرب بار بار " ٹوسٹ پروپوز " ہورہے تھے۔ ٹوسٹ پروپوز کے لیے چھوٹے گلاس ہوتے ہیں۔ ان میں روسی ووڈکا ڈالی جاتی ہے۔ پروفیسر عاصموف صاحب نے خاتون میزبان کو ہدایت دے دی تھی کہ میرے چھوٹے گلاس میں وہ پانی ڈالتی رہے۔ ایک بار خدا کا کرنا کیا ہوا میزبان خاتون ہدایت فراموش کر گئی اور میرے گلاس میں ووڈکا ڈال گئی۔ اب میں ٹوسٹ پروپوز کرنے اٹھا۔ سب اٹھے۔ میں نے عالم ۔۔ عالم دوستی کے لیے ٹوسٹ پروپوز کیا۔ گلاس سے گلاس ٹکرائے اور میں نے گلاس کا پانی پی لیا۔ واہ واہ! کمال ہے۔ وہ تو ووڈکا تھی۔ میرا منھ اور سینہ جل گیا۔

مگر میں نے ذرا منھ نہ بنایا۔ ورنہ عاصموف اس خادمہ کا تیا پانچا کردیتے۔ میں نے ووڈکا برداشت کرلی۔ پھر رات بھر منتظر رہا کہ کوئی تو اس کا اثر ظاہر ہو۔ مگر میرے لیے وہ پانی ثابت ہوئی کہ یہ برداشت کا معاملہ ہے!

روسی خواتین

ہال میں اسٹیج پر ہنگامہ رقص و سرور برپا تھا مگر ہم ایک تاریک کونے میں اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے محترمہ ڈاکٹر مس لدمیلا سے روسی عورت کے بارے میں سوالات کیے کہ کیا اسے کچھ مسائل کا سامنا ہے؟ انھوں نے اظہار خیال میں تامل کیا۔ خود میں نے جو مطالعہ کیا ہے اس کا میں نے اظہار کیا' مس لدمیلا نے تائید کی۔ ویسے تو دنیا کے متعدد ممالک کی خواتین کو شکایت ہے کہ ان سے منصفانہ سلوک نہ تو سماجی سطح پر کیا جارہا ہے اور نہ سرکاری سطح پر۔ لیکن روس میں اب جب کہ پیرسترائیکا کے تحت حقوق کی بات چلی ہے تو خواتین بھی بول پڑی ہیں۔

روسی خواتین کا شمار دنیا میں زیادہ کام کرنے والی خواتین میں ہوتا ہے۔ اور یہ تناسب ماضی سے چلا آتا ہے۔ زار کے عہد سے قطع نظر خود انقلاب روس سے لے

کر اب تک خواتین کو نہ تو کمیونسٹ پارٹی کی اعلا سطح میں جگہ ملی ہے اور نہ حکومت میں حالانکہ کمیونسٹ پارٹی میں ان کا تناسب ۳۰ فی صد ہے۔ اس وقت کہ جب بیسویں صدی ختم ہونے والی ہے صرف ایک خاتون پولٹ بیورو کی رکن ہے اور وہی روسی کابینہ میں بھی ہے (الیکساندرا بیروکوفا)۔

اب تک کے اندازوں سے معلوم ہوا ہے کہ ۴۰ فی صد خواتین محنت ومشقت والی صنعت میں کام کررہی ہیں۔ تعمیر مکانات میں ان کا تناسب ۲۵ فی صد ہے۔ زراعت میں خواتین کی کل تعداد کا ۹۸ فی صد کام کرتی ہے۔ روسی محکمہ صحت (ہیلتھ کیئر) کے ۷۰ فی صد اسپیشلسٹ اور روس کے ۵۰ فی صد انجنیر خواتین ہیں۔ مرد استادوں سے عورت استادوں کی تعداد زیادہ ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ خواتین کو ۴۰ گھنٹے فی ہفتہ تو روزی کمانے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے اور ۴۰ گھنٹے امور خانہ داری کے لیے۔ ایک اندازے کے مطابق وہ سال میں ۲ سے ۴ ٹن اشیاء صرف ڈھوتی ہیں اور روزانہ ۱۲ سے ۱۳ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ چوں کہ روس میں ہر بات کے لیے قطار لگتی ہے لہٰذا وہ قطاروں میں کھڑی ہوتی ہیں۔ روس میں بھی اب طلاق کی شرح بڑھ رہی ہے اور پیدائش کی شرح کم ہورہی ہے۔

خاتون کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ نسل انسانی کو آگے بڑھائے۔ بچوں کی صحیح تربیت کرے۔ گھر کے کام کاج کو سنبھالے۔ خاوند کی خدمت کرے' لیکن اس کے صلے میں اسے نہ تو اعلا ملازمتیں ملتی ہیں' نہ اچھی مزدوری۔ اگر کسی جگہ چند خواتین گھس جاتی ہیں تو ان کو اعلا مقام نہیں دیا جاتا۔

چنانچہ روس کی خواتین اپنے شب و روز پر خوش نہیں۔ انھیں کم از کم موجودہ پیرسترائیکا سے بھی کوئی خاص توقع نہیں جب تک کہ قانونی طور پر اور عملاً بعض میدانوں میں ان کو خصوصی حقوق نہیں دیے جاتے۔

۱۵ نومبر ۱۹۸۹ء

لینن گراد

لینن گراد روس میں ایک شہر علم و حکمت کے نام سے پہچانا جاتا ہے ۔ یہ شہر مرکز تہذیب و ثقافت بھی ہے اور تاریخ روس کے اکثر و بیشتر واقعات لینن گراد سے متعلق ہیں ۔ اگر میں یہ اضافہ کردوں تو یہ میرے مطالعے کا حاصل ہوگا کہ اس شہر کا چپا چپا تاریخ ہے ۔ کیا اس سے بڑی تاریخ بھی کوئی ہوسکتی ہے کہ روس کی آزادی کی ہر تحریک کا مرکز لینن گراد ہی رہا ہے ؟ انقلاب عظیم اکتوبر سے پہلے یہاں شہنشاہیت نے ایک ناقابل فراموش تاریخ بنائی ہے ۔ اور پھر انقلاب کا آغاز بھی اسی شہر تاریخ سے ہوا جس نے عوامیت کا سنگ اساس نصب کیا ہے ۔ لینن اعظم کی تحریک نے انقلاب عظیم پر منتج ہو کر اس شہر کے رہنے بسنے والوں کو ایک مستقل مزاج انقلاب دے دیا ہے ۔ آج بھی ہر تحریک ' خواہ وہ کسان شروع کریں یا طالب علم ' لینن گراد کی انقلاب آفریں زمین سے جنم لیتی ہے ۔ ہیئت اختلاف کا یہ مرکز ہے جو ہیئت اقتدار کے لیے ایک مستقل چیلنج بنا رہتا ہے ۔ ان دنوں ماسکو میں ایک کانفرنس ہو رہی ہے جس کا عنوان معاشیات و اقتصادیات روس ہے ۔ اس کانفرنس کے بارے میں لینن گراد ہی کے ایک عالم ' پروفیسر کا ایک خط پراودا نے شائع کیا ہے جو ایک بھرپور طنز ہے ۔ اور یہاں ہی ماسکو میں ان دنوں یوتھ کانفرنس ہو رہی ہے جس کے سرد و گرم کا عنوان طلبہ لینن گراد ہیں ۔ میرے اچٹتے مطالعہ کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ لینن گراد اور ماسکو میں ایک مستقل ذہنی تضاد ہے ۔ ماسکو والے لینن گراد کے لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور لینن گراد کے لوگ موسکو والوں کو گنوار سمجھتے ہیں ۔ یہ محض اختلاف ثقافت نہیں ہے ' بات اس سے بھی آگے ہے ۔ لینن گراد والے یہ سمجھتے ہیں کہ موسکو والے اہل لینن گراد سے شدید قسم کی مخاصمت برتتے ہیں ۔ یہ محض چشمک کی بات نہیں ہے ۔ لینن گراد موسکو کو غاصب سمجھتا ہے جو لینن گراد کی ہر راہ

کو بند کردینے پر ہمہ وقت کمربستہ رہتا ہے ۔ بڑی دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے حالات ہر ملک میں ہوتے ہیں ۔ جب بنگلہ دیش مشرقی پاکستان تھا تو ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں چشمک تھی ۔ سنا ہے کہ بنگلا دیش اس میں کوئی کمی نہ کرسکا ۔

میرا خیال ہے کہ لینن گراد اور موسکو میں وہی حال ہے کہ جو کراچی اور اسلام آباد میں ہے ۔ خیر لینن گراد سے موسکو والے خوش نہیں رہتے ۔ سنا ہے کہ اب تو موسکو کے لوگ لینن گراد کو مسخر کرنے پر آمادہ ہیں اور خود کو بڑا شہری کہتے ہیں ۔ لینن گراد والے خود کو موسکو سے اعلا اور برتر سمجھتے ہیں ۔ اس بات کا احساس بھی ہوا کہ اب موسکو والے لینن گراد کو اول درجے کا شہر کہنا چاہتے ہیں' مگر اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ موسکو کو دوسرے نمبر کا شہر کہیں یا سنیں ۔ خیر یہ ان کے اندر کے حالات ہیں ۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تہذیب و ثقافت اور علم و حکمت کے اعتبار سے لینن گراد کو برتری حاصل ہے ۔ پھر اگر تعمیرات کو دیکھا جائے تو درحقیقت لینن گراد خوب صورتیوں کا شہر ہے ۔ یہاں ہر عمارت حسن رکھتی ہے اور ہر تعمیر جمال کی حامل ہے ۔ نیوا دریا کے کناروں پر آباد اس اس شہر کا ہر گھر محل ہے ۔ کہنا مجھے چاہیے کہ یہ شہر محلات ہے ۔ لینن گراد میں کوئی عام مکان کم از کم مجھے تو نظر نہیں آیا ۔ اور پھر محلات ایسے نہیں کہ جیسے دہلی کا لال قلعہ یا تاج محل یا فرانس کا وارسائی یا لندن کا بکنگھم پیلس ۔ ان عمارات کی اور ان محلات کی کیا حقیقت ہے جن کے لیے ہندستان کے مغل کو خواہ مخواہ انگریز نے بدنام کیا ہے ' ان مغلوں کے محلات تو لینن گراد کے معمولی درجے کے محلات کے سامنے پانی بھرتے ہیں ۔

لینن گراد کی تاریخی حیثیت

روس میں شہر لینن گراد کو خاص تاریخی اہمیت حاصل ہے ۔ اسی شہر میں روس کا پہلا انقلاب ۹ جنوری ۱۹۰۵ء کو برپا ہوا تھا اور اسی میں اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب شروع ہوا ۔ لینن نے اسی شہر میں اپنے اقتدار کا آغاز کیا ۔ پھر دوسری عالم گیر

جنگ میں جرمنی نے ۹۰۰ دن تک اس شہر کا محاصرہ جاری رکھا ' لیکن بہادر روسیوں کے آہنی عزم کے سامنے اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی ۔ اس لحاظ سے یہ شہر روس میں آزادی اور عزم کا نشان سمجھا جاتا ہے ۔

اس شہر کے تمام نشیب و فراز تاریخ میں قلم بند ہیں ۔ ۱۶ مئی ۱۷۰۳ء کو پیٹر اعظم اول نے نیوا کی جزیرے پر ایک قلعے کی صورت میں اس شہر کی بنیاد رکھوائی ۔ ۱۹۱۴ء تک اس کا نام سینٹ پیٹرز برگ تھا ۔ ۱۹۱۴ء سے اسے پیٹروگراد کہا جانے لگا ۔ لینن کی موت کے بعد ۱۹۲۴ء میں اس کا نام لینن گراد رکھا گیا ۔

اس کا رقبہ ۶۰۰ مربع کیلومیٹر اور آبادی ۵ ملین ہے ۔ یہ شہر دریائے نیوا کے دونوں کناروں پر آباد ہے ۔ دریائے نیوا یہیں پر بحیرہ بالٹک میں مل رہا ہے ۔ شہر کے بائیں کنارے پر سب سے بارونق اور شہر کے ہر شعبے کا مرکز نیوسکی پر سپکٹ ہے (پر سپکٹ خیاباں کو کہتے ہیں)

نیوا کے دونوں کناروں کے درمیان ' اس کے دہانے پر کئی جزیرے ہیں جن میں ایک جزیرے کا نام پیٹروگراد اسکوئر ہے جس میں پیٹر اور پال کا قلعہ ہے ۔ دوسرے جزیرے کو واسی لیفسکی کہتے ہیں ۔ بائیں کنارے پر ایک شاندار عمارت ایڈمیرلٹی اسکوئر ہے ۔ یہیں سے نیوسکی پر سپکٹ شروع ہوتی ہے ۔ ایڈمیرلٹی کے بڑے گیٹ پر ایک مینار ہے جس کا سونے کے ملمع والا کلس ۲۳۰ فیٹ بلند ہے ۔ ایڈمیرلٹی کے مغرب میں دسمبری اسکوئر ہے ۔ اس کے مرکز میں پیٹر اعظم کا مجسمہ ہے جس میں اسے گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے ۔ دسمبری اسکوئر کے جنوب میں سینٹ آئزک اسکوئر ہے ۔ اس گرجے کا سنہری کلس ۳۳۰ فیٹ بلند ہے ۔ اس میں اب ایک میوزیم قائم ہے ۔

ایڈمیرلٹی کے مشرق میں پیلس اسکوئر ہے جہاں ریلیاں اور مظاہرے ہوا کرتے ہیں ۔ شمال میں زار کا موسم سرما کا محل واقع ہے ۔ اس کے ساتھ ہی دنیا کا سب سے بڑا میوزیم ہرمی تیج ہے جس کے تین ملین نوادرات ۴۰۰ کمروں پر پھیلے ہوئے ہیں ۔

نیوسکی پر سپکٹ ۱۱۵ فیٹ چوڑی اور پونے تین میل لمبی ہے ۔ یہ ایڈمیرلٹی اسکوئر سے ماسکو اسٹیشن اور پھر وہاں سے الیگزانڈر نیوسکی **مانسٹری** تک پھیلی ہوئی ہے ۔ اس **مانسٹری** (راہب خانے) میں روس کے کئی ادیبوں اور فن کاروں کی قبریں ہیں ۔ مثلاً دوستو یفسکی اور چائیکو فسکی (موسیقار) ۔ اسی خیابان پر کازان کیتھیڈرل اور گوسٹینی ڈوور (شاپنگ آرکیڈ) واقع ہیں ۔ بائیں کنارے پر کئی اور مشہور عمارتیں اور اسکوئر ہیں ۔

دائیں کنارے پر لینن گراد یونی ورسٹی اور کئی میوزیم اور علمی ادارے ہیں ۔ لینن گراد میں بحری جہاز سازی کے کارخانے ' بجلی کے جنریٹر اور ٹربائین بنانے کے کارخانے ' مشین ٹول اور **انسٹرومنٹ** بنانے کے کارخانے ' پرنٹنگ مشینیں بنانے کے کارخانے ' ٹیکسٹائل ' کاغذ سازی اور چمڑے کی صنعتیں قائم ہیں ۔ لینن گراد میں جوتے اور ملبوسات ' کیمیکلز ' کھاد ' ربر کا سامان ' کاسمیٹک اور فارماسوٹیکل صنعتیں بھی ہیں ۔

لینن گراد کے ساتھ ایک اوبلاسٹ (ریجن) بھی ملحق ہے جو جنگلات ' کاشت کے فارموں ' الیکٹرک سپلائی ' آئل ریفائنری اور کئی دیگر صنعتوں پر مشتمل ہے ۔ اس شہر کی توسیع اور ترقی کا کام اب بھی زور شور سے جاری ہے ۔

لینن گراد بوٹانیکل گارڈن ر میوزیم

سال گزشتہ جب میں نے لندن میں کیو گارڈنز کا مطالعہ کیا تھا تو وہاں سے یہ خبر ملی تھی کہ لینن گراد کا باغ نباتات اور اس کی بوٹانیکل لائبیری کا شمار دنیا میں سب سے بڑی لائبریری کے طور پر ہوتا ہے ۔ خود کیو گارڈنز ایک عظیم الشان چیز ہے اور ایک شخص نے اپنی محدود زمین پر اس کا آغاز کیا تھا اور پھر حالات زمانہ اس کے موافقت میں رہے ۔ حتیٰ کہ یہ کیو گارڈنز دنیا کا ایک بہترین گارڈن بن گیا اور پھر یہ محض ایک باغ نہ رہا ' یہاں طلبہ نباتات کے لیے سرزمین کیو گارڈن پر تعلیم کا سامان ہوا ۔ دنیا بھر کے نباتات یہاں اگا دیے گئے ۔ ایسے ایسے " ہاٹ

ہاؤسز" بنائے گئے کہ ان کی مثال نہیں۔ جب میں یہاں مطالعہ کر رہا تھا تو ایک ایسا "ہاٹ ہاؤس" تیار تھا جس کا افتتاح خود ملکہ برطانیہ نے کیا۔ انگلستان کے علم النباتات کے طلبہ کے لیے کیو گارڈنز مرکز تعلیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالباً ایک ملین نباتات کے نمونے کیو گارڈنز میں موجود ہیں اور ایک لاکھ کتابوں کی لائبریری ہے جو علم النباتات سے تعلق رکھتی ہے۔ جب میں دورۂ روس کا پروگرام بنا رہا تھا تو میں نے لینن گراد کو اہمیت کے ساتھ شریک پروگرام اس لیے کیا تھا کہ یہاں دنیا کا ایک بڑا باغ نباتات ہے۔

آج صبح سب سے پہلا پروگرام لینن گراد کے باغ نباتات کی سیر رہا۔ درحقیقت یہاں لینن گراد میں کسی کو بھی اس باغ اور اس کی عظیم لائبریری کی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اگر احساس ہوتا تو پھر ہم کو صبح نو بجے ہی یہاں آجانا چاہیے تھا۔ جب کہ ہم نہایت اطمینان سے بہ مشکل ساڑھے دس بجے پہنچے۔ میوزیم کی ڈائریکٹر خود بھی علم النباتات میں پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ وہ ہماری منتظر تھیں۔ اس سے تکلیف ہوئی کہ سخت سردی میں ہماری کار کو دروازے کے باہر روک دیا گیا اور اندر دور ہمیں جانا پڑا۔ مگر اس سے وقت ضائع ہونے کی تکلیف سے زیادہ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ محترمہ گالینا وی دیلی اور ڈاکٹر جی زبکووا نے ہمارا پرجوش استقبال کیا محترمہ گالینا نہایت ہی ہنس مکھ خاتون۔ اپنے علم سے بے پناہ محبت۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ میوزیم گھول کر ہمیں پلا دیتیں۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس میوزیم نباتات کی ایک ایک چیز دکھائیں اور سمجھائیں۔ مگر ان کو ہمارے وقت کی تنگی کا دکھ تھا اور احساس۔ بارے جب تک ہم ان کے ساتھ رہے وہ علم کے دریا بہاتی رہیں!

ہاں، جب سعدیہ بیگم، ڈاکٹر لدمیلا واسی لیو، الیکسی اور میں یہاں پہنچے تو ڈاکٹر گالینا وی دیلی صاحبہ نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ کے علم میں اس باغ نباتات کی حقیقت کیسے آئی اور یہاں آنے کا محرک کیا ہے؟ ڈاکٹر لدمیلا نے میری دلچسپی بتا دی جو بہ حیثیت طبیب نباتات سے مجھے ہے۔ میں نے یہ بتا دیا

کہ کیو گارڈنز لندن کے مطالعے کے وقت وہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ لینن گراد کا باغ اور میوزیم بھی لائق توجہ ہے اور یہی چیز مجھے دور دراز سے یہاں لائی ہے۔ اس میوزیم میں ستر ہزار نمونہ ہائے نباتات ہیں۔ میں نے یہاں بعض چیزوں کے فوٹوگرافس بھی لیے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس میوزیم پر کوئی معلوماتی کتاب حاصل نہیں ہو سکی۔

اس مطالعہ سرسری کے بعد میرا اصرار تھا کہ مجھے لائبریری لے چلیے۔ مگر ایک اور خاتون نے ہمیں اچک لیا۔ وہ خود بھی نباتات کے علم میں ڈاکٹر ہیں۔ ان کا موضوع ہاٹ ہاؤسز ہیں۔ میں نے اظہار کیا کہ ہاٹ ہاؤسز میں نے دنیا بھر میں بہت دیکھے ہیں جہاں خاص درجہ حرارت میں دنیا بھر کے پودے پرورش پاتے ہیں۔ میں ہاٹ ہاؤس میں اپنا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا بلکہ لائبریری دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر اس خاتون پر جنون سوار تھا اور اس نے از اول تا آخر ایک ایک ہاٹ ہاؤس کی دید شنید میں وقت کا بڑا حصہ صرف کر دیا۔ لینن گراد کے اس باغ نباتات میں اس سائز کے ۲۸ ہاٹ ہاؤسز تھے مگر محاصرہ لینن گراد اور لینن گراد پر بمباری کے دوران ۲۷ ہاٹ ہاؤسز تباہ و برباد ہو گئے۔ دوران جنگ و جدال محاصروں کی مدتیں کم و بیش رہی ہیں، مگر دوسری جنگ عظیم میں محاصرہ لینن گراد کی مدت نو سو دن ہے۔ اس محاصرے کے دوران سخت سردیاں بھی آئیں۔ لاتعداد لوگ سردی سے مر گئے۔ لاتعداد لوگ بھوک سے مر گئے۔ غرض دوران محاصرہ موت کا بازار گرم رہا، اور لینن گراد پر موت طاری ہو گئی۔ میری مترجمہ ڈاکٹر لدمیلا واسی لیو (ڈی لٹ اردو) نے بتایا کہ ان کے خاندان کا ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا۔ یہ لینن گراد کی رہنے والی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ دوران محاصرہ باغ نباتات کیسے زندہ رہ سکتا تھا!

اب جب میں لائبریری میں پہنچا تو وہاں کی نگراں خاتون نے اپنا سر پیٹ لیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر سعید کے لیے وہ چیزیں نکال کر رکھی ہیں جو دنیا میں کہیں نہیں ہیں۔ یہ آپ نے ڈاکٹر لدمیلا ہاٹ ہاؤس میں وقت کیوں برباد کیا ہے۔

اس خاتون محترم کا جنون فزوں ہو گیا جب میں سہ پہر کے پروگرام کو بھول کر کتب نباتات دیکھنے بیٹھ گیا ۔ درجنوں کتابیں ہیں جن کی دنیا میں کوئی مثل نہیں ہے ۔ نباتات کی قلمی تصاویر کے کئی البم ایسے ہیں جو اسی ہال میں محفوظ ہیں ۔ ایک البم ایسا دل نواز ہے کہ مصور نے جس نبات کی تصویر بہ مہارت کمال بنائی ہے اس کے ساتھ کوئی تتلی ' کوئی پرندہ ' کوئی کیڑا وغیرہ بھی ضرور بنایا ہے ۔ ہر ہر صفحہ مرقع حسن و جمال ہے ۔

ایک اندازہ یہ ہوا کہ اس لائبریری ' بلکہ بہ حیثیت مجموعی لینن گراد کے اس باغ نباتات پر توجہات کم ہیں یا شاید بالکل نہیں ہیں ۔ میں نے دوران تبادل خیال اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس عظیم ذخیرے کو دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنا اچھا نہیں لگتا ۔ میں نے پیش کش کردی ہے کہ بیت الحکمت اور لینن گراد بوٹانیکل لائبریری ان نادر ذخائر کی طباعت و اشاعت میں تعاون کر سکتے ہیں ۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اس خاتون محترم کو اس سے اتفاق رائے ہے ۔ انھوں نے اشارۃً یہ بتایا ہے کہ نئے قوانین کے مطابق روس میں ادارے اب اپنے فیصلے خود کرنے کے مجاز ہو گئے ہیں اس لیے اس میوزیم اور بیت الحکمت کے مابین روابط علمی کی استواری آزادانہ ہو سکتی ہے ۔

لنچ ۔ دودھ ' واہ واہ!

جب وقت کی قلت ہو تو میں کھانے پینے میں اپنی دل چسپی ختم کر دیتا ہوں ۔ مگر میں تنہا نہیں ہوں ۔ میری وجہ سے سعدیہ بھی منہ بند کر سکتی ہیں ' مگر میں جواں سال ڈاکٹر لدمیلا اور نوجوان الیکسی سے کیسے کہتا کہ لنچ چھوڑ دو ' کام کرو! ہوٹل میں لنچ تیار رہتا ۔ میں نے آج پہلی بار سیر ہو کر دودھ نوش جان کیا ۔ شب گزشتہ ڈاکٹر لدمیلا سے دودھ کا ذکر آ گیا تھا ۔ اب تک کے سفر میں دودھ نہیں ملا ہے ۔ ہوٹلوں کے ریستورانوں میں دہی جس قدر چاہے لے لیجیے ' دودھ کی بات گراں گزرتی ہے! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ مجھے بارہا روس میں یہی تجربہ ہوا ہے ۔

اس لیے یہ نہ وجہ تکلیف ہوا ہے نہ موجب پریشانی!

مگر ڈاکٹر لدمیلا کو میری خاطر عزیز ہے ۔ وہ صبح ہی برف باری میں بازار نکل گئیں اور نہ جانے کہاں سے ایک ایک پینٹ کے دو ڈبے تازہ دودھ لے آئیں ۔ میں نے ان سے کہا کہ اے خاتون! تم نے اس برف باری میں کیوں یہ زحمت کی ہے! لدمیلا نے کہا کہ آپ میرے ملک کے مہمان ہیں ' آپ میرے مہمان ہیں ۔ مہمان داری کے فرائض اس قدر ہیں کہ ہم خود کو ادا کرنے سے قاصر محسوس کرتے ہیں ۔ آج لنچ میں میں نے دودھ ڈبل روٹی سے سیری حاصل کی ۔ باقی لوگ نہ جانے کیا کیا کھاتے رہے ۔ ڈاکٹر لدمیلا نے سعدیہ کو ایک پلیٹ کھانے سے روک دیا ' "نہیں یہ کافروں کی غذا ہے!"

"کیا ہے یہ؟"

لدمیلا نے بتایا کہ لحم خنزیر ہے! سعدیہ نے ہاتھ روک لیا ۔ لدمیلا نے ہاتھ دراز کر دیا ۔ بھئی ہم تو کافر ہیں! یہ کہہ کر گوشت نوش جان کر لیا ۔ میں نے کہا کہ طبی اعتبار سے ثابت ہو چکا ہے کہ لحم خنزیر سخت ضرر رساں ہے اور موجب امراض!

سیر لینن گراد یا سیر محلات!

سچ تو یہ ہے کہ سیر لینن گراد کے لیے سیر محلات کہنا صحیح تر ہے ۔ اس شہر میں مجموعی طور پر تین سو بیس پل ہیں ' اوور ہیڈ برج ۔ ان میں سے اکیس پل ایسے ہیں کہ جو بحری جہازوں کے گزرنے کے لیے کھل جاتے ہیں ۔ بعض دونوں طرف سے کھل جاتے ہیں ۔ اس سے لینن گراد کی وسعت اور حسن و جمال کا تصور کیا جا سکتا ہے ۔ یہ شہر دریائے نیوا کے کناروں پر آباد ہے ۔ یہاں حسن وینس بھی مات کھا جاتا ہے ۔ میں اٹلی کے عالمی شہرت یافتہ شہر وینس میں ایک بار ۹ دن مسلسل رہا ہوں ۔ یہ وہ دن تھے کہ جب ہم دنیا کے چند انسان دوستوں نے وینس کے سینی فاؤنڈیشن میں بیٹھ کر "اسلام اینڈ دی ویسٹ انٹرنیشنل" کی بنیاد ڈالی تھی ۔

انگلستان کے لارڈ کیروڈان نے صدارت کی تھی۔ امریکا کے میرے دوست ایڈورڈ کلنچی اس کے محرک تھے۔ انھوں نے دنیا بھر سے ۲۰ آدمیوں کا انتخاب کیا تھا۔ اس انتخاب میں میں بھی تھا۔ ابوظہبی کے پروفیسر عزالدین ابراہیم بھی تھے۔ سابق وزیر اعظم شام ڈاکٹر معروف الدوالبی (حال مشیر شاہ سعودی عرب) وغیرہ بھی جمع ہوئے تھے۔ میں نے اس تنظیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا کہ اس کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ مغرب کو اسلام کی فہم سے مالا مال ہونا چاہیے۔

افسوس یہ ہے کہ اسلام اینڈ دی ویسٹ کے جلسہ پیرس میں بعض لوگوں نے عہدوں کا لالچ کیا اور عہدے حاصل کرکے عمل کے میدان سے دور ہو گئے۔ سوئزرلینڈ کے ایک دوست جنرل سکرٹری بن کر ایسے خاموش ہوئے کہ دم تک نہ مارا۔ پاکستان سے ایک شخصیت کو میں نے متعارف کرایا۔ وہ عہدے پر ایسے فائز ہوئے کہ ان سے آج تک اس موضوع پر بات تک نہ ہوئی۔ اس دوران لارڈ کیرو ڈان پروفیسر ہوکر پرنسٹن چلے گئے اور ان سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ ڈاکٹر معروف دوالبی صدر بنے مگر ایک دن بھی وہ اس جماعت کے درد کا مداوا نہ فرما سکے۔ میں نے عربی، فرانسیسی، انگریزی میں اس انجمن سے متعلق بہترین لٹریچر طبع کراکے اسے دنیا بھر میں تقسیم کرایا۔ مگر جنیوا کا دفتر ایسا کہ اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اب یہ عالمی انجمن بس نام کی ہو کر رہ گئی ہے۔ شاید سات آٹھ ماہ ہوئے میں نے جنیوا کے دوست کو لکھا۔ مگر وہ گول ہو گئے اور ساری محنت انھوں نے اکارت کر دی۔

اسلام کا یہ انداز فکر صحیح ہے کہ عہدوں کے پیچھے نہ بھاگو۔ ذمہ داری قبول کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ذمہ داری قبول کرکے فرائض ادا نہ کرنا بڑا عذاب ہے۔

آج اسلام اینڈ دی ویسٹ کا جو حال ہوا ہے وہ حال وینس کا بھی ہوگیا ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہے کہ وینس کا پانی آلودگیوں سے اٹ گیا ہے اور اس میں عجیب و غریب دریائی جانوروں کا قبضہ ہو گیا ہے جنھوں نے وینس کی زندگی کو گھن لگا دیا

ہے۔

لینن گراد کا دریائے نیوا صاف شفاف ہے۔ اس پانی میں شہر کے محلات کے عکس عجیب بہاریں دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں لینن گراد ایک بہت بڑی بندرگاہ بھی ہے۔

بات پلوں کی ہو رہی تھی کہ ان کی تعداد تین سو بیس ہے۔ مجھے اتفاق سے کراچی کی یاد آگئی جہاں ان دنوں ایک اوور ہیڈ برج ناظم آباد میں بن رہا ہے۔ یعنی داغ بیل پڑی ہے۔ تعمیر تو مہینوں بلکہ برسوں دور ہے۔ اس ایک برج کا ایک طوفان شہرت برپا ہے۔ گویا یہ کوئی عجوبہ روزگار کارنامہ ہے۔ بڑے جلسے ہو رہے ہیں۔ داد و تحسین کے شادیانے بج رہے ہیں۔ سڑکوں پر بڑے بڑے اعلانات آویزاں ہیں اور مبارک باد و تبریک کے پیغامات دیے جا رہے ہیں۔ ہم پاکستانی فکری طور پر مفلوج ہوگئے ہیں اور ہماری بے عملی کا رونا دنیا روتی ہے۔ مگر ہم شہرت کے رسیا ہیں۔ کام کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ شہرت کے پیچھے ایسے بھاگتے ہیں کہ سانس پھول پھول جاتا ہے اور ہم بے دم ہو جاتے ہیں۔

میرا انداز فکر یہ ہے کہ کراچی کے حالات ایسے دل دوز ہیں کہ ان پر توجہ کے لیے دلوں کو ہمدردیوں سے مملو ہونا چاہیے۔ یہ شہر ہمدردیوں کا مستحق ہے۔ اس شہر کا مسئلہ ٹریفک بے حد دردناک اور الم ناک ہو چکا ہے۔ اس شہر کے لیے ڈھائی سو بسیں کوئی ۱۵ سال سے آرہی ہیں۔ ہر حکومت یہی اعلان کرتی ہے اور بسیں ہیں کہ ان کا دیدار آج تک نہیں ہوا ہے۔ سندھ کی ہر حکومت مسئلہ ٹریفک سے قطعی لاپروا رہی ہے۔ میں اس لاپرواہی کو غفلت کہہ کر حق ادا نہیں کر سکتا، میں کہوں گا کہ اس شہر کے ساتھ یہ مجرمانہ سازش ہے کہ اس کے ہر مزدور کو، ہر طالب علم کو، ہر انسان کو پریشان رکھا جائے۔ غضب خدا کا ایک مزدور فیکٹری میں آنے جانے پر روزانہ کم از کم دو گھنٹے صرف کرنے پر مجبور ہے اور پھر بھی وہ بسوں میں لٹک کر اور اٹک کر سفر کرتا ہے۔ کیا یہ انسانیت ہے؟ شرافت ہے؟ لاریب یہ انسان کو اس کے حق سے محروم کرنا ہے جو صریحاً منافی انسانیت ہے۔

کراچی کی سڑکوں پر چلنے والی موٹر کاروں ، بسوں ، رکشاؤں کی تعداد کوئی چھ لاکھ ہے ۔ یہ سب ٹیکس دیتے ہیں ۔ یہ ٹیکس اس لیے ہوتا ہے کہ سڑکوں کا حال ٹھیک رکھا جائے اور ٹریفک کے نظام کو حسب ضرورت اور حسب حال رکھا جائے ۔ کراچی کی سڑکیں موٹر کاروں ، بسوں اور رکشاؤں اور موٹر سائکلوں سے بھری ہوئی ہیں ۔ سڑکوں کی جو ناپ ہے اب موٹر کاروں وغیرہ کا ناپ بھی وہی ہے ۔ سڑکیں چوڑی نہیں کی جا سکیں ۔ چوراہوں پر جو جم غفیر ہو جاتا ہے اس نے رفتار کو ست کر دیا ہے ۔ جو سفر منٹوں میں ہونا چاہیے وہ گھنٹوں میں ہوتا ہے ۔ ایسے حالات میں بڑے چوراہوں پر برج بنانا حکومت کا فرض ہے ۔ اگر یہ فرض آج تک ادا نہیں ہوا ہے تو یہ غفلت ہے اور ظلم و غفلت پر اظہار افسوس اور اظہار معذرت نہ کرنا اور ایک برج کا منصوبہ بنا کر اس کی تشہیر کرنا اور تشکر و تبریک کے ڈونگرے برسانا کسی طرح صحیح نہیں ہے ۔ یہ نہایت سنگین مذاق ہے !

توبہ ! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ بات لینن گراد کی ہو رہی تھی ۔ آج پروگرام یہ رہا کہ لینن گراد کا طائرانہ جائزہ لیا جائے ۔ ہمارے ساتھ ایک ماہر گائڈ خاتون ہیں جو لینن گراد کا چپا چپا جانتی ہیں ۔ ان کے ساتھ عالی شان ، نہایت خوب صورت سڑکوں سے گزرے اور پھر عمارات کی دید کا سامان ہوا ۔ ہر عمارت ایک محل ہے ۔ لینن گراد میں عمارت اور مکان تو کوئی ہے ہی نہیں ۔ بس محلات ہی ہیں !

شہر بھر میں گرجاؤں کی حسین و جمیل سنہری کلغیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں ۔ دریائے نیوا میں ان کی جھلکیاں دل فریب ہیں ۔ نہایت عالی شان کتھیڈرل یہاں ہیں ۔ سینٹ پیٹرس کتھیڈرل یہاں دنیا کا دوسرا بڑا کتھیڈرل ہے ۔ اس کے مینار وغیرہ سب سونے کے ہیں ۔ ان ہی میں دور ایک مسجد کے دو مینار اور گنبد بھی نظر آئے ۔ آج ہی سہ پہر لینن گراد میں برف باری شروع ہوئی ہے ۔ مگر یہ برف باری میری سیر میں حائل نہیں ہوئی ۔ دیکھا کہ اس مسجد کی مرمت کا کام بڑے پیانے پر جاری ہے ۔ نام اس کا تاتاری مسجد ہے ۔ مسجد سمرقند کا نمونہ ہے ۔ نیلے ٹائلوں

سے مینار و گنبد مزین ہیں ۔ مرور ایام نے اس کا حسن چھین لیا ہے ۔ موسم سخت دھندلایا ہوا ہے ، مگر فوٹو میں نے لے ہی لیا ۔ اتنے میں ڈاکٹر لدمیلا موٹر کار سے اتریں اور میرے پاس آگئیں ۔ ہم دونوں نے مل کر اس برف باری میں مسجد کا دروازہ تلاش کیا ۔ اندر دیکھا کہ بے اندازہ سامان تعمیر جمع ہے ۔ نیلے ٹائل ہزارہا موجود ہیں جو میناروں پر لگائے جا رہے ہیں ۔

اندر کوٹ یارڈ میں امام صاحب کا مکان ہے ۔ امام صاحب نے ہمیں دیکھا تو باہر تشریف لے آئے ۔ علیک سلیک ہوئی ۔ وہ روسی زبان ہی جانتے ہیں ۔ ڈاکٹر لدمیلا کے توسط سے ان سے باتیں ہوئیں ۔ ان سے معلوم ہوا کہ لینن گراد میں ستر پچھتر ہزار مسلمان ہیں ۔ یہ جامع مسجد تاتاری جمعہ کو ایک بجے سے چار بجے تک کھلتی ہے اور ہزار دو ہزار نمازی نماز جمعہ ادا کرنے آتے ہیں ۔ ویسے روزانہ مسجد ایک بجے سے تین بجے تک کھلتی ہے ۔ اس مسجد کی مرمت حکومت بڑے پیانے پر کرا رہی ہے ۔

لینن گراد میں ، بلکہ پورے روس میں دکانوں کے نام نہیں ہوتے ، بلکہ دکانوں میں جو کام ہوتا ہے وہ لکھا ہوا ہوتا ہے ۔ مثلاً ایک دکان کے سامنے خاصے تیس پینتیس لوگ قطار لگائے کھڑے تھے ۔ بورڈ پر لکھا تھا " فرنیچر کی دکان " ظاہر ہے کہ یہ پرائیویٹ دکان نہیں ہے ، حکومت اس کی مالک ہے ۔ اندر جھانکا تو فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں ۔ پھر یہ مجمع ؟ معلوم ہوا کہ فرنیچر چند عدد آئیں گے اور پانچ چھ خوش قسمتوں کو مل جائیں گے ۔

لینن گراد میں ایک تاثر یہ ملا ہے کہ موسکو میں عظیم گوربا چوف کے خلاف ان کے دوست ہی محاذ آرا ہیں ۔ وہ اشیائے ضروریہ کا قحط جان بوجھ کر پیدا کر رہے ہیں تاکہ عوام گوربا چوف کے خلاف کھڑے ہو جائیں ۔ اکثر و بیشتر دکانیں سامان سے خالی ہیں ۔ ہاں لینن گراد کی سوپر مارکیٹ میں تو مال بہت ہے ۔ مگر میں نے اندر جا کر گھس بیٹھ کر مطالعہ کیا تو خریداروں کی تعداد مال سے زیادہ ہے ۔ ہر دکان کے سامنے جمگھٹے لگے ہوئے ہیں ۔ پھر بھی ہم نے ہمت کر کے کچھ خرید لیا !

قابل لحاظ اور لائق قدر

میں نے لینن گراد میں جس چیز کو نہایت مسرت کے ساتھ نوٹ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سیکڑوں ہزاروں محلات میں علمی کام ہو رہے ہیں ۔ درجنوں بلند پایہ انسٹی ٹیوٹ یہاں قائم ہیں ۔ بہت سے محل تعلیم گاہیں بن چکے ہیں ۔ اکثر محلات کو میوزیم بنا دیا گیا ہے ۔ بہت سے محلات ٹریننگ سنٹر ہیں ۔ نیول ٹریننگ کے مراکز کئی ہیں ۔ اس لیے کہ لینن گراد بہت بڑا سی پورٹ ہے ۔ غرض لینن گراد کے محلات مراکز تعلیمات بن گئے ہیں ۔ خوش قسمتی سے روس میں اب نئے نوابین نہیں بن رہے ہیں۔ اگر وہ ہوتے تو وہی ان محلوں میں رہتے ۔ ہمارے پاکستان میں غربتوں کے کھنڈرات میں نئے نوابین نے بڑی کثرت سے محلات تعمیر کیے ہیں ۔ کراچی کو دیکھئے تو اب ایک ایک مکان پر کروڑوں روپے صرف کیے جا رہے ہیں ۔ اس چشم گنہ گار نے ان لوگوں کے محلات تعمیر ہوتے اس شہر کراچی میں دیکھے ہیں جو عوام کی حالت زار پر رات دن آنسوے بہاتے ہیں ۔ ان رہنماؤں کا اندرون یہ ہے کہ وہ محلوں میں رہتے ہیں ۔ روس میں یہ بدترین منافقت نہیں ہے ۔ روس میں انسانیت اور شرافت کے ساتھ ایسا استہزا روا نہیں ہے ۔ یہاں محلات عوام کے مقامات ہیں ۔ یہاں حسین سڑکیں عوام کے آرام کا ذریعہ ہیں ۔ یہاں باغات عوام کے لیے ہیں ۔ خواص روس میں نہیں پائے جاتے!

روسی سرکس

لینن گراد میں دو ہی دن تو ہیں ۔ ہم ان دو دنوں کا ایک منٹ بھی خالی جانے دینا نہیں چاہتے ۔ سیر لینن گراد سے واپس آئے اور فوراً ہی تیار ہو کر ہم ۷ بجے سرکس پہنچ گئے ۔ ہزار ہا انسان یہاں جمع تھے ۔ بچے ' بڑے اور بوڑھے ۔ روس میں کوئی سیرگاہ خالی نہیں ملتی ۔ لینن گراد میں آج برف باری ہو رہی ہے مگر کام سب جاری ہیں ۔ سرکس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے ۔ آنکھ دیکھنے کے لیے زمین نہیں ہے ۔ ارینا کے چاروں طرف کوئی پندرہ بیس ہزار نشستیں تو ہوں گی ۔ دو گھنٹے کا پروگرام تھا

مگر ایسا لگا کہ منٹوں میں ختم ہوگیا ۔ رات دس بجے ہوٹل واپس آگئے ۔

دیکھا تو کمرا برف خانہ بنا ہوا ہے ۔ گو سینٹرل ہیٹنگ جاری ہے ' مگر کھڑکیوں کے روزنوں میں سے ہوا چھن کر اندر آرہی ہے ۔ ویسے بھی درجہ حرارت مائنس سات آٹھ ہوگیا ہے ۔ اب تو رات گزارنی ہی ہے ' ضرور گزرے گی!

۱۶ نومبر ۱۹۸۹ء ۔ جمعرات

لینن گراد

برف باری اور باد و باراں میں ایک کتابوں کی دکان دکھائی دے گئی اور میں بے قرار ہوگیا۔ میں نے موٹر کار رکوائی ۔ اترا' بھیگا ۔ ڈاکٹر لدمیلا کب تنہا جانے دیتیں ۔ میرے ساتھ وہ بھی ' اور ہم دونوں دکان کے اندر! یہ لینن گراد کی سب سے بڑی کتابوں کی دکان ہے ۔ اس میں موضوعات کے اعتبار سے کتابوں کے شعبے ہیں ۔ طلبہ کے لیے کتابوں کا حصہ الگ ہے ۔ اہل علم و حکمت سے متعلق کتابوں کا حصہ جدا ہے۔ دو منزلہ دکان ہے ۔ اس میں ہزاروں خریدار دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا ۔ میرے پاکستان میں کتابوں کی دکانیں ویران ہوا کرتی ہیں اور اہل علم و حکمت پریشان ہوا کرتے ہیں ۔ صاحبان فضل وکمال اپنی تحقیقات دربدر لیے پھرتے ہیں ۔ کوئی چھاپتا نہیں ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں کہ جو کئی کتابیں لکھ کر مرگئے اور ان کے مسودات ضائع ہوگئے یا دوسروں نے ان کو اپنے نام سے چھاپ لیا ہے ۔ یہاں کتابوں کی دکان میں اہل علم کا ایسا مجمع تھا جیسا ہمارے ہاں نورجہاں کے گانے کے لیے "صاحبان ذوق" ٹوٹے پڑتے ہیں ۔ یہاں اگر تھیٹروں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے تو یہاں علم و حکمت کے مقامات بھی لوگوں سے بھرے ملتے ہیں ۔

دور سے مجھے ایک ڈکشنری دکھائی دے گئی ۔ عربی روسی لغت ۔ میں نے بے قرار ہوکر اسے خرید لیا ۔ اردو میں روس میں طبع شدہ ایک افسانوی کتاب بھی میں نے خرید لی ۔

انجمن دوستی ۔ شاخ لینن گراد کا دفتر

۱۰ بجے انجمن دوستی کے دفتر پہنچ گیا ۔ وہاں ڈائریکٹر صاحب کو اپنا منتظر پایا ۔ میں نے ان کی مہمان داری کا شکریہ ادا کیا ۔ پھر پاکستان روس تعلقات پر باتیں ہوئیں ۔

یہاں انھوں نے لینن گراد چلڈرنز فنڈ کی خاتون ڈائریکٹر کو بھی بلا رکھا تھا ۔ میں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے روس میں بچوں کا کوئی مرکز دکھا دیا جائے ۔ وقت کم تھا۔ مرکز تو نہ جاسکے ' ہاں مرکز والے یہاں ملنے آگئے ۔ تبادل خیال ہوا ۔ یہاں یتیم بچے بھی ہیں اور ایسے بچے بھی ہیں جن کے والدین ان کا خرچ برداشت نہیں کرسکتے۔ تفصیلات معلوم ہوئیں کہ ایسے بچوں کی کفالت بھی آسان نہیں ہے ۔ فنڈز کم ہیں ۔ کام زیادہ ہے اور اب لینن گراد میں ایسا ہوا ہے کہ کم از کم ۳۸ فنڈ اور قائم ہوگئے ہیں۔ ان کی وجہ سے چلڈرنز فنڈ کو تکلیف ہے ۔ بارے یہ ہمت نہیں ہارے ہیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ اب ہمارے فنڈ میں ڈالر بھی ۳۷۵ ہیں ۔ تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ کچھ ایسی روسی مصنوعات فنڈز کو ملیں جن کو روس سے باہر فروخت کیا گیا اور ڈالر آئے ۔ میں نے اجازت لے کر ان ڈالر فنڈ میں ایک سو ڈالر کا اضافہ کر دیا ۔ میرا یہ عطیہ انھوں نے شرم ساری اور تشکر کے جذبات کے ساتھ قبول کرلیا۔ میں نے ان سے اجازت لے کر یہ عطیہ دیا تھا۔

یہاں سے چلتے وقت انجمن دوستی کے وائس چیرمین نے اپنے دفتر کی سیر کرائی ۔ یہ بھی محل تھا ۔ دس بارہ سنہری منقش کمرے ہیں ۔ بڑے بڑے ہال ہیں ۔ ایک رقص ہال ہے۔ ایک ڈائننگ ہال ہے وغیرہ ۔ اس محل کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ۔ اب اس میں انجمن دوستی کا دفتر ہے ۔ رقص ہال میں کوئی ایک ہزار بڑی کرسیاں رکھی گئی ہیں جہاں اجتماعات ہوتے ہیں ۔

نظام صحت کا مرکز

ہم ۱۲ بجے وقت مقررہ پر یہاں آگئے ۔ جناب ڈاکٹر میچل پتروف صدر اور جناب ڈاکٹر وکتانوکن نائب صدر نے استقبال کیا ۔ ان سے تبادل خیال ہوا ۔ یہ میڈیکل کالج میں پروفیسر ہیں ۔ انھوں نے بتایا کہ ۵ سال کا تعلیمی نصاب ہے ۔ پھر ایک سال کے لیے ہاؤس جاب کرنا ہوتا ہے ۔ اس کے بعد درجۂ تخصص ہے ۔ جو ڈاکٹر جس میدان میں تخصص چاہے اس کے لیے انتظامات ہیں ۔

حفظ صحت کی تعلیم کے باب میں مجھے بتایا گیا کہ ہماری حالت قابل اطمینان نہیں ہے ۔ ہم اس میدان میں قابل لحاظ پیش رفت نہیں کر سکے ہیں ۔ ہمیں اس پر شرم ساری ہے ۔ میرے سوال پر انھوں نے بتایا کہ لینن گراد ٹیلے ویژن مہینے میں دس دن حفظ صحت پر پروگرام دیتا ہے ۔ ریڈیو پر بھی صحت پروگرام آتے ہیں ۔ اخبارات میں بھی گاہے گاہے مضامین صحت شائع ہوتے ہیں ۔ میرا تاثر یہ ہے کہ تعلیم صحت کا شعبہ یہاں کم زور ہے ۔ اس پر مجھے خاصی حیرت ہوئی ہے ۔ مگر امریکا میں بھی حال یہی ہے ۔ وہاں ٹیلے وژن صبح ۶ بجے حفظ صحت کے پروگرام دیتا ہے ۔ امریکا میں یہ وہ وقت ہے کہ پورا امریکا سویا ہوتا ہے !

نباتاتی علاج !

میں نے سوال کیا کہ لینن گراد میں آپ کا رویہ نباتاتی علاج کے بارے میں کیا ہے ؟ مجھے اس سے اطمینان ہوا کہ یہ دونوں ڈاکٹر زبردست حامی علاج نباتات ہیں ۔ ان کی رائے ہے کہ اس موضوع پر فراخ دلانہ پیش رفت ہونی چاہیے اور ہمیں کیمیائی معالجات کو ترک کر کے فطرت کے دائرے میں داخل ہونا چاہیے ۔ میں نے ان سے تفصیل سے بات کی ۔ میں نے سوال کیا کہ بچوں کی صحت کے لیے آپ کے ہاں کیا اقدامات ہو رہے ہیں ؟ میں نے ان کو پاکستان میں منعقدہ چلڈرنز ہیلتھ کانفرنسوں پر مشتمل ہمدرد کی رپورٹ دی ۔ اس کو انھوں نے خاصی دل چسپی کے ساتھ دیکھا ۔ اعتراف کیا کہ ایسی کوئی کانفرنس ہم نے اب تک نہیں کی ہے ۔ بارے صحت اطفال پر توجہات مرکوز ہیں ۔

ہرمی تاژ ۔ لینن گراد میوزیم

لینن گراد کے اس میوزیم کا شمار دنیا کے سب سے بڑے میوزیموں میں ہوتا ہے ۔ آج اسے ہم دیکھنے گئے ۔ یہ میوزیم شہنشاہ روس کے ایک محل میں قائم ہے جس میں ایک ہزار کمرے ہیں ۔ ہر کمرا ایک ہال ہے جس میں درجنوں قد آدم تصاویر ہیں ۔ اس

میوزیم میں تین ملین اشیا ہیں ۔ ایک ملین سکے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ہم دو گھنٹے میں اس میں چہل قدمی ہی کر سکے ۔ دو چیزیں لائق توجہ تھیں ۔ ایک تو اشیائے میوزیم ۔ دوسرے خود یہ محل جس کی ہر شے عجیب و غریب ۔ اس اعتبار سے ہرمی تاژ دنیا کا سب سے بڑا مرصع میوزیم ہے ۔

یہاں دنیا کی ایک بڑی شخصیت ۸۱ سالہ میوزیم ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر بوریس پیتروفسکی ہیں ۔ ان کو عالمی شہرت حاصل ہے ۔ ماہر آثار قدیمہ ہیں ۔ ان کو بھی میرے ساتھ ابن سینا ایوارڈ ملا ہے ۔ میں اس مناسبت سے بھی ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا ۔

نہایت شفقت سے ملے ۔ اپنی دو کتابیں دیں ۔ ایک پر میں نے ان کے آٹوگرافس لے لیے ہیں ۔ اب ان سے انشاء اللہ کل موسکو میں ملاقات ہوگی جہاں یہ اور میں ابن سینا ایوارڈ وصول کریں گے ۔

رشین بیلے

رشین بیلے کو عالمی شہرت حاصل ہے ۔ شاید بیس بائیس سال قبل کراچی میں بھی یہ بیلے آیا تھا ۔ آج کی شام اس بیلے میں صرف ہوئی ۔

دوست کی تلاش

یونیسکو میں سائنس ڈویژن کے سربراہ جناب پروفیسر اے ۔ این خولودولین تھے ۔ یونیسکو سے ریٹائر ہو کر اپنے گھر لینن گراد آ گئے ۔ ان سے رشتہ منقطع تھا ۔ پتہ میرے پاس تھا ۔ انجمن دوستی سے میں نے درخواست کی کہ میرے دوست کو تلاش کر دیں ۔ انھوں نے تلاش کر دیا اور پروفیسر صاحب ساڑھے چھے بجے ہمارے ہوٹل آ گئے ۔ ان کے ساتھ ہی ہم نے کھانا کھایا ۔

۱۷ نومبر ۱۹۸۹ء ۔ جمعتہ المبارک

موسکو

گو ہمارے ٹکٹ ہوائی جہاز کے تھے مگر ہم نے صحیح فیصلہ کیا کہ لینن گراد سے موسکو بذریعہ ٹرین جایا جائے ۔ ہمارے اس فیصلے کی تائید جناب اسلم صاحب نے بھی کی کہ جو کل انجمن دوستی میں شریک تبادل خیال تھے ۔ اسلم صاحب نارتھ ناظم آباد کراچی کے ہیں اور روس میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ انجمن دوستی عالم نے ان کو وظیفہ دیا ہے ۔ ایک سال تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور ابھی تین سال باقی ہیں ۔ شام گزشتہ ہم نے ان کو بھی ڈنر پر مدعو کر لیا تھا ۔ یہ اگلے ماہ کراچی آئیں گے ۔

رات روسی بیلے سے سوا دس بجے واپسی ہوئی تھی ۔ دو گھنٹے کا پروگرام تھا ۔ آرٹسٹوں کو بڑی دادیں مل رہی تھیں اور میں اونگھ رہا تھا ۔ میری سمجھ میں یہ بیلے ڈانس بالکل نہیں آتا ۔ یقیناً ساز و آہنگ پر کوئی کہانی بھی ہوتی ہوگی جس کی داد دینے کا میں اہل نہیں ہوں ۔ بیلے ڈانس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سارا ڈانس پیر کے پنجوں پر ہوتا ہے ۔ واقعی یہ نہایت مشکل کام ہے کہ گھنٹوں عورت (اور گاہے مرد) پیر کے پنجوں پر تمام رقصی حرکات و سکنات کرتا رہے ۔ میں اس مشکل کا احاطہ کرتا ہوں مگر میرے ذہن میں یہ سوال ضرور آتا ہے کہ آخر ایسا کرنے کی ضرورت کیا ہے ! بس اس سے زیادہ میں نہیں لکھتا ' مبادا میں غلطی پر ہوں اور بیلے ڈانس کوئی بڑا آرٹ کا عنوان ہو ! روسی بیلے کو عالمی شہرت حاصل ہے ۔ ویسے اوکسفرڈ (انگلستان) میں بھی بیلے ڈانس کو مقبولیت حاصل ہے ۔ وہاں بھی مجھے دیکھنے کا موقع ملا ہے ۔ لوگ لندن سے اوکسفرڈ جایا کرتے تھے ۔

روسی ریل میں سفر کا پہلا اتفاق ہے ۔ یہ زمانہ ہوائی جہاز کا ہے ' اب ریل میں سفر تضیع اوقات کی تعریف میں آگیا ہے ۔ بعض مقامات پر ریل کا سفر مخدوش بھی ہے ۔

مثلاً لاہور سے کراچی آنے میں علاقہ سندھ میں جان اور مال دونوں کا خطرہ ہے ۔ اس راستے میں شرفا اور ڈرپوک لوگ سفر نہیں کرتے ہیں ۔

لینن گراد ریلوے اسٹیشن کوئی ایسی بڑی شان دار جگہ تو نہیں ہے ' مگر یہاں مسافروں کی کثرت ہے ۔ جس ٹرین میں ہم ماسکو تک جا رہے ہیں اس میں لاتعداد ڈبے ہیں ۔ کم از کم ہمارے ہاں کی ٹرینوں سے تین گنے زیادہ تو ضرور ہیں ۔ بارے ہم اپنے ڈبے تک پہنچ گئے ۔ اندر گئے تو دیکھا ایک ایک کمرے (کمپارٹمنٹ) میں دو دو بستر لگے ہوئے ہیں ۔ باہر قیامت کی سردی پڑ رہی ہے ۔ موٹر کار سے ریل کے ڈبے تک آتے آتے کان ' ناک اور ہاتھ سب سرد اور سن ہو گئے !

ریل میں اندر داخل ہوئے تو وہ خاصی گرم تھی اور کمرے تو گرمی سے بھن رہے تھے ! توبہ ' غضب کی سنٹرل ہیٹنگ تھی ۔ میں نے ایک ڈبے میں ڈاکٹر لدمیلا اور سعدیہ بیٹی کو ایڈجسٹ کر دیا اور خود میں دوسرے ڈبے میں چلا گیا ۔ سوچتا رہا ' دیکھوں کون یہاں آتا ہے ۔ کوئی عورت اگر آگئی تو ڈاکٹر لدمیلا کو اس کے ساتھ کر دوں گا ۔ کوئی روسی آگیا تو منھ میں گھنگنیاں ڈال لوں گا ۔ یہ معلوم نہ تھا کہ یہاں حیدر آباد سندھ کے مسٹر ایڈوانی سے ملاقات ہو جائے گی ۔ وہ اب نئی دہلی میں گریٹ کیلاش میں رہتے ہیں ۔ انجینئر ہیں اور موسکو میں کوئی تعمیراتی ٹھیکا لینے آئے ہیں ۔ میں نے ایڈوانی صاحب سے پوچھا ' کیا یہ صحیح ہے کہ تاشقند اور باکو میں انڈیا کے ٹاٹا ایک بڑا ہوٹل بنا رہے ہیں اور اوبرائے بھی ۔ ایڈوانی صاحب نے بتایا کہ ٹاٹا تو عرصے سے ہوٹل بزنس میں آگئے ہیں ۔ بمبئی کا مشہور نیا تاج ہوٹل ٹاٹا ہی کا ہے ۔ نئی دہلی میں تاج محل اور ہوٹل تاج بھی ٹاٹا کے ہیں ۔ تاشقند اور باکو میں ٹاٹا بڑے ہوٹل بنا رہے ہیں ۔ اب لارسن اینڈ ٹیوبرو بھی ہوٹل بزنس میں داخل ہوئے ہیں اور وہ بھی تاشقند میں ایک ہوٹل بنا رہے ہیں ۔ میں نے کہا کہ اوبرائے ہوٹل کیوں پیچھے ہیں ؟ میں نے بتایا کہ مصر کے اسوان میں اوبرائے ہوٹل ہی میں رہا ہوں ۔ قاہرہ میں بھی اہرام مصر کے برابر اوبرائے کا نہایت شان دار ہوٹل ہے ۔

رات ساڑھے بارہ بج چکے تھے ۔ کمرا سخت گرم تھا ۔ کمبل وغیرہ یہاں سب بے

کار تھے ۔ رات بھر گرمی کے مارے نیند نہیں آئی ۔ بارے صبح میں تو چھے بجے اٹھ گیا۔ نماز فجر ادا کی ' مگر روشنی نہیں کی تاکہ میرے ساتھی کو کوئی تکلیف نہ ہو ۔ سات بجے ایڈوانی صاحب بھی اٹھ گئے ۔ ان سے معلوم ہوا کہ پاکستان میں حزب اختلاف کے دو رکن ٹوٹ کر بے نظیر کابینہ میں شریک ہو گئے ہیں ۔ موسکو پاکستان سفارت خانے میں اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے !

سات بج کر ۳۵ منٹ پر ریل گاڑی موسکو ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی ۔ مگر میں سعدیہ اور لدمیلا کو جگا کر کھڑکی میں کھڑا ہو کر باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ باہر کا منظر یہ تھا کہ تمام زمین برف سے سفید تھی اور تمام مکانات کی چھتوں پر برف جمی ہوئی تھی ۔ ایڈوانی صاحب زیادہ باخبر تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ پرسوں سے موسکو میں برف باری شروع ہو چکی ہے ۔ برف باری تاخیر سے ہوئی ہے ۔ عموماً اکتوبر کے آخر اور نومبر کے شروع میں برف باری شروع ہو جاتی ہے ۔ مجھے یاد آیا آٹھ نو سال قبل میں ۷ نومبر کو موسکو آیا تھا ' یہاں سڑکوں تک پر برف جمی ہوئی تھی ۔ جس قدر موسکو قریب آرہا تھا برف سے چپا چپا سفید ملا ۔ لدمیلا بھی کھڑکی کے قریب آگئیں ۔ برف باری دیکھ کر ان کو بھی ایک دفعہ تو سردی لگ آئی ۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہم کو تو اسی برف میں مارچ اپریل تک رہنا ہے !

موسکو ریلوے اسٹیشن پر جناب گنادی صاحب موجود تھے ۔ میں نے اپنا سامان خود اتار لیا تھا ۔ اس باب میں میں ہمیشہ مستعد رہتا ہوں ۔ توبہ ہے اللہ ' غضب کی سردی ہے ۔ بتایا گیا کہ مائنس ۸ ۔ ۹ درجہ حرارت ہے ۔ قلفی جم رہی ہے ۔ ہم جلد ہی رائل موٹر کار میں سوار ہو گئے ۔ پھنیاں پھنیاں بارش کے ساتھ برف ملی ہوئی گر رہی تھی ۔ جلد ہی ہم ہوٹل پہنچ گئے ۔ ہوٹل بہت گرم تھا ۔ بڑا سکون ملا ۔ چھٹی منزل پر ہمارے لیے خاص کمرا تیار تھا ۔ یہ کوئی عام ہوٹل نہیں ہے ۔ اس میں سوشلسٹ پارٹی ہی کے خاص لوگ قیام کرتے ہیں ۔ بتایا گیا کہ حکیم صاحب آپ کو یہاں ٹھیرایا گیا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انھوں نے خاص اعزاز دیا ہے ۔ سفارت پاکستان کے جناب قاضی صاحب محترم نے فرمایا کہ روس میں پاکستان کے اچھے وفود کو

بھی یہ حضرات خاطر میں نہیں لاتے ہیں ۔ آپ کے لیے انھوں نے جو اہتمام کیے ہیں وہ بڑے اعزاز کا عنوان ہیں ۔ آپ ان کو عزیز ہیں !

ہمیں تیار ہونے میں دیر نہیں لگی ۔ شب گزشتہ میں نے کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے ۹ بجے ہلکا ناشتہ کر لیا ۔ دودھ کی ایک پیالی اور ایک ٹکڑا ڈبل روٹی ۔ باقی ہمارے دوستوں نے اطمینان سے کھایا اور خوب کھایا ۔ پونے دس بجے ہم شاہی موٹر کار "بحری بگلا" میں روانہ ہوئے اور دس بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ نووستی پریس ایجنسی کی پرشکوہ عمارت میں پہنچ گئے جو مرکز علم و حکمت ہے ۔

ابن سینا انٹرنیشنل ایوارڈ

آج میں یہاں ابن سینا انٹرنیشنل ایوارڈ وصول کرنے آیا ہوں ۔ عمارت کے اندر انٹرنیشنل جیوری کی جانب سے استقبال کیا گیا ۔ اوپر ایک بڑے ہال میں مجھے احترام کے ساتھ لے جایا گیا ۔ یہاں جیوری کے بعض اراکین اور روس کے اہل علم و حکمت جمع تھے ۔ ریڈیو موسکو اور ٹیلے وژن موسکو کے نمائندے موجود تھے ۔ نمائندگان پریس بھی تھے ۔ حیرت ہوئی کہ نمائندہ جنگ یہاں موجود نہ تھے ۔ گو میری مترجم و معاون محترمہ ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا نے نمائندہ جنگ کو پتا وغیرہ سب سمجھا دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان حضرات کا یہ ہی رویہ ہے کہ بعد از تقریب یہ متلاشی خبر رہتے ہیں۔ نمائندہ جنگ یہاں موسکو میں کوئی کاربار بھی کر رہے ہیں ۔ جنگ کی حیثیت شاید ان کے لیے ثانوی ہے ۔

پروفیسر گونکواسکی صاحب پاکستانیات کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں ۔ وہ انسٹی ٹیوٹ اورینٹل اسٹڈیز سے متعلق ہیں اور روس پاکستان دوستی کی انجمن کے نائب صدر ہیں ۔ ہال میں میرا استقبال پروفیسر گونکواسکی صاحب نے کیا ۔ وہ بے اختیار گلے ملے ۔ میں بھی ان سے گزشتہ ۲۵ سال سے ربط ضبط رکھتا ہوں ۔ دوبار وہ پاکستان میں میرے مہمان بھی رہ چکے ہیں ۔ ان کے مطالعہ پاکستان سے مجھے اتفاق نہیں ہے ۔ ان کی کتاب اس اصول پر ہے کہ موجودہ پاکستان پانچ ملک ہیں ۔ ان کو خواہ مخواہ ایک ملک

بنایا گیا ہے۔ یہ رائے یقیناً صحیح نہیں ہے اور اس کی غماز ہے کہ ان کا ذہن وجود پاکستان کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اگر ذہن تیار نہیں بھی ہے تو سیاست روس ان سے یہ بات کہلواتی ہے۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ پروفیسر گونکواسکی صاحب کے اس انداز فکر نے روس اور پاکستان کے مابین استواری تعلقات میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ میں پروفیسر گونکواسکی صاحب سے تعلق رکھنے کے باوجود پاکستان کے بارے میں ان کی منطق سے شدید اختلاف رکھتا ہوں۔

اندر ہال میں ایک شخصیت کو دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ مگر وہ یقیناً پروفیسر رشیدالدین صاحب ہیں۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں استاد ہیں۔ اہل علم ہیں۔ ہندستان میں ان کو وقار حاصل ہے۔ میری ان کی دوستی اب خاصی پرانی ہے۔ وہ ابن سینا عالمی ایوارڈ کی انٹرنیشنل جیوری کے نائب صدر بھی ہیں اور آج کی تقریب عطائے ایوارڈ کے لیے خصوصیت کے ساتھ نئی دہلی سے آئے ہیں۔ ان کو یہاں دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا اور مسرت بھی۔ اور ہماری تقریب کو پروفیسر رشیدالدین صاحب ہی نے سنبھالا ہے۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں بہت جرات اور احتیاط کے ساتھ علم کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا۔ انھوں نے قرآن حکیم اور حدیث مبارکہ کے حوالوں سے بتایا کہ قرآن علم و حکمت کا زبردست حامی ہے۔ قرآن کی آیات بھی انھوں نے پڑھیں اور حدیث کا حوالہ بھی دیا۔

" **اطلبوا العلم ولو کان بالصین** " کو بعض محدثین ضعیف فرماتے ہیں مگر آج پروفیسر رشیدالدین صاحب نے اس طرح بات کی کہ اسلام کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ تحصیل علم کرو خواہ تمہیں چین بھی جانا پڑے۔ حضرت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک علم کا کوئی مذہب اور دین نہ تھا ۔ ان کے نزدیک علم علم تھا۔ ظاہر ہے کہ چین مسلم نہ تھا۔ مگر چین تک تحصیل علم کے لیے جانے کو روا قرار دیا ہے۔ پھر ایک حدیث انھوں نے یہ پیش کی کہ عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے افضل ہے۔ اسلام میں شہید کا مرتبہ بلند تر ہے، مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عالم کے قلم کی روشنائی خون شہید

سے بھی افضل ہے۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ پروفیسر صاحب ایسی جرات مندانہ باتیں ایسے ماحول میں کریں گے۔ دل خوش ہوگیا اور قدر رشید میرے قلب و ذہن میں فزوں تر ہوگئی۔

پروفیسر صاحب نے میرے بارے میں نہایت اہم کلمات خیر ارشاد فرمائے اور ہم دونوں بھائیوں (حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید) کے کارناموں کو اجاگر کیا۔ پھر انھوں نے پروفیسر پیتروفسکی صاحب کے بارے میں انتہائی کلام یہ اختیار کیا کہ ان کی ذات سے ابن سینا ایوارڈ کا مرتبہ بلند ہوا ہے۔

اس تقریب میں چارج ڈے افیئرز سفارت پاکستان موسکو جناب محترم رعنا صاحب بھی شریک تھے۔ سفیر پاکستان چھٹی پر پاکستان گئے ہیں۔ پروفیسر رشیدالدین صاحب نے ان کو دعوت خطاب دی۔ اور پھر ماہر پاکستانیات جناب محترم پروفیسر گونکواسکی صاحب سے ارشادات کے لیے درخواست کی۔ پروفیسر گونکواسکی صاحب نے میرے بارے میں ایک لمبی تقریر کی اور مجھے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

اس کے بعد جناب محترم پروفیسر رشیدالدین صاحب نے پہلے مجھے ایوارڈ سے نوازا۔ گولڈ میڈل میرے سینے پر لگایا۔ اس کے بعد انھوں نے مشہور عالم پیتروفسکی کو ایوارڈ پیش کیا۔

مجھے خطاب کی دعوت دی۔ میری تقریر کا روسی ترجمہ ڈاکٹر لدمیلا تیار کر چکی تھیں۔ میں نے اردو زبان میں خطاب کیا اور جو میں نے لکھا تھا اس سے زیادہ بھی باتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے خاص طور پر یہ کہا کہ آج کے نہایت سنگین دور کا عنوان یہ ہے کہ ہم نے انسان کا احترام ترک کر دیا ہے۔ اس ترک احترام نے دنیا کا امن غارت کر دیا ہے۔ جب تک ہم احترام انسان قائم نہیں کریں گے دنیا میں کبھی امن قائم نہیں ہوگا۔

میں نے کہا کہ روس کے رہنما جناب میخائل گوربا چوف صاحب کا انداز فکر مجھے یہ کہنے کی جرات دیتا ہے کہ وہ احترام انسان کی ضرورت اور اہمیت کا

اُدراک کر چکے ہیں ۔ اس سے توقع کرنی چاہیے کہ ان کے انداز فکر کا سیاست عالم پر اثر پڑے گا ۔ اور توقع ہے کہ راہ امن ہموار ہوگی ۔

میں نے مزید کہا کہ یہ قول فیصل ہے کہ جو معاشرہ علم و عالم کا ناقدر داں ہوتا ہے وہ کبھی عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتا ۔ میں عالم ہونے کا دعوے دار نہیں ہوں' مگر روس میں جو پذیرائی میری ہوئی ہے وہ مجھے یہ کہنے پر اکساتی ہے کہ روس قدر دان علم و عالم ہے ۔ اگر میرا تاثر صحیح ہے تو روس کی عظمت و رفعت شبہ سے بالاتر ہے ۔ ابن سینا کی عظمت کو سلام کرنا اور ابن سینا کی رفعت کا ادراک کرنا قدر عالم ہے ۔ روس نے اس میدان میں مثبت پیش رفت کی ہے اور دنیا پر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کردی ہے ۔ ابن سینا کے نام نامی پر عالمی ایوارڈ رفعت فکر ہے اور عظمت عمل ہے ۔

میری تقریر

اسلامی تہذیب کے فیضان سے فکر و بصیرت اور علم و حکمت کی جو صبح نمودار ہوئی اس کی روشنی اور تجلی ابن سینا کی شخصیت میں نہایت انفرادیت اور جامعیت کے ساتھ نظر آتی ہے ۔ وہ فلسفی ' طبیب ' ریاضی داں ' فلکیات کا ماہر ' قانون اسلامی کا شناسا اور دنیائے اسلام کا سائنس داں ' ادیب ' شاعر اور معلم اخلاق تھا ۔ اسے بجا طور پر تاج دار علم و حکمت کا لقب دیا گیا ۔ اس کی زندگی طوفان خیز ' شور انگیز اور سبق آموز ہے ۔

اس کا پورا نام ابو علی الحسین بن عبداللہ ابن سینا ہے ۔ اہل مغرب اسے Avicina کہتے ہیں ۔ ابن سینا ۹۸۰ء میں بخارا کے قریب خرمیثن نامی ایک قصبے میں پیدا ہوا ۔ اس کے والد عبداللہ بلخ کے رہنے والے تھے ۔ وہ تلاش روزگار میں ۹۹۷ء میں بخارا پہنچے تو نوح بن منصور سامانی نے انھیں خرمیثن کا گورنر مقرر کردیا ۔ ابن سینا کا بچپن بخارا ہی میں گزرا ' جہاں اس نے دس سال کی عمر میں کلام اللہ حفظ کر لیا اور چند دوسری درسی کتابوں پر بھی عبور حاصل کر لیا ۔

ابن سینا کو مذہبی اور دینی ذوق ورثے میں ملا تھا ' لیکن یہ ذوق تقلیدی نہ تھا ' اس لیے بعض مسائل پر اسے اپنے والد سے بھی اختلاف تھا ۔ اس نے مذہبی علوم کے مطالعے کے ساتھ ' فلسفے ' جیومیٹری اور حساب کی بھی تعلیم حاصل کی ۔ ہر چند کہ وہ عبداللہ ناتلی کا شاگرد تھا ' لیکن وہ اپنی ذہانت و فطانت کی بنا پر فکر و فن میں ان سے بہت آگے تھا ' اس کا اعتراف خود اس کے اساتذہ کو بھی تھا ۔

ابن سینا کی ابتدائی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے ' وہ اس کا ذوق مطالعہ ہے ۔ اس نے کبھی درسیات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ افلاطون ' ارسطو اور اقلیدس کی تصانیف کا مطالعہ اپنے طور پر بھی کرتا رہا ۔ اس کے بعد اس نے طب کی طرف توجہ کی ' تو اس موضوع پر تمام دستیاب کتابیں پڑھ ڈالیں ' اور علم طب کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا ۔ فقہ کا مطالعہ بھی اس نے ساتھ ہی ساتھ جاری رکھا ۔ فلسفے اور ریاضی میں اسے مہارت حاصل ہو ہی چکی تھی ' اب وہ مابعد الطبیعی علوم کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا ۔ ان تمام مراحل کی تکمیل اس نے ۱۶ سال کی عمر میں کر لی تھی ۔ اس نے خود بیان کیا ہے کہ فلسفۂ الٰہیات کے موضوع پر اس نے ارسطو کی کتاب کا متعدد بار مطالعہ کیا ۔ مگر اس کے نکات سمجھنے سے قاصر رہا ۔ اتفاقاً اسے اسی موضوع پر فارابی کی ایک کتاب ہاتھ آگئی ' جس کے مطالعے سے ارسطو کی تصنیف پر اسے عبور حاصل ہوگیا ۔

ابن سینا نے طب کو صرف علمی مطالعے تک محدود نہیں رکھا ' بلکہ تجربات اور مشاہدات سے معارف و معلومات میں اضافے کی مسلسل کوششوں میں بھی مصروف رہا ' اور اس نے ایک دیدہ ور معالج اور ماہر طبیب کی حیثیت سے ہمہ گیر شہرت حاصل کر لی ۔

بخارا کا سلطان ابن منصور جب بیمار ہو کر جاں بہ لب ہوا تو علاج کے لیے نگاہ انتخاب ابن سینا ہی پر پڑی ۔ اس کے علاج سے سلطان جب تندرست ہوگیا تو اس نے بہ طور انعام ابن سینا کو شاہی کتب خانے سے استفادے کی اجازت دے دی ۔ ابن سینا نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھایا ' اور بیشتر کتابیں پڑھ ڈالیں ۔ اب اس کا

ذہنی افق بہت وسیع ہو چکا تھا ' اب وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ اپنے وسیع مطالعے کے علمی نتائج تخلیق و تصنیف کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے ۔ اس نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا ' حالانکہ اس کی عمر اس وقت اکیس سال تھی ۔

القفطی نے ابن سینا سے اکیس ضخیم کتابیں اور چوبیس چھوٹی کتابیں منسوب کی ہیں جو فلسفہ ' طب ' علم الادویہ ' جراحت ' جیومیٹری ' فلکیات ' دینیات اور علم کلام پر مشتمل ہیں ۔

ابن سینا کی زندگی مسلسل مصروفیت اور علمی انہماک میں گزری ' مطالعے کے اس شوق نے لازماً معمولات حیات میں بے قاعدگی پیدا کی اور اس کے نتیجے میں صحت متاثر ہوئی ۔ درد قولنج کی شکایت اسے بہت پہلے سے تھی ' یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا اور ۵۸ سال کی عمر میں ہمدان پہنچ کر اس عبقری نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی ۔ علم و حکمت کا یہ آفتاب ۱۰۳۶ء میں غروب ہو گیا ۔

ابن سینا کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے جو بات مجموعی طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے عہد و عصر سے زیادہ درحقیقت مستقبل کا طبیب و سائنس داں تھا ۔ آج کے طبی و سائنسی اکتشافات میں اس کی شخصیت کا پرتو اتنا نمایاں ہے کہ اسے بجا طور پر ابن سینا کا عہد کہا جا سکتا ہے ۔ طب و سائنس کی جن راہوں پر چل کر زمانہ آج جس منزل تک پہنچا ہے ہزار سال پہلے ابن سینا نے اس کی نشان دہی کہیں وضاحت کے ساتھ اور کہیں اشارات میں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب الشفا" اور "القانون فی الطب" میں کر دی تھی ۔

"القانون" تو ابن سینا کی وہ تصنیف ہے ' جس کو ولیم اوسلر نے طبی انجیل کہا ہے ۔ کریمونا کے جرارڈ نے ۱۲ویں صدی میں اسے لاطینی زبان کا جامہ پہنایا ' لیکن اس کتاب کا اصل نام "قانون" محفوظ رہا ۔ صدیوں مغرب کی طبی درس گاہوں کے نصاب کی مرکزی کتاب ہونے کا شرف القانون ہی کو حاصل رہا ۔ اس کا حسن ترتیب اور محققانہ انداز بیان بہت مقبول ہوا ۔ اس کے نکات عصر جدید کے طبی اکتشافات کی بنیاد بنے ' اس میں تعدیے کا نظریہ پیش کیا گیا ہے ' اور تپ دق کو متعدی مرض بتایا

گیا ہے ۔ خردبینی آلات کے بغیر ابن سینا کی یہ طبی تحقیق دنیائے طب میں انقلاب انگیز ثابت ہوئی ۔ ابن سینا نے یہ لکھ کر کہ بیماریاں پانی اور بعض مخصوص حالات میں مٹی کے ذریعہ سے پھیلتی ہیں ' علاج و مرض کے تصور کو صدیوں آگے بڑھا دیا ۔ آنتوں میں پیدا ہو جانے والے کیڑوں اور ان کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے عوارض کا ذکر کر کے مہلک 'پراسرار اور ناقابل فہم بیماریوں کو قابل علاج بنا دیا اور دنیائے علاج میں دریافت مرض کے نئے دروازے کھول دیے ۔

اس نے اپنی مخزن الادویہ میں آٹھ سو جڑی بوٹیوں کے خواص پر روشنی ڈال کر نباتی علوم کو اس قدر آگے بڑھا دیا کہ انسانی صحت کے تحفظ کے قابل اعتماد ذرائع میسر آگئے اور امراض کی ہلاکت خیزیوں کے خطرات پر قابو پانے کی سائنسی راہیں معلوم ہو گئیں ۔

طبیعیات میں حرکت ' قوت ' خلا ' روشنی اور حرارت جیسے موضوعات پر اس نے مقالے لکھے ۔ اپنی "کتاب الشفا" میں طبیعیات ' کیمیا ' ریاضی ' موسیقی اور حیاتیات پر بھی اس نے فکر انگیز مضامین لکھے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ زمین سے لے کر خلا تک آج جو انسانی ترقی کے مظاہر اور مرض و علاج کی دنیا میں تحقیق و ایجاد کے جو کرشمے نظر آتے ہیں ' ان میں ابن سینا کا فکری پرتو نہیں ہے ۔ وہ صحراؤں اور وادیوں کی خاک چھانتا رہا ۔ وہ ایوان وزارت میں بھی رہا ' حصار زنداں میں بھی رہا ' لیکن اس کا قلم کبھی خاموش اور اس کی فکر کبھی جمود آشنا نہیں ہوئی ۔ اس کا کارنامہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس نے بہت سے مسائل کا حل تلاش کیا ' بلکہ اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ذہن انسانی کے سامنے بہت سے مسائل رکھ کر نئے فکری عہد کی تخلیق کی ۔ اس کا لقب "شیخ الرئیس" اس کے شایان شان ہے ۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سارے عالم اسلام میں فکر و نظر کی تربیت اور علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے نشو و نما کا ایسا سامان کیا جائے جس کی بدولت ہم میں ابن سینا جیسی مثالیں پھر سے پیدا ہونے لگیں اور اس طرح میدان علم و حکمت میں ہمیں پھر سے منصب امامت حاصل ہو جائے ۔

میرے بعد جناب محترم پروفیسر بوریس پیٹروفسکی صاحب نے عالمانہ تقریر کی اور خوب باتیں کیں۔

آخر میں پروفیسر رشیدالدین صاحب نے بھی اردو میں خاتمہ تقریب کیا اور میرے اندازِ فکر — احترامِ انسان — کو نکتہ حکمت قرار دیتے ہوئے انھوں نے اقبال اور جگر کے اشعار سے نوازا۔ محترمہ ڈاکٹر لڈمیلا نے روسی زبان میں ترجمہ کیا۔ تقریب بہ حیثیت مجموعی شاندار رہی اور پروقار رہی۔

اختتام پر موسکو ٹیلے وژن نے پروفیسر رشیدالدین ' پروفیسر پیٹروفسکی صاحب اور مجھے ایک جگہ کرکے ایک مختصر انٹرویو لیا۔ ایسا ہی ایک انٹرویو ریڈیو موسکو نے میرا بھی لیا اور چند کلمات بھی کہے۔ یہ انٹرویو پاکستان کے لیے ہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں پروفیسر پیٹروفسکی صاحب کو دورۂ پاکستان کی دعوت کا اعادہ کیا اور بتایا کہ میں روس آنے سے قبل سفیر کبیر روس متعینہ پاکستان کو باضابطہ دعوت پیش کرچکا ہوں۔ پروفیسر پیٹروفسکی صاحب نے یہ دعوت قبول کرلی ہے۔ یہ بات بھی چائے پر واضح کردی گئی کہ موسکو ـ کراچی ـ موسکو ٹکٹ روس میں خریدا جائے گا۔ پاکستان میں ہمدرد فاؤنڈیشن ان کے تمام اخراجات برداشت کرے گا۔

اس دعوت کا نہایت اچھا اثر ہوا ہے۔

دو انعامات

تقریب کے بعد چائے پر دو انعامات اور پیش ہوئے۔

الف) ابن سینا ایوارڈ کے ساتھ پندرہ روزہ دورۂ روس بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ (حکیم محمد سعید) اور آپ کی بیٹی کو یہ دعوت ہم دے رہے ہیں۔

ب) ایک ہزار روبل نقد پیش خدمت ہیں!

میں نے اپنی سہولت کے مطابق دورۂ روس کی دعوت قبول کرلی ہے۔ اور میں نے ایک ہزار روبل نقد قبول کرکے واپس کردیے ہیں اور ایک تحریر لکھ دی ہے کہ یہ روبل حسب ذیل اداروں کو دیدیں :

الف) البیرونی انسٹی ٹیوٹ اوف اورنٹیل اسٹڈیز پانچ سو روبل۔

ب) لینن گراد چلڈرنز فنڈ پانچ سو روبل

میرے اس رویے کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ مجھے ایسا کرکے خود بھی حد درجہ اطمینان حاصل ہوا ہے۔ اس طرح میں نے ہمدرد کا اور پاکستان کا وقار بلند کیا ہے۔

الحمدللہ علی ذالک

اب میرا کام کا موڈ ختم ہوگیا ہے۔ مجھے موسکو یونیورسٹی کے چانسلر سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ میں نے ڈاکٹر گنادی صاحب اور ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا سے کہہ دیا ہے کہ میرے سہ پہر کے پروگرام منسوخ کردیں۔ میرے لیے موسکو یونیورسٹی جانے کی اہمیت تھی اور میں میڈیکل سنٹر جانا چاہتا تھا۔ یہ دونوں پروگرام نہیں بن سکے اس لیے اب میرا کام کا موڈ ختم ہوگیا۔ شام کا پروگرام نیوکلیئر سنٹر کے بارے میں تھا۔ غالباً وہ مجھ سے یہ کہتے کہ پاکستان کو نیوکلیئر بم نہیں بنانا چاہیے — یہ میرا میدان نہیں ہے' اس لیے میں نے یہاں جانے سے معذرت کرلی۔

تاثرات

روس میں دو ہفتے قیام رہا ہے۔ یہاں مجھے جہاں بہترین احترامات ملے ہیں وہاں مجھے مطالعے کے مواقع پوری آزادی کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ مجھ پر یہ ہر سطح پر واضح کردیا گیا تھا کہ میں روس میں خود کو آزاد محسوس کروں اور اپنے پروگرام میں جو دل چاہے شریک کرلوں۔ میں نے دوران دورۂ روس پر جو تاثرات قائم کیے ان کو اپنی اس ڈائری میں آزادی کے ساتھ درج کردیا ہے۔ میری یہ کتاب درون روس ایک آزاد اور ذاتی مطالعہ روس ہے۔ اس میں تنقید بھی ہے اور اس میں اعتراف حقائق بھی ہے۔ میں اس مطالعے کو مکمل کرنے کے لیے مختلف عنوانات سے اپنے مزید تاثرات اور معلومات کا اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان ہی پر یہ کتاب ختم ہوجائے گی۔

روس میں آزادی تنقید

جناب گورباچوف کے زمانے میں آزادی رائے اور آزادی اختلاف کی اجازت ملی تو روس میں تند و تلخ تنقید ہونے لگی اور چھپنے بھی لگی جس کا صحیح اندازہ مجھے لینن گراد میں ہوا جس کا گواہ خود پارٹی اخبار پراودا ہے۔ اس سے پہلے ہم نے جناب آندرے سخاروف اور سول زینتسین کے نام سنے تھے۔ اب پریس میں جناب یوری این۔ آفان آس یف کی آتش بیانی شائع ہوئی ہے۔ جناب آفان آس یف روس میں تاریخ فرانس کے پروفیسر، ڈین اور قانون ساز اسمبلی کے منتخب رکن ہیں۔ انھیں کمیونسٹ پارٹی کا کارڈ ملا ہوا ہے۔ انھوں نے نہ کبھی بھوک ہڑتال کی ہے نہ کبھی جیل گئے ہیں۔ انھوں نے گورباچوف کی اصلاحات پر تنقید کرتے ہوئے کہا ” مارکسی لینن نمونے کی سوشلزم کو اس طرح صاف کردینا چاہیے جیسے نیوٹن کی طبیعیات کو آئن اسٹائن نے صاف کردیا۔“ وہ نجی ملکیت کے حق کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ

روس کی سلطنت رضاکارانہ طور پر شامل ہونے والی ریپبلکوں (صوبوں) پر مشتمل ہونی چاہیے اور کمیونسٹ پارٹی کی چودھراہٹ کو ختم کرنا چاہیے۔ ایک میٹنگ میں انھوں نے کہا ” جناب گورباچوف نے اساسی اصلاحات شروع کی ہیں۔ اس بات کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں، مگر ان کی پیش کردہ پیرسترائیکا میں اب کوئی سکت باقی نہیں۔ وہ پرانی باتوں کو مستقبل کی طرف گھسیٹ کر لے جارہے ہیں۔ مثلاً سوویت یونین کی سلطنت اور مارکس اور لینن کی سوشلزم، اب ان باتوں کا کوئی مستقبل نہیں رہا۔“

جناب آفان آس یف جناب گورباچوف کے حامیوں میں تھے، مگر اب سیاست میں غیر متوقع تیز رفتار تبدیلیاں آگئی ہیں اور جناب گورباچوف حیرانی سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ ادیب، مورخ اور ماہرین اقتصادیات چیلنج کر رہے ہیں اور گورباچوف پر زور دے رہے ہیں کہ ملک میں پرانی نظریاتی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کی رفتار تیز کریں۔

جناب آفان آس یف صرف اپنے انتہا پسندانہ خیالات کی وجہ ہی سے منحرف نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کے خیالات نے خاصے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کی تقاریر کی خلش جناب گورباچوف نے محسوس کی ہے۔ جناب گورباچوف میں ایک تضاد واضح ہے۔ ایک طرف تو وہ گلاس نوسٹ کے خالق ہیں اور پولٹ بیورو کی انتہا پسند شخصیت ہیں دوسری طرف وہ کمیونسٹ پارٹی کی مشینری کی پیداوار ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنی ایک راہ متعین کر رکھی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان پر دباؤ ڈالا جائے۔ اگر دباؤ ڈالا جائے تو ردعمل کرنے سے نہیں چوکتے۔

سنٹرل کمیٹی کے شعبہ نظریات کے ایک بند سیشن میں جناب گورباچوف نے جناب آفان آس یف کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ ایسا بے وفا شخص پارٹی میں کیسے گھسا۔ اس کے بعد سرکاری پریس جناب آفان آس یف کی خبر لینے لگا، اور اس کی دیانت اور حب الوطنی کو چیلنج کرنے لگا۔ کمیونسٹ پارٹی اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے جناب آفان آس یف کے انسٹی ٹیوٹ کی تفتیش بھی کی گئی۔ لیکن انھوں نے کہا، ” مجھے کوئی خطرہ نہیں، لیکن عجیب بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے غیر سوشلسٹ خیالات والا

کہہ رہے ہیں حالانکہ میں ایک حقیقی ' قابل عمل اور شائستہ سوشلزم کی تلاش میں مصروف ہوں ۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں جی رہے ہیں جہاں صرف ایک شخص یعنی کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری معاشرے کے اہم عناصر پر سوال کرنے کا مجاز ہے ۔ اب بھی امتیاز کی ایک لکیر موجود ہے ۔ "

۱۹۵۲ء میں جب وہ ماسکو یونی ورسٹی میں تعلیم کے لیے آئے تھے تو مارکس ازم ' لینن ازم کے کٹر معتقد تھے ۔ اسٹالن کی موت پر وہ بھی اس کے جنازے کے زائرین میں شامل تھے ۔ ۱۹۵۶ء میں خروچیف نے اپنی خفیہ تقریر میں اسٹالن کے جرموں کی مذمت کی ۔ یہ ایک نازک دور تھا جب آفان آس یف کی نسل کو اس وقت ۲۰ ویں پارٹی کنگرس کے بچے کہا جاتا تھا ۔ جناب آفان آس یف اپنے کام میں لگے رہے ۔ اس دور میں رائے اے ۔ مدودیف یا انتون انتونوف اوسی ینکو جیسے مورخوں نے خطرہ مول لے کر اسٹالن پر تحریریں لکھیں ' مگر آفان آس یف نے اس دور میں کوئی خطرہ مول نہ لیا ۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں وہ لینن ازم کے مقلد تھے اور ان کا شمار ان دانش وروں میں ہوتا تھا جو یہ سوچ رہے تھے کہ گورباچوف جیسے لیڈر کی قیادت میں کیا کچھ حاصل ہوسکتا ہے ۔ اس وقت کے بارے میں انھوں نے کہا ' "میں یہ سوچتا تھا کہ تاریخ کس ادنا سطح پر اتر آئی ہے ۔ " عشرۂ ۱۹۸۰ء میں وہ رسالہ کمیونسٹ اور دیگر مطبوعات کے لیے مضامین لکھتے رہے ۔ جب گورباچوف اقتدار میں آئے تو جناب آفان آس یف روسی لیڈروں کو اس موضوع کے خط لکھتے رہے کہ کمیونسٹ پارٹی اور کے جی بی کی دستاویزات کا مطالعہ کرنے اور ان پر آزادانہ تحقیق کرنے کی اجازت ملنی چاہیے ۔

درحقیقت دو سال قبل جناب گورباچوف نے خروچیف کی خفیہ تقریر کے موضوع کو کچھ آگے بڑھایا تھا ۔ اس وقت انھوں نے صرف ہزاروں آدمیوں کے مارے جانے کی بات کی ' مگر سرکاری طور پر یہ اشارہ کردیا کہ مظالم کے ان واقعات کو اب جبراً بھلایا نہیں جاسکتا ۔

شروع میں جناب آفان آس یف ممنون تھے کہ ایسی اجازت ملی ہے مگر اب وہ یہ

سمجھتے ہیں کہ یہ خلط ملط بات ہے ۔ اس میں اب بھی پرانی باتیں شامل ہیں ۔ تاریخ یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں وجود میں آنی چاہیے نہ کہ کمیونسٹ پارٹی کی کمیٹیوں میں ۔

جناب آفان آس یف کے مطابق روسی قیادت وہی پرانی غلطی دہرا رہی ہے یعنی وہ ایک آئیڈیل سوسائٹی کا ماڈل بنا کر اسے لوگوں پر ٹھونسنا چاہتی ہے ۔ "اساتذہ اور خیالی جنت کے خواب دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ عالمگیر انصاف اور خوشحالی پر مبنی ایک معاشرہ صرف سوچ کی بنیاد پر تعمیر کیا جاسکتا ہے ۔ مگر سوچ پر مبنی خیالی معاشروں کی تعمیر کا عہد ایک زمانہ ہوا کہ مغربی یورپ میں ختم ہوچکا ۔ انقلاب فرانس میں بھی ایک خیالی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش ہوئی تھی جو بری طرح ناکام ہوئی اور پھر وہ لوگ معمول کے مطابق ترقی کے طریقے کی طرف مڑے ۔ اور ہم ہیں کہ ستر برس سے جان بوجھ کر ایک خیالی معاشرے کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں ۔ اب اسے ختم کرنا چاہیے ۔ "

جناب آفان آس یف کا خیال ہے کہ "گورباچوف ایک بہتر نمونے اور بہتر سلطنت کی تلاش میں ہیں ۔ " وہ کہتے ہیں کہ گورباچوف سوشلزم کی ماہیت پر یا پیرسترائیکا کے لیے یا مستقبل کے لیے مارکس ازم اور لینن ازم کی ضرورت ہے بھی یا نہیں ' جیسے موضوعات پر کسی سنجیدہ بحث کی اجازت ہی نہیں دیتے ۔
"ہم مارکس اور لینن کو اپنا ہم عصر سمجھ سکتے ہیں اس معنی میں جس میں ارسطو ہمارا ہم عصر ہے ۔ ہم ان کے خیالات پر اپنے دل میں غور و خوض کرسکتے ہیں ۔ لیکن مارکس اور لینن کا کلچر غائب ہو رہا ہے ۔ ان کا عہد غائب ہو رہا ہے ' مگر اس کا اظہار اب بھی ممنوع ہے ۔ "

جناب گورباچوف کو اقتدار میں آئے ساڑھے چار برس ہوئے ہیں اور اس دور میں گلاس نوسٹ (کشادگی) ان کی زبردست کامیابی ہے ۔ اس سے عام زندگی میں بے شمار تحریکوں نے جنم لیا ہے ۔ ڈیمو کریٹک سوشلسٹ ' سوشل ڈیموکریٹس ' نیشنلسٹ ' گرین ' نیو اسٹالنسٹ ' روسو فائل ' روسو فوب ' مونارکسٹ ' نیو فاسسٹ ... اب

اختلاف کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے۔

جناب آفان آس یف کا اختلاف اس لیے منفرد ہے کہ اس میں بڑی وسعت ہے۔ گورباچوف پر تنقید میں انھوں نے کہا ہے کہ بالٹک کی ریپبلکوں کو آزادی دینی چاہیے اور کوریل جزیرے جاپان کو واپس کردینے چاہییں۔ ان کی تنقید میں تندی اور تیزی ہے۔ ان میں تھیٹر کی سی ایکٹنگ نہیں، مگر صاف اور زور دار زبان ان کی ایک خاص خوبی ہے۔

گزشتہ موسم بہار میں پیپلز ڈپٹیز کانگرس کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر جناب آفان آس یف اسٹیج پر آئے اور انھوں نے گورباچوف پر الزام لگایا کہ وہ ٹیلے وژن کو بطور آلہ کار استعمال کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کانگرس نے ایک اسٹالینی بریژنیفی قسم کی سپریم سوویت منتخب کی ہے۔

اگرچہ روس میں بالعموم دانش وروں کی پیش گوئیاں قنوطی قسم کی ہوتی ہیں، لیکن جناب آفان آس یف مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

"جن حالات میں ہم ہیں دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی، اس لیے اس کی پیش گوئیاں کرنا ناممکن ہے۔ ہم نے ایک مصنوعی معاشرے کو بنتے دیکھا ایسے جیسے ۲۸ کروڑ انسانوں پر مشتمل ایک بڑی مشین جس میں مختلف ثقافتوں، تہذیبوں، جغرافیوں کو زبردستی سے ایک ڈھیر میں ٹھونس دیا گیا ہو۔ اس عظیم انسانی مشین کی بنیاد ظلم پر تھی اور اس کا کنٹرول اور اس کی منصوبہ بندی ایک مرکز کے ہاتھ میں تھی۔

ظاہر ہے یہ عظیم عمارت کچی مٹی کے ستونوں پر قائم تھی۔ اسے تباہ ہونا ہی تھا، اب اس کے گرنے کا فطری عمل جاری ہے۔"

اس انداز فکر کی روشنی میں دیکھنا ضروری ہے کہ خود جناب گورباچوف کس رخ سے سوچتے ہیں اور کس انداز سے گفت گو کرتے ہیں۔ میں چاہتاہوں کہ ان کی اس تقریر کا مطالعہ کیا جائے کہ جو انھوں نے روسی پارلیمان میں کی ہے۔ اس تقریر کے درج ذیل نکات عالمی خبر رساں ایجنسی رائٹر نے رکارڈ کیے ہیں :

خطاب

روسی رہنما گورباچوف نے روس سے علاحدگی کے خواہش مند قوم پرستوں کو سختی سے متنبہ کیا ہے کہ وہ جس طرح کی کارروائی کر رہے ہیں اس سے ملک کے حصے بخرے ہو جائیں گے اور زبردست خوں ریزی اور ہلاکتیں ہوں گی۔ انھوں نے روسی عوام کے بین الاقوامی کردار کا دفاع کرتے ہوئے اس کی سختی سے تردید کی کہ ان کی اصلاحات کا مقصد ملک میں کیمونسٹ پارٹی کو کم زور کرنا ہے۔ علاحدگی کے ذریعہ سے خود مختاری کی کوشش یونین کو تباہ کرنا۔ عوام کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کرنا اور رشوت، خوں ریزی و ہلاکت کا بیج بونا ہے۔ حکومت روس نے معاہدہ وارسا کے ملکوں سے یہ اپیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ رومانیہ کے عوام کی حمایت اور مدد کے لیے مربوط کوششیں کی جائیں، معاہدہ وارسا کے اتحادیوں کے ساتھ متعدد دوسری تدابیر اور اقدامات پر بھی کام کیا جا رہا ہے۔ ایک خصوصی ورکنگ گروپ رومانیہ کے واقعات اور حالات کی خبریں سن کر باخبر رہتا ہے۔ روس امداد فراہم کرنے کی تیاری کر رہا ہے انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس میں فوجی امداد بھی شامل ہے یا نہیں۔

اجلاس

کانگرس کے اجلاس میں علاحدگی پسندانہ رجحانات کے خلاف گورباچوف نے انتہائی سخت بیان دیا ہے۔ ان کے خطاب کے بعد پارلیمنٹ میں کریملن اور سوویت جمہوریتوں کے باہمی تعلق پر دو دن تک بحث جاری رہی۔ تمام روسی جمہوریتوں میں علاحدگی پسند سرگرم عمل ہیں۔ پارلیمنٹ میں آئین پر عمل در آمد کی نگرانی کے لیے ایک نئی کمیٹی کی تشکیل پر جب بحث ہو رہی تھی تو لتھوانیا، لٹویا اور اسٹونیا کے نمائندوں نے ۱۹۴۰ء میں ان جمہوریتوں کو روس میں شامل کرنے کی سخت مذمت کی اور اس کارروائی کو غیر قانونی قرار دیا۔

روسی حکام نے گزشتہ روز معاہدہ وارسا کے اتحادیوں سے رومانیہ کی شورش پر صلاح و مشورہ کیا اور طبی امداد کی پیشکش کی۔ روسی حکام نے کسی فوجی مداخلت کے

امکان کو مسترد کر دیا ہے ۔ صدر گوربا چوف نے کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا اجلاس آئندہ چند دنوں میں طلب کیا ہے ۔ اجلاس میں لتھوانیا کی کارروائی کی مذمت کرنے کے ساتھ اس پر غور کیا جائے گا ۔ کریملن کا کہنا ہے کہ لتھوانیا میں کارروائی علاحدگی پسندوں کی شہ پر کی جا رہی ہے ۔

رومانیہ کے ٹیلی وژن نے جو باغیوں کے قبضے میں ہے خبر دی ہے کہ روسی سفارت خانے نے بغاوت اور شورش کی مدد کے لیے افراد کار اور آلات بھیجنے کا وعدہ کیا ہے ۔بدھ کے دن سب سے زیادہ شورش زدہ جمہوریت لتھوانیا میں کمیونسٹ پارٹی نے گوربا چوف کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے خود کو موسکو سے آزاد اور ایک نئی پارٹی قرار دیا ہے ۔ (رائٹر، ۲۴ دسمبر ۱۹۸۹ء)

روس میں آزادی فکر و اظہار کے دور میں کنگرس میں یہ انداز تخاطب فکر و نظر کے لیے کئی راہیں کھولتا ہے ۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جناب گوربا چوف کو اتحاد روس کی طرف سے بے اطمینانی ہے ۔ اس لیے لازماً دل میں یہ خیال آتا ہے کہ:

کیا روس کا شیرازہ بکھر جائے گا؟

میرے دورۂ روس کے فوراً ہی بعد حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ذرائع ابلاغ یہ ظاہر کرنے لگے ہیں کہ روس کا شیرازہ بکھر رہا ہے، جناب گوربا چوف اس طوفان کی مزاحمت نہیں کر سکیں گے ؟

مثلاً لتھوانیا نے آزادی کا اعلان کر دیا ہے ۔ استونیا اور لیٹ ویا ایسا ہی اقدام کرنے والے ہیں ۔ آذر بائیجان کے شہر باکو میں ایک لاکھ مظاہرین نے آزادی کا مطالبہ کیا ہے اور اخبار ازوستیا اور پراودا کی کاپیاں نذر آتش کر دی ہیں ۔ جس طرح برلن کی دیوار ٹوٹ گئی ہے ایسے ہی یہ لوگ سرحدیں عبور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ آرمینیا سوویت روس کا ایک صوبہ ہے ۔ اس کے ایک مخصوص علاقے نغی چیون میں آذری ترک آباد کیے گئے ہیں ۔ موجودہ واقعات سے پہلے ہی وہ لوگ اپنی ناخوشی کا اظہار کرتے رہے ہیں ۔ اس کا سلسلہ بھی ان واقعات سے جوڑ دیا گیا ہے ۔ اسی طرح آذر بائیجان کے صوبے کے اندر کاراباخ کے مخصوص علاقے میں آرمنی آباد

ہیں وہ بھی پہلے سے مطالبات کرتے آ رہے ہیں ۔ اس کا سلسلہ بھی موجودہ حالات سے جوڑ دیا گیا ہے ۔

اخبارات کا ایک خاص میدان پیش گوئی ہے ۔ چناں چہ اس میدان میں اس نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ بالٹک پر واقع روس کی تین ری پبلکوں کے بعد یوکرین بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دے گا اور اس طرح روس غلہ اور اناج پیدا کرنے والے علاقے سے محروم ہو جائے گا ۔

ایک پیش گوئی یہ ہے کہ ایک طرف پولینڈ، ہنگری، چیکوسلوویکیہ اور رومانیہ سرمایہ دارانہ نظام اور کھلی منڈی کی معیشت اپنانے والے ہیں، دوسری طرف مشرقی اور مغربی جرمنی کا اتحاد ہونے والا ہے ۔ مغربی جرمنی کی معاشی پوزیشن اتنی مضبوط ہے کہ اس کے سامنے موسکو کی چمک دمک ماند پڑ جائے گی ۔

وسط ایشیا میں روس کے پانچوں ری پبلکوں کی اصل آبادی مسلمان ترکوں پر مشتمل ہے ۔ وہ لوگ اپنی تہذیب و ثقافت کی مکمل آزادی کی آواز بلند کر رہے ہیں ۔

معاشی میدان میں یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ روس کے باہر روبل کی دس امریکی سینٹ کے برابر قیمت رہ گئی ہے ۔ نیز اسے بین الاقوامی منڈی میں ساکھ اور استحکام حاصل نہیں رہا ہے ۔ روس جلد ہی نجی املاک کو رائج کرے گا اور اشیا کی نئی قیمتیں مقرر کرے گا ملک میں زبردست مہنگائی ہوگی اور اس طرح ہنگامے جنم لیں گے جس سے روسی حکومت متزلزل ہو جائے گی ۔

میں نے عالمی اخبارات میں شائع ہونے والے تجزیوں اور پیش گوئیوں کا نہایت مختصر الفاظ میں لب لباب پیش کیا ہے ۔ جتنے خدشات ظاہر کیے گئے ہیں وہ کسی اور رنگ میں اور بہت نیچی سطح پر پہلے ہی سے موجود ہیں، لیکن یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جناب گوربا چوف تمام پچھلے روسی لیڈروں سے بالکل مختلف ہیں ۔ انھیں روسی کمیونسٹ پارٹی اور روس کے پرانے منحرف لوگوں کی زبردست حمایت حاصل ہے ۔ جناب گوربا چوف میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایک ہی لگے بندھے نظریے کے دست بستہ غلام بن کر نہیں رہتے، بلکہ غیر متوقع لچک اور روشن خیالی کا مظاہر کرتے ہیں ۔

انھوں نے ریگن انتظامیہ سے تخفیف اسلحہ پر کامیاب بات کی جس کے نتیجے میں عالمی برادری میں روس کی پوزیشن خاصی بہتر ہوئی۔ انھوں نے ایک طرف صدر امریکا جناب بش سے اپنے پروگرام پیرسترائیکا کی حمایت کے وعدہ لیا اور دوسری طرف کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پوپ کو بھی حمایت پر آمادہ کرلیا۔ ان سب باتوں میں روسی کیمونسٹ پارٹی ان کی حمایت کرتی رہی ہے۔ ایک اور حقیقت یہ ہے کہ روسی لیڈروں میں سے کبھی کوئی شخصیت گوربا چوف سے بڑھ کر بین الاقوامی برادری میں مقبول نہیں رہی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ مسائل بہت بھی ہیں اور گھمبیر بھی ہیں، لیکن روسی قیادت ان کا حل نکال لے گی۔ روس نے جمہوریت کی سرحد عبور کرلی ہے اب وہ پھر پیچھے نہیں آئے گا۔ جب سے کنگرس اوف پیپلز ڈپٹیز کے انتخاب ہوئے ہیں اور نئی سپریم سوویت بنی ہے، تب سے مسائل کے حل کے لیے عوامی نمائندوں کی کمیٹیاں مستقل کام کر رہی ہیں۔ اس لیے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اب من مانے فیصلے کرکے بزور شمشیر انھیں منوایا جائے گا۔

گوربا چوف ۔ بش مذاکرات اور مسائل

باکو میں جب میں نے اپنے دوست اور صدر آذر بائیجان جناب وزیروف صاحب سے یہ مشورہ کیا کہ کیا مجھے موسکو جاکر جناب گوربا چوف سے ملاقات کی کوشش کرنی چاہیے تو ان کا مشورہ تھا کہ اس وقت جناب گوربا چوف صدر بش سے ملاقات کے لیے تیاریوں میں ہیں اور مناسب ہے کہ ان کی توجہات کو غیر مرکوز نہ کیا جائے۔ میں نے ان کا مشورہ مان لیا۔ مجھے اس حقیقت کا بہ خوبی ادراک ہے کہ گوربا چوف صاحب کے لیے حالات کی شدت پوری سنگینیوں کے ساتھ ایک چیلنج ہے۔ ان کو جو فیصلے کرنے ہیں ان کے نتائج دور رس ہوں گے اور ساری دنیا ان سے متاثر ہو کر رہے گی۔ امریکی صدر اور روسی صدر کی ملاقات، ان میں باہم تبادل خیال اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فیصلے عالمی سطح پر اثر انداز ہوں گے۔

موجودہ حالات و واقعات میں میخائل گوربا چوف بڑی احتیاط سے کام لے رہے ہیں جیسے وہ اب اس معاملے میں ناگزیر ہوں۔ ان پر ایک غیر معمولی تاریخی ذمہ داری آن پڑی ہے اور وہ اس وقت دو ادوار کے درمیان پل کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور کروڑوں افراد کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ جناب گوربا چوف عظیم واقعات سے کس طرح نمٹتے ہیں۔ ان کے اقدامات اور اثرات کے نتیجے میں مشرقی یورپ کا ایک بڑا حصہ جوش و جذبہ اور ہیجان کی گرفت میں ہے۔ وہاں کے عوام کے لیے یہ ایک نیا تجربہ ہے۔

گوربا چوف بش ملاقات کی تیاری چار ماہ سے ہو رہی ہے، مگر یورپ کے واقعات نے اس کے فوری اہمیت بڑھا دی ہے۔ سیاسی رہنما کیمونسٹوں کی بالا دستی کے اس اچانک خاتمے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ ہر شخص غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہے۔ دونوں رہنما مذاکرات کی میز پر آنے سے قبل چاہتے ہیں کہ وہ صورت حال سے پوری طرح باخبر رہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ضروری یقین دہانیاں حاصل کرلیں۔ تاریخی تبدیلیوں کے بارے میں فیصلے کرنے سے قبل ایسا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ یہ بحرانوں کو جنم دے سکتی ہیں۔

اصل مسئلہ استحکام کا ہے۔ مغرب اور موسکو دونوں کو مشرقی یورپ کے استحکام سے دل چسپی ہے۔ فریقین کو اندیشہ ہے کہ موجودہ واقعات اور انتشار امن و امان کی تباہی کا بھی سبب بن سکتے ہیں۔ تحفظ، دفاع، راکٹ، ٹینک اور افواج کے مسائل تو ایجنڈے پر اپنی جگہ ہوں گے ہی، لیکن سربراہوں کے درمیان اصل مسئلہ ہتھیاروں پر کنٹرول ہوگا۔ سپر طاقتوں کے شبہات ختم اور خیالات بدل چکے ہیں۔ دونوں سرد جنگ کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ صدر بش کہہ چکے ہیں کہ عوام کو بہت زیادہ توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ صدر بش روسی بلاک کی تبدیلیوں کے بارے میں خود گوربا چوف کے خیالات سننا چاہتے ہیں۔ وہ معاہدہ وارسا کے اتحادیوں کے بارے میں اصل روسی پالیسی بھی جاننا چاہیں گے۔ گوربا چوف جانتے ہیں کہ سربراہ کانفرنس کی کامیابی سے روس میں ان کا وقار بلند ہوگا۔ وہ اس یقین دہانی کے خواہش مند ہیں کہ مغرب

موجودہ حالات میں فوجی و جنگی نوعیت کا کوئی فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ وہ صدر بش سے براہ راست یہ بات سننا چاہتے ہیں کہ امریکا حریف نہیں مدد دینے والے ملک کی حیثیت سے اصلاحات کا خیر مقدم کرتا ہے۔ انھیں یقین دلایا گیا تو ان کا اعتماد بڑھے گا۔ فی الحال انھیں اپنے ملک میں تنہا اور بے یار و مددگار رہ جانے کا خطرہ لاحق ہے۔

گوربا چوف نے برژنیف کے نظریہ مداخلت کو رد کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا تھا کہ روس کو ہمسایوں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں۔ اب انھیں صدر بش کو یقین دلانا ہے کہ آزادی انتخاب کے اصول پر وہ فی الحقیقت ایک استثنا ہو سکتے ہیں۔ ادھر روسی وزیر خارجہ شیورڈ ناڈزے نے اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں اپنی نئی پالیسیوں پر عمل درآمد میں کریملن کو خاصی پریشانی ہے۔ انھوں نے تبدیلیوں کے اس دور کے بارے میں حال ہی میں پارلیمنٹ کے سامنے تفصیلات بیان کی ہیں۔ معاہدہ وارسا کے ممالک کے اجلاس سے واپسی پر انھوں نے بتایا کہ جو لوگ کل تک کامریڈ کہے جاتے تھے اب ہم انہیں "مسٹر" سے خطاب کرتے ہوئے سنتے ہیں۔

موسکو نے مشرقی یورپ میں تیز رفتار تبدیلی پر بظاہر صبر و سکون کا مظاہرہ کیا ہے۔ پولینڈ میں غیر کمیونسٹ حکومت کا قیام، ہنگری میں کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ، دیوار برلن کا ڈھایا جانا، ان تبدیلیوں کا روس کی طفیلی ریاستوں میں کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر روسی لیڈروں نے ان پر کسی غیر معمولی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ گوربا چوف دیکھ رہے ہیں کہ کمیونزم کے نام پر روسی معیشت کا استحصال بحران کے عالم میں ہے اور طفیلی ممالک حصول وسائل کے لیے موسکو پر محض بوجھ ہیں۔ اسٹالنزم اب اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اب خود روس میں اقتصادی اصلاحات کو حاصل ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ مشرقی یورپ کے ساتھ سختی سے خود روس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس صورت حال سے سرخ رو نکل جائیں۔ یورپ میں آزادی کی لہر نے خود روسیوں میں اپنے مستقبل کے لیے بہتر توقعات پیدا کر دی ہیں۔

روسی بلاک کے طفیلی ممالک کی آزادی کے لیے موسکو کی طے کردہ حدود کیا ہیں یہ بات ابھی واضح نہیں۔ صدر بش بھی اس کے بارے میں حقائق جاننا چاہیں گے۔ البتہ

ایک بات بالکل صاف ہے کہ موسکو جرمنی کے اتحاد کا مخالف اور معاہدہ وارسا کو برقرار رکھنے کا حامی ہے۔ معاہدہ کے کسی رکن ملک کی علاحدگی پر موسکو کیا کرے گا اس پر کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن نظر ایسا آتا ہے کہ موسکو معاہدے کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھنے کی شرط کے ساتھ سیاسی تبدیلیوں کی اجازت دیدے گا۔

گزشتہ ہفتے پولینڈ کے وزیر اعظم مینزووسکی نے موسکو میں یقین دہانی کرائی ہے کہ پولینڈ معاہدہ وارسا کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کرے گا۔ ادھر روسیوں کا کہنا ہے کہ اگر ناٹو ختم کر دیا جائے تو ہم بھی معاہدہ وارسا ختم کرنے کو تیار ہیں۔ موسکو اور مغرب میں یہ عام تاثر موجود ہے کہ موجودہ تیز رفتار تبدیلیوں کے دوران معاہدہ وارسا اور ناٹو ہی استحکام کا ذریعہ ہیں۔ موسکو صرف یہ چاہتا ہے کہ پرانے نظام کی بساط لپٹنے کے عمل کے دوران مغرب احتیاط سے کام لے۔

گوربا چوف صدر بش کو اپنے سنگین مسائل سے بھی آگاہ کریں گے جیسے، روسی جمہوریتوں میں بے چینی و بدامنی، تیل اور خوراک کی شدید قلت، اصلاحات کی مہم کے دوران قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ نیز وسیع انتشار کا خطرہ جس کے اثرات مشرقی یورپ پر پڑ سکتے ہیں۔

بہرحال گوربا چوف اور بش کو آئندہ مذاکرات میں راستے کے تمام مراحل اور مشکلات پر غور کرنا اور انھیں حل کرنا ہے۔ اس مرحلے پر دو نکات نہایت اہم ہیں:

الف) مشرقی یورپ میں کمیونسٹ اقتدار کا اضمحلال

ب) مغربی اور مشرقی جرمنی کا انضمام

میں چاہتا ہوں کہ درون روس کے اس آخری حصے میں ذرا اس صورت حال پر بھی نگاہ ڈال لی جائے کیوں کہ گوربا چوف بش ملاقات (دسمبر ۱۹۸۹ء) کے بعد صورت حال زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔

مشرقی یورپ میں کمیونسٹ اقتدار کا اضمحلال

۱۹۸۹ء میں مشرقی یورپ سے کمیونسٹ اقتدار کا خاتمہ ہوگیا اور اب توقع کی جا رہی

ہے کہ بالآخر سرد جنگ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔ البتہ اس واقعہ سے مشرق و مغرب کے درمیان اس توازن کو بھی نقصان پہنچا ہے جس نے چالیس سال سے ایک غیر موثر امن قائم کر رکھا تھا۔ نومبر کے دوران دیوار برلن کی شکست وریخت نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اس سال میخائیل گورباچوف اور صدر بش کی کوششوں سے امریکا اور روس کے تعلقات بہتر ہوئے۔

دسمبر کے آغاز میں سپر طاقتوں کی سربراہ کانفرنس منعقدہ مالٹا کے بعد گورباچوف نے کہا تھا "دنیا سرد جنگ کے دور سے نکل کر ایک دوسرے عہد میں داخل ہورہی ہے۔"

موسکو اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان، کمبوڈیا اور انگولا سے اپنی فوجیں واپس بلا کر اور جنگ زدہ علاقوں میں امن بحال کر کے واشنگٹن سے تعاون کی جو نئی پالیسی اختیار کی ہے اس نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ اس کے باوجود سپر طاقتوں کے پاس کوئی جادوئی طریقہ نہیں جس سے وہ ان دیرینہ تنازعات کو بھی ختم کرسکیں جو مختلف علاقوں میں مقامی نوعیت کی جنگوں کا سبب بنتے رہے ہیں۔

مشرقی وسطیٰ، وسطی امریکا اور دوسرے علاقوں کے جھگڑے آج بھی اتنے ہی لاینحل ہیں جتنے پہلے تھے۔ پھر غریبوں اور مفلسوں کی عالمی فوج میں بھی روز افزوں اضافے کا سلسلہ جاری ہے اس لیے کہ دنیا میں غیر ملکی قرضے ایک اعشاریہ تین (۱٫۳) ٹریلین تک پہنچ چکے ہیں اور اب مشرقی یورپ کی نئی جمہوریتیں بھی لاطینی امریکا اور افریقی ممالک کے ساتھ قرضے حاصل کرنے کے لیے قطار میں شامل ہورہی ہیں۔

معاہدہ وارسا کی سربراہ کانفرنس میں گورباچوف کے واضح اعلانات کے بعد واقعات حیرت انگیز تیز رفتاری سے سامنے آرہے ہیں۔ یہ کانفرنس چالیس سال بعد پہلی بار ہوئی تھی۔ جونہی یہ سہارا ختم ہوا روسی بلاک کی حکومتیں زمین پر دھڑام سے آگریں۔ ان ملکوں کے پراعتماد عوام نے سیاسی آزادی اور اس اقتصادی خوشحالی کا مطالبہ کردیا جس کا وہ ہمسایہ مغربی ملکوں میں خود مشاہدہ کررہے تھے۔

اس زوال کا آغاز پولینڈ سے ہوا جہاں ٹریڈ یونین تحریک سالیڈیرٹی نے جون کے نیم آزادانہ انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی کو بری طرح شکست سے دوچار کیا اور پھر ستمبر میں

وزیر اعظم میزووسکی کی زیر قیادت اقتدار پر قبضہ ہوا۔

ہنگری کی حکمران پارٹی اکتوبر میں کمیونزم سے دستبردار ہوگئی اور ۱۹۹۰ میں آزادانہ انتخابات کرانے پر اس نے رضامندی کا اظہار کردیا۔ مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ اور بلغاریہ میں عوام کے مظاہروں نے پرانے لیڈروں کو ان کے مناصب سے محروم ہی نہیں کیا، ان سے یہ وعدہ بھی لیا کہ آئندہ سال آزادانہ انتخابات کرائے جائیں گے۔

لیکن بعض کمیونسٹ حکومتوں نے اپنی قبر آپ کھودی۔ چین کے رہنماؤں نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں عظیم اقتصادی اصلاحات کی پالیسی پر عمل کیا اور صرف سیاسی تبدیلیوں پر اکتفا کرتے ہوئے جون میں تن آن من اسکوائر پر جمہوریت کے حق میں ہونے والے مظاہروں کو کچل کر رکھ دیا۔ رومانیہ کے صدر چاؤشسکو نے اپنی مرضی کے کمیونزم کو طاقت کے ذریعہ سے بچانے کی کوشش کی۔ احتجاج کرنے والوں پر فوج نے گولیاں برسا کر ہزاروں افراد کو ہلاک کر دیا، لیکن عوام کے عزم، جذبے اور اشتعال نے اس کے اقتدار کا تختہ الٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ادھر موسکو میں گورباچوف نے محسوس کیا کہ مشرقی یورپ کی تیز رفتار تبدیلیوں نے انھیں بہت پیچھے چھوڑدیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے خود ہی اس سمت میں پیش قدمی کی۔ اپنے اصلاحات کے پروگرام پیرسترائیکا کے اقتصادی امکانات کی حدود متعین کیں اور کہا کہ روس کی کمیونسٹ پارٹی کو اپنا امتیازی کردار برقرار رکھنا چاہیے۔ لیکن انھیں ملک کے بے شمار نسلی گروپوں کے درمیان بڑھتے ہوئے جھگڑوں کا مسئلہ درپیش ہے۔

بالٹک کی جمہوریتیں لیتھوانیا، ایسٹونیا اور لیٹ ویا نے خود کو موسکو سے دور کرلیا ہے۔ آذربائیجان اور آرمینی باشندوں کے درمیان تصادم میں ایک سو سے زائد افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔ ان گروپوں کے درمیان نگورنو کاراباخ کے علاقے پر ملکیت کا جھگڑا ہے۔

معاہدہ وارسا مشتبہ ہو کر رہ گیا ہے اور اب تو بعض مغربی ملک یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ کیا اب بھی ناٹو کی کوئی اہمیت و افادیت باقی ہے؟ موجودہ حالات و مسائل کے

پیش نظر نئے یورپ کے سامنے یہ نیا سوال بھی آ کھڑا ہوا ہے کہ کیا مشرق و مغرب کی تقسیم ہونے کے نتیجے میں اب دونوں جرمن مملکتوں کے اتحاد کا بھی مطالبہ کیا جائے گا؟ مغربی جرمنی کے چانسلر ہلمٹ کوہل نے نومبر میں کنفیڈریشن کا منصوبہ تو پیش کر دیا ہے' لیکن ہمسایہ ملکوں نے اس پر احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیا ہے۔

مغربی اور مشرقی جرمنی کا انضمام

مغربی جمہوریہ جرمنی کی وزیر برائے بین الجرمنی تعلقات ڈوروتھی ولمز کا مغربی جرمنی کے ایک اخبار کو انٹرویو

صرف ایک ایسا متحدہ جرمنی ہی قابل قبول ہے جس کا اتحاد وسیع یورپی امن تصفیے کے ڈھانچے کے اندر عمل میں لایا گیا ہو۔ یہ تصفیہ تمام یورپی ملکوں کی آزادی کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور جرمنی کے باشندے بھی اتنی ہی مساوی خود مختاری کے ساتھ یہ آزادانہ فیصلہ کرنے کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے مستقبل کی ریاست یا حکومت کی کون سی ہیئت پسند کرتے ہیں۔

دوسرے ممالک میں اس خطرے کا بار ہا اظہار کیا گیا ہے کہ دونوں جرمن ریاستوں کے انضمام کے نتیجے میں "چوتھی رائش" وجود میں آسکتی ہے۔ مگر یہ لغو اور محض من گھڑت مفروضہ ہے۔ میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ مستقبل میں ایک واحد جرمن قوم وجود میں آئے گی جو یورپ کا لازمی حصہ ہوگی اور اپنی برادری کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنے دوستوں اور ہمسایہ یورپی ملکوں کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی پابند ہوگی۔

مشرقی جرمنی کے لوگوں کو جب بیرون ملک جانے کی آزادی ملی تو یہ مناظر پوری دنیا کوٹی وی پر دکھائے گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جرمنی کی تقسیم کو چالیس سال گزر چکے ہیں اور دیوار برلن کی تعمیر اور پوری سرحد پر خاردار تار بچھائے ہوئے ۲۸ سال ہو چکے ہیں مگر اس کے باوجود کوئی چیز تبدیل نہیں ہوئی ہے اور جرمنی کے باشندے

آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ سب ایک ہیں اور وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا چاہتے ہیں۔

جرمنی کے از سر نو اتحاد کے موضوع پر وسیع پیمانے پر بحث و تمحیص ہوگی۔ بین الاقوامی رائے عامہ کو بھی حقائق کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے باوجود مشرقی یورپ میں اصلاحات کی کامیابی کا بمشکل ہی کوئی امکان ہے اگر مغربی یورپ کی یک جہتی پر توجہ نہیں دی جاتی' اسی طرح جرمنی میں بھی کسی تبدیلی کا امکان نہیں اگر مشرقی یورپ کی سیاسی تحریکوں کے بارے میں کوئی موثر کام نہیں کیا جاتا۔

وفاقی جمہوریہ جرمنی مشرقی جرمنی کو اقتصادی امداد کی پیش کش کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ وہاں آزاد منڈی کی معیشت کے بنیادی اصول رائج کیے جائیں۔ بین الجرمنی اور بین الاقوامی تعاون کا آغاز کار جو مشرقی جرمنی کی اقتصادی بحالی کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اسی صورت میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ مشرقی جرمنی اور مشرقی یورپ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی معیشت کی سوشلسٹ منصوبہ بندی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔

مشرقی جرمنی میں نوکر شاہی کے نافذ کردہ وہ قواعد و ضوابط ختم ہونے چاہیں جن کی پابندی مغربی جرمنی کے باشندوں کو مشرقی حصے کے سفر کے سلسلے میں کرنی پڑتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی جرمنی سے جانے والوں کے لیے زرمبادلہ فراہم کرنے کی لازمی شرط کو منسوخ کیا جائے۔ مشرقی جرمنی کی حکومت کی پہلی اور اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مشرقی جرمنی کے باشندوں کو زرمبادلہ فراہم کرے تاکہ وہ مغربی جرمنی کا سفر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مغربی جرمنی کی حکومت ایک خصوصی فنڈ کے قیام پر غور کر رہی ہے جس کے لیے وہ خود بھاری رقم فراہم کرے گی۔

اس مسئلے پر مزید وضاحت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک چانسلر ہیلمٹ کوہل اپنے آئندہ دورہ مشرقی جرمنی میں وہاں کی اسٹیٹ کونسل کے چیرمین ایگون کرینز سے صلاح و مشورہ نہیں کر لیتے۔ بون مشرقی جرمنی کو اقتصادی امداد کی پیش کش کرنے سے قبل اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی کی خصوصی

کنگرس کے نتائج اور فیصلوں کے سامنے آنے تک انتظار کیا جائے۔ اس انٹرویو میں بین السطور یہ رائے قائم کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے کہ جرمن قوم اس عزم کی حامل ہے کہ جرمنی کی تقسیم کو ختم کیا جائے اور مشرقی اور مغربی جرمنی کا انضمام عمل میں لایا جائے۔ جناب گورباچوف اس انضمام کے فی الحال حامی نظر نہیں آ رہے ہیں۔ مگر کیا وہ واقعی اس انضمام کو روکنے پر قادر ہوں گے؟ شاید مستقبل ان کے حق میں نہیں ہوگا۔ مشرقی یورپ میں بدیہی انقلاب فکر اور انقلاب اقتدار کے بعد دونوں جرمنوں کو ایک ہوجانے سے روکنا اب کسی کے اختیار میں نہیں رہا ہے۔

روس میں نجی کاروبار یا کواپریٹو سسٹم کا خاکہ

جناب گورباچوف نے روس میں نجی کاروبار کو کواپریٹو سسٹم کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ چوں کہ لوگ کمیونسٹ آئیڈیالوجی کے لیے گزشتہ ستر برس میں لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے چکے ہیں' اس لیے اس نظریے سے بیک جنبش قلم انحراف نہیں ہو سکتا۔ ماہرین نے تاریخی ریکارڈز میں کھوج لگا کر معلوم کیا ہے کہ لینن اجتماعی لیز (پٹے داری) کے حامی تھے۔ چناں چہ کواپریٹو سسٹم بھی ایک قسم کی لیز ہے۔ کارکنان کی کوئی جماعت یا پوری فیکٹری حکومت سے لیز کا معاہدہ کرکے باہمی طور پر طے شدہ میعاد تک حکومت کو مقررہ رقم کی ادائی کرے گی اور جو منافع بچ رہے گا اسے وہ تقسیم کرنے میں آزاد ہوگی۔ اس نظام کا آغاز روس کے صوبہ اسٹونیا سے ہوا۔ نو ماہ کے بعد موسکو بھی اس میں شریک ہوگیا۔ سال ۱۹۸۹ء کے آغاز میں موسکو کے علاقے میں ایسے ۵۰۰ کاروبار شروع کیے گئے تھے جن میں ایک لاکھ آدمی شریک تھے۔ اس کاروبار میں بڑی بڑی فیکٹریوں میں چھوٹے کافی ہاؤس بنائے گئے جن سے کارکردگی میں پندرہ بیس فی صد تک اضافہ ہوا۔

لیز کی میعاد مختلف کیسوں میں مختلف ہے' لیکن اوسط مدت سات برس ہے۔ اس کے بعد نیا معاہدہ کیا جائے گا۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ فیکٹریاں لمبی مدت کے کنٹریکٹوں کے لیے اصرار کرتی ہیں جب کہ بیوروکریٹس چھوٹی مدت کے حق میں ہیں

تاکہ حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی لچک موجود رہے۔ اوائل ۱۹۸۹ء کے جائزوں میں بتایا گیا کہ لیز میں شامل ۶۰ فی صد افراد اس کے حق میں تھے۔

فیکٹریوں کی نگراں بیوروکریسی اس سسٹم کی سب سے زیادہ مخالفت کر رہی ہے۔ ان کو یہ خطرہ ہے کہ اگر یہ سسٹم بڑھتا چلا گیا تو انھیں اپنی جاب سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ماہرین نے یہ بھی بتایا ہے کہ لیز کا نظام لینن کے عہد میں شروع کیا گیا تھا۔ جیسی مخالفت اب ہے اس کی مخالفت ہوئی۔ چوں کہ اس وقت حکومت کو اتنا استحکام حاصل نہیں تھا جتنا کہ اب حاصل ہے' اس لیے ۱۹۳۰ء میں چپکے ہی سے یہ نظام ختم ہوگیا۔

جناب گورباچوف کی قیادت میں اور روس کے بائیں بازو کی حمایت میں اس کے پنپنے کے بڑے روشن امکانات نظر آرہے ہیں۔

جدید روسی پارلیمنٹ کا طریق کار

ماضی میں روس میں قانون سازی کا طریقہ یہ تھا کہ وزارتوں کے ماہرین اور ب دیگر ادارے مثلاً اکیڈمی اوف سائنس کسی قانون کا پہلا مسودہ تیار کرتے تھے۔ پھر اسے گورنمنٹ کے بیوروکریٹوں کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ وہ بعض اوقات اس کا ہی بدل دیتے تھے۔ بالآخر سپریم سوویت کی اس پر مہر لگ جاتی تھی۔ ماضی میں سپریم سوویت سال میں دو بار تین تین دن بیٹھتی تھی۔

اب روس میں قانون سازی کا انداز بالکل بدل چکا ہے اور شاید اس میں مزید تبدیلیاں بھی آئیں گی۔ روس میں بھی پارلیمنٹ قائم کردی گئی ہے۔ مارچ اپریل ۱۹۸۹ء میں کنگرس اوف پیپلز ڈپٹیز کے ۲۲۵۰ ارکان کا انتخاب ہوگیا تھا۔ ان میں سے ۱۵۰۰ ارکان کا کھلا انتخاب ہوا۔ ۷۵۰ ارکان کو مختلف اداروں کی طرف سے نامزد کیا گیا۔ پھر ان ۲۲۵۰ ارکان میں سے ۵۴۴ ارکان پر مشتمل سپریم سوویت منتخب کی گئی۔ یہ منتخب سپریم سوویت مستقل طور پر اجلاس میں رہے گی۔

اس وقت تقریباً ۲۰ بل زیر غور ہیں جو روس کے تمام قانونی نظام کو بالکل بدل

ڈالیں گے ۔ ان میں سے چھ قانون اقتصادی اصلاحات کے ہیں جن کا تعلق ملکیت ' لیز (پٹے) ' فرمیں ' پبلک کاروبار ' کوآپریٹو کاروبار (یعنی نجی کاروبار) اور ٹیکسوں سے ہے ۔ اس کے علاوہ ایک بل تعزیرات کے بارے میں ہے ۔ باقی بلوں کا تعلق آزادی تقریر ' پریس اور دیگر امور سے ہے ۔

اب پارلیمنٹ میں چالیس چالیس ممبروں کی چودہ کمیٹیاں بنادی گئی ہیں ۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ قوانین کے مسودے تیار کریں گی۔ سپریم سوویت نے ہر ہفتے میں دو دن فل سیشن کے لیے رکھے ہیں اور باقی دن کمیٹیوں کے کام میں صرف ہوں گے ۔

پہلے ساری طاقت انتظامیہ اور کمیونسٹ پارٹی کو حاصل تھی ۔ اگرچہ پارلیمنٹ کے ممبر آج بھی وہی ہیں جو پہلے کمیونسٹ پارٹی میں تھے تاہم فرق یہ ہوگا کہ اب ایک بار جب انتظامیہ مسودہ سپریم سوویت کو بھیج دے گی تو پھر اس کا قانون سازی میں کوئی کردار نہیں ہوگا ۔ میرا اندازہ یہی ہے ۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد معلوم ہوجائے گا کہ عملاً کیا ہوتا ہے ۔ کانگرس آف پیپلز ڈپٹیز کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ سپریم سوویت کے فیصلے کو ویٹو کر سکتی ہے ۔ بہرحال صحیح صورت حال مستقبل میں سامنے آئے گی ۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۹ء ۔ ہفتہ

موسکو سے کراچی

صبح ۵ بجے میں نے نماز تہجد ادا کی اور اللہ تعالیٰ کے حضور سر بہ سجود ہوگیا کہ اس نے مجھے عالمی حیثیت سے سرفراز و سربلند فرمایا ہے ۔ نماز فجر ۶ بجے ادا کی ۔ طلوع آفتاب ساڑھے سات بجے کے بعد ہی ہے ۔ ۹ بجے تک میں مصروف تحریر رہا ۔ میرا چودہ دن کا سفرنامہ اب تیار ہے ۔ میں نے ڈیڑھ سو صفحات دوران سفر لکھ لیے ہیں ۔ اس میں اسی قدر صفحات کا اضافہ ہوگا ۔ اس طرح یہ کوئی تین سو صفحات کی کتاب ہوجائے گی ۔

موسکو ہوائی میدان پونے گیارہ بجے پہنچ گئے ۔ یہاں آکر ایک نئی مشکل یہ پیدا ہوئی کہ خاتون نے ہمارا سامان دیکھ کر ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دونوں ٹکٹ گویا ڈاکٹر گنادی کے منہ پر مار دیئے ۔ فرمایا کہ زیادہ وزن کی اطلاع دینی چاہیے تھی ۔ ہوائی میدان پر ڈاکٹر گنادی اور ڈاکٹر کوزنک چوف (نائب صدر موسکو میڈیکل سنٹر) مجھے چھوڑنے آئے تھے ۔ سفارت پاکستان کے جناب محترم قاضی صاحب ذرا دیر سے پہنچے ۔ جب قاضی صاحب آئے تو ہم اس سامان کی پریشانی میں مبتلا تھے ۔ یہاں قاضی صاحب بھی بے بس تھے ! بارے ڈاکٹر کوزنک چوف صاحب نے بڑی مشکل سے لڑکی کو رام کیا جو اس قدر درشت مزاج تھی کہ اسے مسکرانا بھی عار تھا ۔ یہ دونوں ڈاکٹر میرے سامنے سخت شرم سار تھے ، مگر کر بھی کیا سکتے تھے ۔ بالآخر پونے بارہ بجے اس خاتون نے حساب لگایا اور ہماری کتابوں سے بھرے سوٹ کیس کی گنجائش نکال لی اور دو سو کچھ روبل ادا کرنے پر سامان قبول کر لیا ۔ اسی اثنا میں ' میں مسلسل یا حی یا قیوم کی تسبیح پڑھتا رہا تھا ! ۔ میں کتابوں کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا ۔ میں نے گنادی صاحب سے کہا کہ میرا کپڑوں کا سوٹ کیس روک لیجیے' وہ اپنے پاس رکھ لیجیے ' جب آپ مارچ میں پاکستان آئیں گے تو اپنے ساتھ لے آیئے گا ۔ بارے یہ کام ہوگیا

دونوں ڈاکٹر بہت خوش ہوئے ۔ اس اثنا میں میں نے سفارت پاکستان کے ڈاکٹر قاضی صاحب کو اپنے سفر کے تاثرات پر بریف کر دیا ہے ۔ یہ رپورٹ ان کو دینا میرا فرض تھا ۔

میں نے سعدیہ بیٹی سے کہا کہ ایک اونیکس کا تحفہ ذرا نکال لو اور اپنے ہاتھ میں رکھ لو ۔ وہ حیران ہوئیں کہ اب یہ تحفہ کس کے لیے ہے ! ہم جب اس راستے سے گزرے کہ جہاں وہ مغرور لڑکی بیٹھی تھی تو میں نے کہا :

"سعدیہ ! یہ تحفہ اس ظالم کو دیدو !"

سعدیہ نے ڈاکٹر گنادی اور ڈاکٹر کوزنک چوف کو دیکھتے ہوئے تحفہ لڑکی کو تھما دیا ۔ وہ حیران تو ہوئی مگر ساتھ ہی وہ زور دار طور پر مسکرا بھی دی ۔ بس میں اس کو مسکراتا ہی دیکھنا چاہتا تھا ۔ شاید دونوں ڈاکٹر بھی مسکرائے ہوں گے ۔ اچھائی کر کے مسکرانا ' خوش ہونا بڑا دل چسپ تجربہ حیات ہوتا ہے !

ہوائی جہاز وقت مقررہ پر ۱۲ بجکر ۵ منٹ پر روانہ ہوا ۔ اس نے ۵ گھنٹے میں ابو ظہبی ایر پورٹ تک پہنچا دیا ۔ یہاں ہم نے کچھ خریداری کر ہی ڈالی ۔ جہاز ایک گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے روانہ ہوا ۔ میں جہاز میں اپنے سفر روس کی آخری سطور لکھ رہا ہوں ۔ جہاں اب بیس پچیس منٹ بعد کراچی کے ہوائی میدان پر اترنے والا ہے ۔

کراچی میں درجہ حرارت ۲۴ سنٹی گریڈ ہے ۔ موسکو میں صبح مائنس ۹ ڈگری تھا ۔ سخت ترین سردی اور برف باریوں سے باہر آکر اب سخت گرمی سے سابقہ پڑنے والا ہے !

الحمدللہ علی ذالک

حکیم محمد سعید

۱۸ نومبر ۱۹۸۹ء

ایروفلوٹ روسی ہوائی جہاز

❖❖❖